ادبی سلسلہ مطبوعات ۴۰

کشکول

باغِ ادب میں جو گلِ معنی کھلا کبھی
دامن میں رکھ لیا نگہِ انتخاب نے؟

از

رئیس احمد جعفری ندوی

کتاب منزل لاہور

۸۹۱۴ ۲۳۰۲

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل ۱۹۴۹ء

قیمت : ــــــــــــ ساڑھے پانچ روپے

شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس میں
طبع کرا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

فہرست مضامین!

نذرات — صفحہ ۶

15 August 1948

مذہبیات:-

۱	غلامی، تنقید صحیح کی روشنی میں	۷ تا ۲۴
۲	قربانی کی دینی حیثیت	۲۵ " ۴۸
۳	قرآن اور اس کی فضیلت	۴۹ " ۵۴
۴	وضع حدیث	۵۵ " ۸۶
۵	انکار حدیث	۸۷ " ۱۴۱

تاریخ و آثار:-

۶	مامون کا عہد حکومت	۱۴۲ " ۱۷۸
۷	عربوں کے آثار	۱۷۹ " ۲۰۴

سوانح وسیر:-

۸	ادب الجاحظ	۲۰۵ " ۳۰۰

عربی قصہ :-

۹	تلافی	۳۰۱	تا	۳۱۳

ادبیات عرب :-

۱۰	بلاغت و فصاحت	۳۱۴	"	۳۱۵
۱۱	حکایت	۳۱۶	"	۳۱۸
۱۲	حکایت	۳۱۹	"	۳۲۰

انتخاب و تلخیص :-

۱۳	کلام میر	۳۲۱	"	۳۵۵
۱۴	مصحف مصحفی	۳۵۶	"	۳۶۶
۱۵	انتخاب کلام ذوق	۳۶۷	"	۳۸۸
۱۶	چمن بے نظیر	۳۸۹	"	۴۱۵
۱۷	انتخاب	۴۱۶	"	۴۱۹
۱۸	حسرت کے چند نشتر	۴۲۰	"	۴۲۳

نقد و تبصرہ :-

۱۹	رامپور کا ایک ملک الشعرا	۴۲۴	"	۴۶۶

مشاہدات وتاثرات :-

۲۰ ٹیا برج ۴۶۰ تا ۴۶۹

اوراق پارینہ :-

۲۱ اسلام مغربی سیاسی رائے کی نظر میں ۴۷۰ تا ۴۷۱
۲۲ مسلم یونیورسٹی اور اسلام ۴۷۲ تا ۴۷۳

شذرات

یہ میری علمی ادبی زندگی کا نچوڑ ہے، عربی کے بعض بہترین تصنیفات اور مقالات تراجم، بعض اہم ترین مذہبی مسائل پر، عرصہ دراز کی تحقیق، مطالعہ، اور کاوش کا نتیجۂ افکار، بعض یگانہ اور منفرد شعرائے ماضی وحال کے طویل ترین کلیات و دواوین کا انتخاب بعض اساتذۂ سخن کے کلام پر، نقد وتبصرہ، اور بعض متفرق خیالات وتاثرات ومشاہدات ذہن ودماغ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئے ہیں،

یہ مال تجارت نہیں ہے، ذہن ودماغ کے وہ نقوش ہیں، جو صورت گری کا کام دے سکتے ہیں۔

میری محنت ٹھکانے لگ جائے گی، اگر پڑھنے والے ان مقالات وتراجم سے فائدہ اٹھائیں۔

رئیس احمد جعفری

غلامی

"تنقید صحیح کی روشنی میں"

جولائی کے نگار میں "حق گو" صاحب کے "فکاہات" کی ایک قسط شا[ئع]
ہوئی ہے، "حق گو" صاحب نے "غلامی" پر قلم اٹھایا ہے، اور ماشاء اللہ الیسی
گلکاریاں کی ہیں، کہ چشم بینا کے لئے وہ "نقش و نگار" فردوس نظر ثابت
ہو رہے ہیں، مثلاً

"آج ہم حریت انسانی سے بحث کرتے ہیں، اور دکھلائیں گے
کہ قرآن اس اصول میں بھی تمام مذاہب سے جدا نظریہ پیش
کرتا ہے مگر حدیث نے اس اصول کی بھی مخالفت کی
حدیث اور اس سے زیادہ فقہ نے غلامی کو ایک باقاعدہ
اسلامی انسٹی ٹیوشن تسلیم کیا ہے، اور غلام کے شکنجہ کو بجائے
ڈھیلا کرنے کے اور سخت کرنے کے لئے طرح طرح کے اقوال
اور اجتہاد اور قیاس اور رائے اور روایت سے کام لیا ہے
سورۂ بروج میں ارشاد ہوتا ہے، ان الذین
فتنوا المؤمنین والمؤمنات ثم لم یتوبوا فلہ[م]

> عذاب جہنم ولہم عذاب الحریق ۔ اس آیت سے
> مسلمانوں کو غلام بنانا بدترین گناہ ہے ——— ابتدائے
> اسلام میں یہ تو ممکن نہ تھا، کہ مسلمانوں کی جماعت سے مقابلہ
> کیا جائے، اور مسلمان گرفتار کرکے اسیر و غلام بنائے جائیں
> اس لئے قرآن نے کبھی فرض نہ کیا تھا، کہ مسلمان کا مسلمان
> کی غلامی کرنا ممکن ہے،"

سب سے پہلے تو غور طلب یہ امر ہے کہ آیا واقعی حدیث نے "غلامی کے شکنجہ کو اور زیادہ کسا ہے؟" حق گو صاحب حدیث سے عموماً اور حضرت ابوہریرہؓ سے خصوصاً بہت زیادہ خفا ہیں، اس لئے وہ ہمہ وقت حدیث رسول صلعم اور ابوہریرہ کی مخالفت پر آمادہ رہتے ہیں، اور شاید اسی جذبہ نے ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلوا دیئے، کہ "حدیث اور اس سے زیادہ فقہ نے غلامی کو ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوشن تسلیم کیا ہے" حالانکہ قرآن سے زیادہ ہی حدیث نے اعتاق کی ترغیب دی ہے، لوگوں کو ابھارا ہے کہ وہ غلاموں کو آزاد کرکے بے انتہا ثواب و رحمت کے مستحق ہوں، اس نے اس انسٹی ٹیوشن کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے ہیں کہ غلاموں پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے، وہ غیظ و غضب کا شکار نہ ہونے پائیں ان پر ناحق دباؤ نہ ڈالا جائیگا، ان کو اذیتیں نہ دی جائیں، بھائیوں

و عزیزوں کی طرح ان سے سلوک کیا جائے، جو خود کھایا جائے وہی ان کو کھلایا جائے، غرض پورے طور پر "حسن سلوک" کی تعلیم اس حدیث سے ملتی ہے، جس نے بقول "حق گو" صاحب کے اس شکنجہ کو اور زیادہ کس دیا ہے، اور اسے باقاعدہ ایک انسٹی ٹیوشن تسلیم کیا ہے عجیب بات ہے "حق گو" صاحب اس سے کچھ اور استنباط کرتے ہیں، اور دنیا ان "اساطیر" کو اتنی وقعت دیتی ہے، کہ ایک ایک حرف کو آنکھوں سے لگاتی ہے، خیر اب ہمیں حدیث کا ایک سرسری مطالعہ کرنا چاہیئے، تاکہ "حدیث دیگراں" کے ساتھ ہی ساتھ اہل حدیث کا نقطۂ نظر بھی معلوم ہو جائے،

حدثنا احمد بن یونس ثنا عاصم بن محمد ثنی واقد بن محمد حدثنی سعید بن مرجانة صاحب علی بن الحسین قال قال لی ابو هریرة قال النبی ایما رجل اعتق امرأ مسلما استنقذ الله بکل عضو من عضو منه من النار قال سعید بن مرجانة فانطلقت به الی علی بن الحسین

سعید بن مرجانہ کہتے ہیں، کہ مجھ سے ابو ہریرہ نے کہا کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان مرد کو آزاد کر دے اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں، آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو آتش دوزخ سے محفوظ رکھے گا، سعید بن مرجانہ کہتے ہیں، کہ اس حدیث کو میں علی بن الحسین کے پاس لے گیا تو انہوں نے ایک غلام جسے عبد [illegible]

نعم علی بن الحسین الی عبد له قد اعطاہ بہ عبد اللہ بن جعفر عشرۃ آلاف درھم او الف دینار فاعتقہ	درہم یا ایک ہزار دینار پر عبد اللہ بن جعفر سے خرید اتھا، آزاد کر دیا،

(بخاری صفحہ ۳۴۲)

یہ روایت حضرت ابو ہریرہ کی ہے جس کے متعلق "حق گو" صاحب کا فتویٰ ہے، کہ وہ ہمیشہ "بوقت ضرورت حدیث وضع کر لیا کرتے تھے" (نعوذ باللہ)، اور اس غلامی کے سلسلہ میں بھی ان پر یہ افترا ہو چکا ہے کہ وہ غلاموں کے خلاف آقاؤں کی حمایت میں حدیث بنانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، یہ انہیں ابو ہریرہ کی حدیث ہے، جس میں اعتاق کے فضائل بیان ہو رہے ہیں، ترغیب دی جا رہی ہے، آمادہ کیا جا رہا ہے اور "وہاں" کی نوازش بے پایاں کی نوید دی جا رہی ہے کہ مسلمان غلام کو آزاد کرو اور نعمت پاؤ، صرف یہی ایک حدیث نہیں ہے اور متعدد احادیث اس موضوع پر مل سکتی ہیں، مثلاً ایک دوسری حدیث حضرت اسماء بنت ابی بکر کی ہے، جن پر "وضع حدیث" کی تہمت "حق گو" صاحب بھی نہیں نہیں لگا سکے ہیں:-

حدثنا موسیٰ بن مسعود ثنا	اسماء بنت ابی بکر فرماتی ہیں کہ رسول

زائدہ بن قدامہ عن ھشام
بن عروۃ عن فاطمہ بنت المنذر
عن اسماء بنت ابی بکر قالت
امر النبی بالعتاقۃ فی کسوف
الشمس تابعہ علی عن
الدراوردی عن ھشام. حدثنا
محمد بن ابی بکر ثنا عثام
عن فاطمہ بنت المنذر
عن اسماء بنت ابی بکر قالت
کنا نؤمر عند الکسوف بالعتاقۃ

(بخاری ص۳۴۲)

اللہ نے سورج گرہن میں غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا، ہے علی نے دراوردی سے انہوں نے ہشام سے اس کی متابعت کی ہے، اسماء بنت ابی بکر کہتی ہیں، کہ سورج گرہن کی حالت میں ہمیں غلاموں کے آزاد کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔

کیا انہیں احادیث سے حق گو صاحب کے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ حدیث نے "غلامی کے شکنجہ کو اور زیادہ کسا ہے"؟

میں الزام انکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

ایک دوسری حدیث واصل الاحدب کی ہے

حدثنا آدم بن ابی ایاس ثنا
شعبہ ثنا واصل الاحدب

آدم ابن ابی ایاس شعبہ سے اور وہ واصل الاحدب سے روایت

قال سمعت المعرور بن سويد
قال رأيت ابا ذر الغفاري
وعليه حلة وعلى غلامه حلة
فسألناه عن ذالك فقال اني
ساببت رجلا فشكاني الى النبي ﷺ
فقال لي اعيرته بامه ثم قال ان
اخوانكم خولكم جعلهم الله تحت
ايديكم فمن كان اخوه تحت
يده فليطعمه مما يأكل وليلبسه
مما يلبس ولا تكلفوهم ما
يغلبهم فان كلفتموهم ما يغلبهم
فاعينوهم،

(بخاری ص ۳۴۶)

کہ میں نے معرور بن سوید سے سنا انہوں
نے کہا کہ میں نے ابوذر غفاری کو
دیکھا ان پر ایک یمنی چادر پڑی تھی
اور ان کے غلام پر بھی، ہم نے ان
سے ان کا حال پوچھا، انہوں نے
کہا کہ میں نے ایک آدمی کو گالی دی تو اس
نے رسول اللہ سے میری شکایت
کردی، رسول اللہ نے کہا کہ تمہارے
بھائی تمہارے غلام وخدم ہیں وہ
تمہارے امور کی اصلاح کرتے ہیں
اللہ نے ان کو تمہارا دست نگر کردیا
ہے تو اگر کسی کا بھائی کسی کے دست
نگر ہو تو اسے وہی کھلانا چاہیئے، جو
خود کھائے، اور وہی پہنانا چاہیئے
جو خود پہنے ان سے ایسا کام نہ لو جو
ان کے لئے تکلیف کا باعث ہو، اور
اگر ایسا ہو تو ان کی اعانت کرو۔

یہ حدیث بھی سو اتفاق سے غلاموں کی حمایت ہی میں ہے اس میں تاکید ہے کہ جو کھاتے ہو وہ اپنے غلاموں کو کھلاؤ، جو پہنتے ہو انہیں پہناؤ وہ تمہارے بھائی ہیں، دوست ہیں، بخت و اتفاق سے وہ تمہارے دست نگر ہو گئے ہیں، ان سے وہی سلوک کرو، جو ایک بھائی بھائی سے کرتا ہے، ان سے زیادہ واضح الفاظ میں غلاموں کی حمایت اور کیا کی جا سکتی ہے، اور اس سے زیادہ ان کو کیا "حقوق" و "مراعات" عطا ہو سکتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ انہیں رکن خاندان تسلیم کر لیا گیا، اور اس کے بعد مطالبہ کیا گیا، کہ ان کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور شاید حق گو صاحب کو یہ سنکر اور تعجب ہو کہ اسلام نے غلاموں کے لئے اس سے بھی زیادہ حقوق و مراعات رکھے ہیں، اور ان "حقوق و مراعات" کا نفاذ اسی حدیث و فقہ سے ہوتا ہے، جسے حق گو صاحب کے دربار سے خدا معلوم کیا کیا خطابات عطا ہو چکے ہیں، مثلاً کوئی شخص مرجائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو، صرف غلام ہو، تو مولیٰ کی ساری جائداد کا مالک غلام ہوگا۔ غلاموں کو یہ حقوق کس قوم نے، کس مذہب نے، کس قانون نے کس آئین نے کس زمانہ میں دیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ حق گو صاحب کو غلامی کی حقیقت سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے، اسلام نے، یا حدیث نے یا فقہ نے باقاعدہ غلامی کو کسی "انسٹی ٹیوشن" کی صورت میں پیش نہیں

کیا ہے، بلکہ مجبوراً اور ضرورۃً اسے جائز رکھا ہے، اور جواز کی صورت میں بھی ترہیب وترغیب سے کام لیکر، برابر غلاموں کو آزاد کرنے کی ہدایت کی ہے، مثلاً ایک جنگ میں بیس ہزار آدمی گرفتار ہوتے ہیں، قانون اسلام ان کے قتل کی اجازت نہیں دے سکتا تھا، کہ ایک جماعت کی جان لینا جائز نہیں جبکہ اس کی زندگی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عمل صالح کی مالک ہو جائے، اسلام قبول کرلے، سب کو قید رکھا نہیں جاسکتا تھا کہ اقتصادی حیثیت سے اور پھر اس زمانہ میں یہ ناممکن تھا، جبکہ آج بھی حکومت کے پاس اتنے سامان وافر کے باوجود اتنی گنجائش نہیں نکلتی کہ وہ تحریک حاضر کے سارے اسیران سیاسی کو اپنے محبس میں رکھ سکے، تو اس زمانہ میں کیونکر ممکن تھا، سب کو رہا بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان کے رہا کرنے کے یہ معنی تھے کہ اپنے ہاتھ سے اپنے پیروں میں کلہاڑی ماری جائے، جس مصیبت سے ابھی عہدہ برآ ہوئے تھے، پھر اسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے، لامحالہ غلامی کی ہی ایک صورت نکلتی ہے، جو معتدل ہے، لیکن اسلام نے، قرآن نے، حدیث نے غلامی کا جو تخیل پیش کیا ہے جو نظریات پیش کئے ہیں، جو شرائط پیش کئے ہیں ہیں، جو مطالبات کئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ غلام غلام نہیں رہتا، بلکہ رکن خاندان ہو جاتا ہے اسلام کے غلام کو مواقع حاصل ہیں کہ وہ قطب الدین ایبکؒ بن جائے

وہ طارق بنکر جبل الطّر پر اپنا جھنڈا اگاڑ دے، وہ ...... بنکر ایک غیر ملک میں اسلام کا پرچم لہرائے، وہ بن کر تمام مومنین ومسلمین کا سردار و آقا ہو، غرض وہ جتنی بلندیاں چاہے حاصل کرے، جس رفعت پہ چاہے پرواز کرے، لیکن اب کہ غلامی فنا ہوگئی ہے، غلام بنانا ممنوع ہو گیا ہے، اب بھی کروڑوں غلام ہیں، جن کو نہ اپنا سا کھلایا جاتا ہے، نہ اپنا سا پہنایا جاتا ہے، نہ یکساں سلوک کیا جاتا ہے، بلکہ ہوتا تو یہ ہے کہ ٹھوکر سے ان کی تلی پھاڑ دی جاتی ہے ترقی کے راستے مسدود کر دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آج کل کا "غلام" "ڈپٹی کلکٹر" بھی بہت مشکل سے بن پاتا ہے،

ببیں تفاوت رہ الخ

اب بتلایئے وہ غلام اچھا ہے، جو گو غلام کہلاتا ہے، پر آقاؤں کی سی زندگی بسر کرتا ہے، یا وہ غلام اچھا ہے، جو گو غلامی کے بجائے "انڈین سول سروس کا ممبر" "راجہ" "مہاراجہ" "نواب" "تعلقہ دار" "زمیندار" "رئیس اعظم" "ہزہائی نس" اور نہ معلوم کیا کیا کہلاتا ہے، پر اسے یہ اجازت نہیں، کہ وہ اپنی ناک سے مکھی بھی اڑا سکے، ؟ نام بدل دینے سے کیا حقیقتوں کو بھی فراموش کر دیا جائیگا،

اسلام نے غلاموں کو جو حقوق دیئے ہیں، وہ دنیا کی کہاں قوم

قوم نہیں دے سکتی، اسلام کا غلام اپنے آقا کو ٹوک سکتا ہے، اسے نکتہ چینی کر سکتا ہے، نصیحت کر سکتا ہے، اور پھر یہی نہیں، خدا کے ہاں اسے اجر وافر کی بشارت بھی ہے،

حدثنا عبد اللہ بن مسلم عن مالك عن نافع عن ابن عمر ان رسول اللہ قال العبد اذا نصح سیدہ واحسن عبادۃ ربہ عز وجل کان لہ اجرہ مرتین۔	ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جو غلام اپنے آقا کو نصیحت کرے، اور اپنے رب کی عبادۃ خوبی سے کرے، اس کے لئے دو اجر ہیں،

(بخاری صفحہ ۳۴۲)

"حق گو" صاحب نے پوری شان تحقیق و تدقیق سے ارشاد فرمایا ہے کہ "ان الذین فتنوا المومنین والمومنات فلھم عذاب جھنم ولھم عذاب الحریق" سے مسلمانوں کو غلام بنانا بدترین گناہ ہے" حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ اس مہمل ترین دعوے پر گیا عرض کیا جائے، اغالب نے ایک بار اپنے جنون عشق کی "صفائی" یوں دی تھی،

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

دوسرا مصرعہ تو معلوم ہوتا ہے اس نے پیشین گوئی کے طور پر "حق گو" صاحب کے لئے کہا تھا، ان کی بات سمجھنی واقعی محال ہے" متن کا ترجمہ" غلام بنانا" اتنا نادر اجتہاد ہے کہ سرسید احمد خاں کے ہاں بھی نہیں مل سکتا، آیئے دیکھیں تفاسیر اس کے متعلق کیا رائے ظاہر کرتی ہیں، سب سے پہلے سورۂ بروج کی شان نزول معلوم کر لیجئے، تو اس کے معنی سمجھنے میں آسانی ہوگی اس کی شان نزول کے متعلق اکثر تفاسیر میں یہ واقعہ منقول ہے کہ ایک بہت بڑا ساحر تھا، جب اس کا وقت آخر آیا، تو اس نے خواہش ظاہر کی کہ کوئی لڑکا ایسا مل جائے جسے وہ اپنا "علم سینہ" بتا دے، ایک لڑکا جانے لگا، اتفاقاً اس سے ایک راہب سے کہ وہ دین عیسوی کا حقیقی پرستار تھا، شناسائی ہوگئی، اس نے اپنے مذہب کی تعلیم دینی شروع کی، اب لڑکے پر دوگونہ آفتیں تھیں، ساحر پوچھتا اتنی دیر کہاں کی؟ اس پر وہ پیٹتا، اور اس کی شکایت پر گھر والے پیٹتے، ایک روز وہ جا رہا تھا، کہ راستے میں ایک جانور دیکھا (اکثر کتابوں میں "دابۃ" کا لفظ ہے، تفسیر کبیر صـــ۵۲۱ میں حیۃ یعنی اژدہا ہے،) جس سے راستہ رکا ہوا تھا، لڑکے نے ایک پتھر اٹھایا، اور کہا کہ اگر راہب کا مذہب سچا ہے، تو یہ اس سے مر جائے، وہ اس سے مر گیا، اس واقعہ سے

تمہارے پائے ثبات کو لغزش نہ ہو، کیا تم نے ان لوگوں کا (اصحاب اخدود کا) حشر نہیں دیکھا، جنہوں نے مومنین و مومنات کو جلایا (ان الذین فتنوا المومنین والمومنات) تو ان کا حشر یہی ہے کہ (فلھم عذاب جھنم ولھم عذاب الحریق)

اب یقین ہے کہ حق گو صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کو "فتن" کے معنی معلوم ہو گئے ہوں گے، کہ اس جگہ پر "جلانا" ہیں، نہ کہ غلام بنانا غلام بنانا تو کبھی بھی، کسی صورت میں کبھی نہیں ہو سکتے[1]، یہ ترجمہ میرا ذاتی نہیں ہے بلکہ جملہ ارباب تفسیر اس پر متفق ہیں کہ

ومعنی فتنوھم عذبوھم بالنار واحرقوھم، (کشاف صفہ ۵۳۵) — فتنوہم کے معنی ہیں، ان کو آگ کا عذاب دیا اور جلایا،

ان الذین فتنوا: اے عذبوا واحرقوا (خازن، صفہ ۳۸۷) — یعنی آگ کا عذاب دیا اور جلایا،

ومعنی فتنوھم، عذبوھم — یعنی ان کو (مسلمانوں کو) آگ کا عذاب

---

[1] "فتنوا" کو اگر وسیع ترین معنی میں لیا جائے، اور محض تکلیف دینا اس سے مراد سمجھی جائے تو بھی ظاہر ہے کہ اس مطلق مفہوم کو مقید بہرحال کرنا پڑیگا، ورنہ لڑکے کی چشم نمائی، ملازم کی تادیب، مجرم کی سزایابی، سب کچھ ناجائز ہو جائے گی، غلامی کا جواز چونکہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے اس لیئے اسے بھی "فتنوا" کے وسیع د

لوگوں کو عقیدت پیدا ہو گئی، بادشاہ کا ایک مصاحب کہ اندھا تھا اسے
بھی لڑکے نے اچھا کر دیا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا، بادشاہ نے پوچھا تم تو
اندھے تھے، اس نے جواب دیا، خدا نے اچھا کر دیا، اس نے کہا، خدا
کون؟ اور کیسا؟ پھر بادشاہ کو سب قصہ معلوم ہوا، اس نے لڑکے اور
راہب کو بلوایا اور تینوں سے مطالبہ کیا کہ اپنے آبائی مذہب پر قایم ہو
انہوں نے انکار کیا، تب جھلا کر اس نے حکم دیا کہ انہیں پہاڑ کی چوٹی
سے گرا دو، جو لوگ لے گئے تھے، وہ لوگ خود گر گئے، اور یہ داعیان
حق و صداقت محفوظ رہے، اسی طرح غرقابی کا حکم دیا، اس کا حشر
بھی ایسا ہی ہوا، بالآخر لڑکے نے کہا حضرت! یوں تو آپ میرا بال
بھی بیکا نہیں کر سکتے "بسم اللہ رب الغلام" کہہ کر مجھے پھانسی دیجئے
اس کے ساتھ تو یہ ہوا کہ پھانسی ملی، لیکن اور لوگوں نے نہیں مانا، تو
بادشاہ نے ان لوگوں کے لئے گڑھے کھدوائے اور جلوا دیا، یہ تھا
وہ "فتنہ" جسنے کفار و طاغوت کی ایک جماعت کو اسی سورۃ میں "اصحاب
الاخدود" کا خطاب دلوایا، کہ انہوں نے مومنین قانتین کو سپرد آتش کیا
تھا، اور اس واقعہ کی طرف اشارہ کرکے مسلمانوں کو ثبات قدم کی
دعوت دی جا رہی ہے، دل بڑھایا جا رہا ہے، ہمت افزائی کی
جا رہی ہے، کہ اگرچہ مصائب و ابتلاسے تمہیں دوچار ہونا پڑے لیکن

بالنار واحرقوهم۔

(مدارک صفحہ ۳۸۷ بحاشیہ خازن)

دیا اور جلا دیا،

ومعنی فتنوهم، اے احرقوهم بالنار، یقال فتنت الشئی اذا احرقته والعرب تقول فتن فلان الدرهم والدینار اذا ادخله الکور لینظر جودته

(کتاب سراج منیر للامام الخطیب الشربینی صفحہ ۴۲۸)

فتنوہم، یعنی مسلمانوں کو آگ میں جلا دیا، "فتنت الشئی" اس وقت کہتے ہیں، جب وہ جلائی جائے۔ عرب کہتے ہیں "فتن فلان الدرہم والدینار" جب اسے بھٹی میں ڈالتے ہیں تاکہ اس کا کھوٹا کھرا پرکھیں،

ان الذین فتنوا المومنین والمومنات حرقوهم

(ابن جریر، صفحہ ۹۲)

جنہوں نے مومنین ومومنات کو فتنہ میں مبتلا کیا، یعنی جلایا۔

اصل الفتنة، الابتلاء والامتحان ذالك لان اولٓئك الکفار امتحنوا اولٓئك المومنین وعرضوهم علی النار واحرقوهم، وقال بعض المفسرین الفتنة هی

فتنہ کے اصل معنی ہیں، ابتلا وامتحان اور یہاں یہ اس لئے ہے کہ ان کفار نے ان مسلمانوں کو ابتلا میں ڈالا تھا آگ میں جھونک دیا تھا اور جلایا تھا، بعض مفسرین فتنہ کے معنی "آگ میں جلانے کے ہی کے لیتے ہیں۔

الاحراق بالنار، قال ابن عباسؓ ومقاتل فتنوا المومنین حرقوهم بالنار، قال الزجاج یقال فتنت الشئی احرقته، والفتن احجار سود کانها محرقة،
(تفسیر کبیر صفحہ ۵۲۵)

ابن عباس ومقاتل کہتے ہیں "فتنوا المومنین" یعنی انہیں آگ میں جلایا زجاج کا قول ہے فتنت الشئی" اس وقت کہتے ہیں جب اسے جلاتے ہیں اور "فتن" ان سیاہ پتھروں کو کہتے ہیں، جو گویا جلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں

امام رازی نے اپنی تفسیر میں زیادہ شرح وبسط سے کام لیا ہے لغوی معنے، اور اصطلاحی معنی بھی بیان کردیئے ہیں، کلام عرب سے استشہاد بھی کیا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے، جو حق گو صاحب کی بارگاہ سب وشتم سے "قتل مرتد" کے سلسلہ میں نہ معلوم کس کس طرح نوازے گئے ہیں، اب دنیا انہیں "حبرالامة" سمجھتی ہے، ترجمان القرآن سمجھتی ہے، جلیل القدر صحابی رسول سمجھتی ہے، جن کی تفسیر کا تقریبًا تمام تر دارومدار سماعت رسول سے ہو، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قول کو ہمیشہ خاص اہمیت دی جاتی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی "فوز الکبیر" میں ایک مستقل رسالہ شامل کیا ہے، جو حضرت ابن عباس ہی کی تفسیر پر مشتمل ہے، یہ حقائق بھی اگر ایمان کے لئے کافی نہیں، تو آخر

فبای حدیث بعدہٗ یومنون اس کے بعد وہ کون بات ہے جس

پر تم ایمان لاؤ گے!

سطور بالا سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ اسلام نے اگر غلامی کو جائز رکھا ہے، تو ضرورۃً، اور ہر وقت اس کا امکان ہے کہ زیادہ سے زیادہ غلام آزاد ہوں، ان کو حقوق اتنے دیئے ہیں کہ وہ خاندان کے ایک ممبر کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ جو حق گو صاحب نے فرمایا کہ

"ابن ماجہ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عورت سے کئی آدمی نکاح کر سکتے ہیں، اس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، کہ لونڈیوں کو یہ حق کبھی نہیں دیا گیا کہ وہ باعصمت ہی رہیں"

حق گو صاحب اپنے بے معنی جوش و خروش میں کیسی باتیں کہہ جاتے ہیں "کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم" یہ حکم اسلام کا ہو سکتا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ مولیٰ اپنی لونڈی سے متمتع ہو سکتا ہے، لیکن کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس کے بعد اس کے حقوق کیا ہو جاتے ہیں؟ وہ محرمات میں داخل ہو جاتی ہے، وہ کبھی بیچی نہیں جا سکتی، مولیٰ کے انتقال کے بعد خود بخود آزاد ہو جاتی ہے، پھر یہ کیسا ستم ہے کہ حق گو صاحب نے بغیر سوچے سمجھے، بغیر اپنے "عراقی خانساماں" سے پوچھے گچھے، قلم اٹھا کے جو چاہا لکھ دیا، انہیں سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں، اور اس کا اثر کیا ہوگا، لیکن

شاید وہ تو چاہتے یہی ہیں کہ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

آگے چل کر ایک نہایت مضحکہ خیز دعویٰ کیا جاتا ہے کہ

"رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے زمانہ کی تاریخ دیکھ جاؤ، تم کو کوئی ایسا واقعہ نظر نہ آئے گا کہ مسلمان کو مسلمان نے غلام بنایا"

دعویٰ کتنا مدلل ہے، "دلیل کتنی ظاہر و باہر" ہے اب اس پہ کیا عرض کیا جا سکتا ہے؟ کم از کم حضرت عمر کے اس غلام سے تو تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے، جس کے اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے حضرت عمر بیت المقدس میں داخل ہوئے تھے، حضرت بلال بھی سرکار رسالت کے "غلام" اور سب مسلمانوں کے آقا ہی تھے، اور "مسلمان" بھی تھے، اور غالباً کافی عرصہ کے بعد وہ آزاد ہوئے ہیں،

لونڈی کے سلسلہ میں ایک اور بات کہہ کے میں اپنا بیان ختم کرتا ہوں، حق گو صاحب نے لونڈی کی بہت حمایت کی ہے، اور اسلام پہ حملہ کیا ہے کہ وہ لونڈیوں کو باعصمت بھی نہیں رہنے دیتا، اس دعوے کی تردید ہو چکی ہے، لیکن ایک حدیث اور ملاحظہ فرمالیجئے، جس سے کئی نتائج مستنبط ہوتے ہیں،

حدثنا محمد بن کثیر انا
سفیان عن صالح عن الشعبی
عن ابی بردۃ عن ابی موسیٰ
الاشعری قال قال النبی ایما
رجل کانت لہ جاریۃ د و
بماق حسن تعلیمها، واعتقها
وتزوجها فلہ اجران۔

ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
جو شخص اپنی لونڈی کی تربیت کرے
اچھی تعلیم دے، پھر آزاد کرکے اس سے
شادی کرے اس کے لئے دو
اجر ہیں۔

بخاری صـ ۳۴۶

اس حدیث سے ایک تو عام مطلب نکلتا ہے کہ لونڈی کو آزاد کرکے شادی کرلینا موجب رحمت خداوندی ہے لیکن ایک بات اور ہے، جو یقیناً قابل غور ہے یہ کہ ارشاد ہوتا ہے کہ اپنی لونڈی کو آزاد کرے اور شادی کرے، لونڈی اگر مشرکہ ہے تو اس سے شادی ہو نہیں سکتی کہ اس "سول میرج" سے خود قرآن نے منع کیا ہے، اب یا وہ اہل کتاب ہوتی، یا مسلمان، تو حدیث میں اس کی کوئی تخصیص نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان ہو،

(سچ - ۱۱ ستمبر ۱۹۳۱ء)

قربانی کی دینی حیثیت!

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رسالہ جامعہ کے اگست نمبر میں " صدائے حق " کے نام سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں قربانی کے متعلق نہایت عالمانہ، عارفانہ اور ناصحانہ لب ولہجے میں گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں فیصلہ فرمایا گیا ہے کہ بحالات موجودہ قربانی ایک رسم باطل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی،

مذہب سے متعلق گفتگو کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں یا تو گفتگو منقولات کی حد تک محدود ہو، یا معقولی انداز میں نفس مسئلہ پر اثباتی یا سلبی اعتبار سے اظہار خیال کیا جائے، اور ان دونوں صورتوں میں یہ ضروری ہے کہ معترض جس چیز پر اعتراض کر رہا ہے اس کے مالہ وما علیہ سے واقف ہو، منقولات سے متعلق تمام چیزیں اس کے پیش نظر ہوں، مذہبی تعلیم، احکام اور اوامر سے بھی وہ پورے طور سے آشنا ہو، اس کے متعلق موافقت یا مخالفت میں جو کچھ کہا گیا ہو وہ بھی اس کے سامنے ہو، پھر اسے بلاشبہ حق ہے کہ وہ کسی مسئلے پر گفتگو کرے، اور اپنے نقطہ نظر سے اسے غلط یا صحیح قرار دے،

لیکن جب صورت حال برعکس ہو محض غور وفکر یا اقتباس و استنباط

سے کوئی رائے قایم کرلی گئی ہو، اور منقولی اعتبار سے کیسۂ معلومات بالکل خالی ہو تو میرے خیال میں یہ بہت جرأت ہو گی، اگر پھر بھی پورے ادعا کے ساتھ گفتگو کرکے کوئی آخری فیصلہ کر دیا جائے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ "صدائے حق" کے نام سے جن صاحب نے اپنا مضمون شائع کرایا ہے انہوں نے یہی دوسری صورت اختیار کرائی ہے۔

انہوں نے بعض مقامات پر ترجمہ غلط کیا ہے، نفس مسئلہ سے متعلق تمام آیات قرآنی کو اپنے سامنے نہیں رکھا، حدیث وسنت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے، نہایت ناقص طور سے چند آیتیں انہوں نے لکھ دی ہیں اور ان سے سیاق وسباق سے بالکل الگ ہو کر ایک نتیجہ اخذ کرلیا ہے اور اسی کو وہ ملہمانہ انداز میں پیش کر رہے ہیں، گویا جو کچھ وہ فرما رہے ہیں وہ مدلل بھی ہے،

بہرحال، یہ ضروری نہیں کہ اس معاملے میں محترم مقالہ نگار کی پیروی کی جائے، مناسب یہ ہے کہ اصل مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں اس میں کہاں تک شائبۂ صداقت ہے اور کہاں تک ادعاء محض؟

ارشاد ہوا ہے،

"قربانی کی ابتدا ہر ملک اور ہر قوم کی ابتدائی تہذیب میں

اس باطل اعتقاد کے ماتحت ہوئی ہے کہ خدا اپنی شکل، ضروریات عادات وجذبات میں انسان کے مشابہ ہے اور جو جانور شراب، پھول پھل اور زیورات وغیرہ اس پر چڑھائے جاتے ہیں، وہ ان کا جوہر استعمال کرتا ہے"

محترم مقالہ نگار صاحب جس چیز کو ایقانی لب ولہجے میں "اعتقاد باطل" قرار دے رہے ہیں، قرآن مجید کا فیصلہ اس کے متعلق دوسرا ہے،

ولکل امۃ جعلنا منسکا	اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی
لیذکروا اسم اللہ علی ما	کرنا اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ
رزقھم من بھیمۃ الانعام ط	ان مخصوص چوپاؤں پر اللہ کا نام
فالھکم الہ واحد فلہ اسلموا	لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے
وبشر المخبتین الذین اذا	سو تمہارا معبود ایک ہی خدا ہے تو تم
ذکر اللہ وجلت قلوبھم	ہمہ تن اسی کے ہو کر رہو اور آپ
والصابرین علی ما اصابھم	گردن جھکانے والوں کو خوش خبری
والمقیمی الصلوٰۃ ومما	سنا دیجئے جو ایسے ہیں کہ جب اللہ
رزقنھم ینفقون ہ	کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل
	ڈر جاتے ہیں اور جو ان مصیبتوں پر

کہ ان پر پڑتی ہیں صبر کرتے ہیں اور
جو نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور
جو کچھ ہم نے دیکو دیا ہے اس میں
سے خرچ کرتے ہیں۔

(ترجمہ از حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی)

آیات بالا نے اس "اعتقاد باطل" کی تردید کردی ہے جو اقتباس بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ اسلامی قربانی اس قربانی سے مختلف ہے، جو مختلف دیوتاؤں کی خوشنودی مزاج کی خاطر کی جاتی تھی، قربانی کا مقصد یہ قرار دیا گیا۔ کہ لوگ ان جانوروں پر "اللہ کا نام لیں"، "جو معبود ہے" اور "جو ایک ہی ہے" اور بتوں اور دیوتاؤں کو چھوڑ دیں کہ صرف اسی کے آگے "گردن جھکانے والوں کو خوش خبری ہے"

یہاں اس خیال کی بھی تردید ہو جانی چاہیئے کہ "خدا ان چیزوں کا جوہر استعمال کرتا ہے" اس لئے کہ قرآن مجید میں اس کی صاف و واضح الفاظ میں تردید موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت و خون نہیں پہنچتا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے، مطلب یہ کہ جس جذبے جس روح اور جس نیت کے ماتحت قربانی کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے اور اسی کے ماتحت

عذاب و ثواب کا حکم صادر فرماتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا ہے۔

"خدا نے جب عرب کی نیم وحشی قوم میں آج سے چودہ سو برس پہلے نبی آخر الزمان کے ذریعے سے اپنی ذات وصفات کا صحیح تصور قایم کرنا چاہا تو اس مروجہ رسم کو شراب یا ربا کی طرح سے حرام یا ناجائز نہیں کیا کیونکہ وہ شراب یا ربا کی طرح سے مخرب اخلاق یا مضر نہیں تھی، بلکہ وقتی اور مقامی تمدنی ضروریات کے لحاظ سے ایک مفید اور کارآمد رسم تھی"

مضمون کا سب سے دلچسپ حصہ یہی ہے، اس سے پیشتر مضمون نگار صاحب اس رسم کو "اعتقاد باطل" قرار دے چکے ہیں اور اب ارشاد ہوتا ہے کہ "نبی آخر الزمان کے ذریعے سے (خدا نے) اپنی ذات وصفات کا صحیح تصور قائم کرنا چاہا" تو اسے جائز رکھا اس لئے کہ یہ رسم "مخرب اخلاق یا مضر نہیں تھی" "بلکہ ایک مفید اور کارآمد رسم تھی۔"

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اسی سلسلے میں ارشاد ہوا ہے۔

"لن ینال اللہ لحومھا ولا   یعنی نہ ان کا گوشت اور خون خدا

دماؤها ولکن ینالہ التقوی منکم ؕ — قبول کرتا ہے، بلکہ وہ تمہارا تقوےٰ کرتا ہے،

(اس آیت کا) یہی مطلب ہے کہ جانوروں کی خون ریزی خدا کی نظروں میں کوئی احسن فعل نہیں کیونکہ وہ گوشت اور خون کو قبول نہیں کرتا ہے"

نہ معلوم کس مقصد کے ماتحت مضمون نگار صاحب نے اس مقام پر آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے، اول تو یہ کہ انہوں نے اللہ کو فاعل قرار دیا ہے حالانکہ اس جگہ "لحوم" فاعلی حالت میں ہے دوسرے یہ کہ "ینال" کا ترجمہ فرمایا ہے "قبول" کرتا ہے حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے،

پہلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ مشرکین جب قربانی کرتے تھے تو خانۂ کعبہ پر خون کے چھینٹے دیتے تھے، اور گوشت چڑھاتے تھے اسی "اعتقاد باطل" کے ماتحت جس کا ذکر مضمون نگار صاحب فرما چکے ہیں، لیکن اسلام نے منجملہ اور عقاید باطلہ کی اصلاح کے اس "اعتقاد باطل" کو بھی دور کر دیا، کہ اس خون چھڑکنے اور گوشت چڑھانے سے کیا فائدہ - یہ چیزیں تو خدا تک پہنچنے سے رہیں، (اگرچہ ان کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں) خدا تک پہنچنے والی جو چیز ہے وہ تمہارا تقویٰ ہے، یعنی خلوص نیت کہ تم یہ قربانی "رئاء الناس" کر رہے ہو، یا "حسبۃً للہ" پہلی صورت

میں وہ مردود ہے اور دوسری صورت میں مقبول، تفصیل کی اگر ضرورت ہو تو ابن جریر، کشاف، اور دوسری معتبر کتب تفسیر میں تلاش کیا جا سکتا ہے،

رہا "وقتی، مقامی، اور تمدنی ضروریات کا لحاظ" تو یہ ایک عجیب مبہم سی بات ہے، قرآن مجید میں جس حکم کو بالصراحت بیان کیا گیا ہو اس کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہو، اس کے انجام دینے پر ثواب و مغفرت کی بشارت ہو، جس کے چھوڑ دینے پر عذاب و عتاب کی دھمکی ہو، جس کو بار بار بکرّات و مرّات ایک فریضہ اور رضائے الٰہی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہو، جس کے متعلق کوئی حد بندی نہ ہو، حکم میں عمومیت ہو، عہد رسالت سے لے کر ۱۹۳۳ء تک برابر وہ فریضہ ادا کیا جاتا رہا ہو اس کے متعلق دفعتہً یہ انکشاف دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ تعجب خیز بھی ہے!

آگے چل کر فرمایا گیا ہے:-

"کفارے میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ہدایتیں موجود ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غلامی کی رسم کو قائم رکھنا خدا کی منشا کے مطابق ہے اور اگر اس کو قایم نہ رکھا گیا تو بعض گناہوں کے کفارے میں جو غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم

استطاعت نہ ہو تو دس روزکے روزے ضروری قرار دیئے گئے ہیں،

قرآن مجید میں قربانی کے متعلق بہت زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں احکام موجود ہیں، جن سے اگر عمداً چشم پوشی نہ کی جائے تو یقیناً ہر شخص راہ یاب ہو سکتا ہے مثلاً

وَالبدن جعلنا ها لكم من
شعائر الله لكم فيها خير
فاذكروا اسم الله عليها صوآف
فاذا وجبت جنوبها فكلوا منها
واطعموا القانع والمعتر كذٰلك
سخرنا ها لكم لعلكم تشكرون
لن ينال الله لحومها ولا دماؤ
ها ولكن يناله التقوىٰ منكم
كذالك سخرها لكم لتكبروا الله
علىٰ ما هديكم وبشر المحسنين ط

اور قربانی کے اونٹ اور گائے ہم نے
اللہ کی یادگار بنایا ہے، ان جانوروں
میں تمہارے فائدہ ہیں، سو تم ان پر
کھڑے کر کے اللہ کا نام لیا کرو، پس جب
وہ کروٹ کے بل گر پڑیں تو تم بھی خود
کھاؤ اور بے سوال اور سوالی کو بھی
کھانے کو دو، ہم نے ان جانوروں
کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا تاکہ
تم شکر کرو، اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت
پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون پہنچتا ہے
ولیکن ان کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا
ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں
کو زیر حکم کر دیا تاکہ تم اس بات پر اللہ

ہے اس کی حکم عدولی ہو جانے سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے، تو کوئی وجہ نہیں معلوم کہ جانوروں کی قربانی کے متعلق محض کلام مجید میں بعض ہدایتیں موجود ہونے سے اس رسم کو بند کر کے دوسرے مفید ذرائع سے اس کی روح کو قایم رکھنے سے مسلمان کیوں کر کسی گناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں"

غلامی اور قربانی کی باہم مطابقت یقیناً مضمون نگار صاحب کا ایک دلچسپ کارنامہ ہے۔

غلامی کو خدا نے کہیں کبھی پسندیدہ فعل نہیں فرمایا، نہ اسے "من شعائر اللہ" قرار دیا ہے اسی طرح جہاں کہیں بطور کفارے کے غلام کو آزاد کرنے کی ہدایت ہے وہیں بطور کفارے کے روزہ یا اسی قسم کی کسی اور چیز کے متعلق بھی موجود ہے کہ اگر غلام نہ ہو تو بایں طور کفارہ ادا کیا جائے،

قربانی کے متعلق کہیں نہیں ہے کہ کسی خاص موقع پر تم قربانی کے جانوروں کو آزاد کر دیا کرو، بلکہ حکم ہے تو یہ کہ یہ قربانی کی رسم "سنت ابراہیمؑ" اور "من شعائر اللہ" ہے رہا قربانی کی فرضیت اور وجوب کا سوال تو یہ انہیں پر ہے جو صاحب استطاعت ہوں، اگر

مجید ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ قربانی تمہارا ایک فریضہ ہے، اسلام "دین ابراہیمی" جب سے ہے یہ رسم چلی آ رہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی یادگار رہے ہر دل کا یہ فعل آقا کی خوشنودی کا سبب ہے، اس کے کرنے پر ترغیب و تحریص ہے اور نہ کرنے پر عذاب و عتاب کی وعید، پھر ہم اسے کیونکر چھوڑ سکتے ہیں

باقی رہی مصلحت سو اس سے الحمدللہ اسلام کا دامن پاک رہا ہے کسی مصلحت کی بنا پر، کسی ضروری امر کا نفاذ نہ کرنا، کسی مذہب کا کبھی دستور نہیں رہا ہے، اور اگر رہا ہے تو وہ مذہب یقیناً خدائی مذہب نہیں ہے، بلکہ کمزور دل مصلحت شناس، مصلحوں کی ایجاد ہے، جو کبھی کبھی اس کی مستحق نہیں کہ عالمگیر قبولیت حاصل کر سکے،

اسلام جب دنیا میں آیا، تو ساری دنیا کفر و طغیان سے لبریز تھی ایک خدا کی بجائے سیکڑوں خداؤں کی پرستش ہو رہی تھی، دین حنیف کے آثار اور نقوش مٹ گئے تھے، اور کفر و شرک کی تاریکیاں حق و صداقت پر چھائی ہوئی تھیں، لیکن اسلام کی نیّر تاباں نے طلوع ہوتے ہی کفر و شرک کے بادلوں کو چھانٹ دیا،

دعوت اسلام کے آغاز میں داعیٔ اسلام کو کیا کچھ تکلیفیں نہ دی گئیں، سیم و زر کے انباروں نے کس کس طرح لبھایا، اور حسن و جمال کی عشوہ طرازیاں کس کس طرح بے نقاب ہوئیں، خوف ہلاکت اور بار

کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو توفیق
دی اور اخلاص والوں کو خوشخبری
سنا دیجئے۔

اوپر کی سطروں میں جو آیات پاک پیش کی گئیں ان سے صاف الفاظ میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی "من شعائر اللہ" ہے اور اس میں "تمہاری لئے بہتری ہے" اور آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ "اخلاص والوں کو خوش خبری سنا دیجئے" یعنی ان کے حسن عمل اور حسن نیت کے بدلے میں انہیں ثواب ملے گا، اور رضائے الٰہی جیسی دولت بے بہا حاصل ہو گی، ان آیات مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ قربانی "وقتی، مقامی اور تمدنی ضروریات" کے ماتحت نہیں باقی رکھی گئی، بلکہ ان مصالح کے ماتحت باقی رکھی گئی، جو بدستور قایم ہیں، یعنی صرف جذبۂ خلوص کا اظہار، تمام دوسرے مصنوعی معبودوں سے رشتہ توڑ کر ایک ہی خدا سے لو لگا کر، اس کا نام لینا، اس کا تذکرہ کرنا، اور اس کے حکم کی تعمیل میں قربانی کرنا۔

علاوہ ازیں غلامی ایک ایسی رسم ہے، جو خود انسانوں کی قایم کی ہوئی ہے، اس لئے اس کے متعلق اگر کچھ باتیں ایسی ہوں، جن سے یہ احساس ہوتا ہو، کہ اسے رفتہ رفتہ کم اور پھر ختم ہو جانا چاہیئے، تو زیادہ مقام تعجب نہیں لیکن قربانی کا معاملہ بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، قرآن

رسوائی نے کیسے کیسے بھیانک مرقعے پیش کئے، اپنوں اور دوستوں کی رفاقت کے رشتے آن کی آن میں ٹوٹ گئے اور ساری خدائی دشمنی اور قتل پر آمادہ ہوگئی لیکن داعی اسلام کی جبین استقلال پر شکن تک نہ آئی اگر ارشاد ہوا تو یہ کہ یہ کفار اگر میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج دیدیں، جب بھی میں اس دعوت حق سے باز نہیں آسکتا لیکن چودہ سو برس کی طویل مدت گزر جانے کے بعد ایک نقاب پوش ہستی اٹھتی ہے اور ادعا کے ساتھ کہتی ہے کہ یہ سب کچھ "مصلحت" کے ماتحت تھا، اللہ اللہ! اسلام پر اور داعی اسلام پر کتنا ناروا سوء ظن ہے،

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر اگر صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں غور کیا جائے، تو یہ ایک مسلمہ اور طے شدہ مسئلہ ہے کہ اسلام میں قربانی کی مذہبی حیثیت ہے اور وہ حج کا ایک اہم رکن ہے جس کو اگر مجبوری اور افلاس کی وجہ سے کوئی شخص نہ ادا کر سکے تو از روئے قرآن اس پر دس روز کے روزے واجب ہوتے ہیں مثلاً ارشاد ہوتا ہے،

واتموا الحج والعمرة للہ فان	اور حج وعمرہ کو اللہ تعالیٰ کے واسطے
احصرتم فما استیسر من الھدی	پورا پورا ادا کیا کرو، پھر اگر روک
ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ	دیئے جاؤ تو قربانی کا جانور جو کچھ

الهدي محله فمن كان منكم
مريضا او به اذى من راسه
ففدية من صيام او صدقة
او نسك، فاذا امنتم فمن
تمتع بالعمرة الى الحج فما
استيسر من الهدى فمن
لم يجد فصيام ثلثة ايام
في الحج وسبعة اذا رجعتم
تلك عشرة كاملة ذالك
لمن لم يكن اهله حاضرى
المسجد الحرام واتقوا الله
واعلموا ان الله شديد
العقاب ٥

میسر ہو اور اپنے سروں کو اس وقت
تک مت منڈواؤ جب تک کہ قربانی
اپنے موقع پر نہ پہنچ جائے۔ البتہ اگر
کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر
میں کچھ تکلیف ہو تو فدیہ دیدے روزے
سے یا خیرات دینے سے یا ذبح کر دینے
سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو
تو جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ
ملا کر منتفع ہوا ہو تو جو کچھ قربانی میسر
ہو، پھر جس شخص کو قربانی کا جانور
میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے ہیں
حج میں اور سات ہیں جبکہ حج سے تمہارے
لوٹنے کا وقت آجائے، یہ پورے
دس ہوئے۔ یہ اس شخص کے لئے ہے
جس کے اہل مسجد حرام کے قرب میں
نہ رہتے ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے
ڈرتے رہو اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ

تعالیٰ سزائے سخت دیتے ہیں:-

آیات بالا سے قربانی کی دینی حیثیت اور مذہبی اہمیت کا اور زیادہ صحیح اندازہ ہو جانا چاہیئے، ان آیات سے یہاں تک معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی نہ کر سکے تو اسے دس روز کے روزے رکھنا چاہیئے، اگر کوئی شخص روک دیا جائے تو بھی قربانی کرے، حلق کی رسم اس وقت تک نہ ادا کرے جب تک قربانی کے جانور اپنے مقام پر نہ پہنچ لیں اور آخر میں ارشاد فرمایا ہے، "اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور جان لو، کہ اللہ تعالیٰ کی سزا بہت سخت ہوتی ہے۔" ان صاف وصریح احکام واوامر کی موجودگی میں بھی اگر کوئی صاحب یہی کہتے رہیں کہ یہ سب کچھ "وقتی ضروریات" کے ماتحت تھا، تو سوائے خاموشی کے اور کیا جواب ممکن ہے

قرآن مجید کا جتنا زیادہ مطالعہ کیا جائے گا، قربانی کی اہمیت و حیثیت روشن ہوتی جائے گی، ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام	خدا نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے
قیاماً للناس والشھر الحرام	لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار
والھدی والقلائد، ذالك	دیا اور عزت والے مہینے کو بھی اور
لتعلموا ان اللہ یعلم ما	حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو
فی السمٰوٰت وما فی الارض	بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے

وان اللہ بکل شیٔ علیم ۝

میں پڑے ہوں یہ اس لئے کہ تم اس بات کا یقین کر لو، کہ بے شک اللہ تعالی تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور بے شک اللہ تعالی سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں۔

جس چیز کو اللہ تعالی معززنہ فرما رہا ہو اسے نہ معلوم کس دلیل سے "خدا کا تصور قایم کرنے والا" "اعتقاد باطل" کہا جا سکتا ہے،

ایک اور موقع پر وارد ہوا ہے:۔

ذالك ومن یعظم شعائر اللہ فانها من تقوی القلوب ۝ لکم فیها منافع الی اجل مسمی ثم محلها الی البیت العتیق ۝

یہ بات بھی ہو چکی اور جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے تم کو ان سے ایک معین وقت تک فوائد حاصل کرنا جائز ہے پھر ان کے ذبح حلال ہونے کا موقع بیت عتیق کے قریب ہے۔

اس جگہ یہ فرق بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اسلام کی قربانی اور دوسری قربانیوں میں بہت بڑا فرق ہے، مشرکین کی قربانیوں کا مقصد ہوتا ہے مختلف قوتوں کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا علاوہ ازیں ان کی قربانی زیادہ تر انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ ان کی قربانی کا کوئی مصرف نہیں ہوتا جو اجتماعی طور سے برتا جا سکے برعکس اس کے اسلام کی قربانی ایک جداگانہ اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے اس کی حیثیت اجتماعی ہے اس کا مصرف بھی مقرر و متعین ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رضائے الٰہی کی تمنا کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جذبہ کار فرما ہوتا ہے کہ اجتماعی طور سے بہت سے مفلس اور قلاش لوگوں کا بھلا ہو جاتا ہے،

اسلام کی قربانی کے متعلق یہ خیال قایم کرنا کہ اس سے کسی زمانے میں بھی "خدا کے تصور میں مدد ملتی تھی" یقیناً ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے، اسلام کی سب سے اہم اور سب سے پہلی دعوت توحید ہے، جو بغیر کسی قسم کی آلائش اور ابہام کے اسلام کا اصل اصول رہا ہے، جہاں کہیں بھی قربانی پر زور دیا گیا ہے، وہاں کہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ اس سے خدا کے تصور میں مدد ملتی ہے. بلکہ ہمیشہ توحید پر ساری قوت صرف کی گئی ہے، شرک اور بت پرستی کی قسم کے جذبات کو بیخ و بن سے

اکھاڑنا ہی اسلام کا اصل کام ہے، قرآن و حدیث میں جا بجا نہایت کثرت سے اس دعوے کے شواہد مل سکتے ہیں،

ایک اور موقع پر قرآن مجید میں وارد ہوا ہے،

واذ بوّانا لابراهیم مکان البیت ان لا تشرك بی شیئًا وطهر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود ۞ واذن فی الناس بالحج یاتوك رجالًا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق ۞ لیشهدوا منافع لهم ویذکروا اسم الله فی ایام معلومات علی ما رزقهم من بهیمة الانعام فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر ثم لیقضوا تفثهم ولیوفوا نذورهم ولیطوفوا بالبیت العتیق ۞

اور جب کہ ہم نے ابراہیم کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلا دی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک مت کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے پاک رکھنا اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے، پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی، تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں، اور تاکہ ایام مقررہ میں ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں، جو خدائے تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں، سو ان جانوروں

میں سے تم بھی کھایا کرو اور مصیبت
زدہ محتاجوں کو بھی کھلایا کرو، پھر
لوگوں کو چاہیئے، کہ اپنا میل کچیل
دور کریں، اور اپنے واجبات کو
پورا کریں اور اس مامون گھر کا
طواف کریں، (ترجمہ از حکیم الامتہ)

صفحات بالا میں قرآن مجید کی جو آیات پیش کی گئیں ان سے میرے خیال میں قربانی کی مذہبی حیثیت اچھی طرح آشکارا ہو گئی، حدیث سے کچھ میں نے عمداً پیش کرنے کی جرأت نہیں کی اس لئے کہ یہ معلوم تھا کہ مضمون نگار صاحب حدیث کی دینی حیثیت کے قائل ہیں یا نہیں،

منقولی حیثیت کا جہاں تک تعلق تھا، اس مسئلے پر سیر حاصل بحث وگفتگو ہو چکی ہے، چنانچہ میں ایک اور آیت پیش کر کے اس اعتبار سے گفتگو ختم کرتا ہوں اور وہ یہ ہے،

انا اعطینك الكوثر، فصل لربك وانحر- اللہ تعالیٰ سرکار رسالت سے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں "کوثر" عطا کیا ہے (لہذا بطور اظہار عبودیت وسپاس) تم نماز پڑھو اور

قربانی کرد، اگر قربانی کوئی مذہبی چیز نہیں تھی، اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں تھی، تو دنیا کی سب سے زیادہ پاک اور پاکباز معصوم اور مطہر ہستی کو قربانی کی ترغیب کیوں دی گئی،

شاید نامناسب نہ ہو، اگر اس مسئلے پر "عقل و دانش" کی روشنی میں بھی کچھ غور کر لیا جائے،

فلسفۂ رسوم کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ رسم میں کوئی مذہبی شان نہ ہو محض نام و نمود، شور و ہنگامہ اور اسراف و نمائش مقصود ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے کچھ فوائد مترتب ہوتے ہوں زندگی پر کچھ اثرات پڑتے ہوں، عبرت و بصیرت کا درس حاصل ہوتا ہو مذہبی رسوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہیں،

مثلاً قربانی کے فلسفے پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف ایک رسم کی بجا آوری ہی نہیں ہے، بلکہ اس رسم کہن سے ماضی اور حال میں ارتباط پیدا ہوتا ہے، تاریخ میں جو کچھ پڑھا، روایات سے جو کچھ معلوم کیا، مذہبی ارشادات نے جن چیزوں کی طرف راہ نمائی کی، اس رسم کے انجام دینے سے وہ تمام چیزیں تازہ ہوگئیں، معلوم ہوگیا کہ ذبح عظیم کا معاملہ پیش آیا تھا، خدا کی راہ میں ایک محبوب

بندے نے اپنے لخت جگر کو بھینٹ چڑھا دیا تھا، پس ہر اس شخص پر جو دین حنیف اور ملت ابراہیمی کا ایک فرد ہے واجب ہے کہ اسی روح، اسی جذبے اور اسی احساس کے ماتحت اگر جان کی قربانی نہیں کر سکتا تو کم از کم مال کی "قربانی" سے تو دریغ نہ کرے، کہ اس سے زیادہ پست درجہ قربانی اور کیا ہو سکتی ہے،

قربانی کے متعلق ایک صحابی نے آنحضرتؐ سے استفسار کیا، کہ یہ کیا ہے ارشاد ہوا "سنة ابیکم ابراهیم" یعنی تمہارے جد امجد حضرت ابراہیم کی سنت۔

بلاشبہ یہ تقاضائے عقل و دانش ہے کہ اس مبارک رسم کو جاری رکھا جائے اور اسی طرح جاری رکھا جائے، جس طرح ہوتی چلی آئی ہے،

ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا وہ غیر فانی کارنامہ جس کی یادگار میں قربانی کی رسم پڑی ہے، کس کو نہیں معلوم؟

مشیت نے اپنے دو محبوب بندوں کو امتحان و آزمائش کے لئے منتخب کیا، ایک کہن سال مرد بزرگ تھا، اور دوسرا جواں عمر و جوان سال طفل ہوشمند! باپ کو حکم ملا کہ بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے، قدوسیوں میں تہلکہ پڑ گیا، کہ یہ کیا ہونے والا ہے، مگر مشیت کردگار مسکرائی

کہ :۔

انی اعلم مالا تعلمون

آزمایش کی گھڑی آن پہنچی چشم فلک نے دیکھا کہ بوڑھا باپ میدان میں اتر آیا، اس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں، ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھری تھی، دل میں جذبات محبت کا طوفان موجزن تھا، پر آنکھیں عزم آہنی کی آئینہ دار تھیں، وہ بڑھا اس حال میں کہ نہ اس کے پیروں میں لغزش تھی، اور نہ ہاتھوں میں رعشہ —— آج ایک سر کٹنے کے لئے مضطرب تھا، اور ایک خنجر حلقوم سے پار اترنے کے لئے بیتاب —— بالآخر ابراہیم نے اسماعیل کی گردن پر چھری رکھدی، ربوبیت کاملہ کو اپنے بندوں کی یہ ادا پسند آئی چشم زدن میں معلوم ہوا کہ "قربانی" مقبول ہوئی، خود مشیت نے نہ چاہا کہ اسمٰعیل کی جان ضایع ہو، دیکھا تو چھری کے نیچے ایک جانور پھڑک رہا تھا، قرآن مجید میں ارشاد ہوا :۔

وفدینٰہ بذبح عظیم وترکنا علیہ فی الاٰخرین سلٰم علیٰ ابراھیم ۔ کذالک نجزی المحسنین ○ انہ من عبادنا المومنین ۵	اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ ان کے عوض میں دیا، اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی، ابراہیم پر سلام، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، بے

وہ ہمارے ایماندار بندوں میں تھے،

یہ تھا وہ واقعہ جس کی یادگار میں، قربانی اب تک اپنی اصلی شکل وصورت میں موجود ہے، اور جب تک یہ قربانی قائم ہے وہ روح بھی قائم ہے جس کی یادگار میں سب کچھ کیا جاتا ہے،

اسلام کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ہاں اول تو محض رسوم بہت کم ہیں، اور اگر کچھ ہیں بھی تو وہ اس قدر زیادہ فطرت شناسی پر مبنی ہیں کہ ان کے اعتراف کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں،

اسی قربانی کے مسئلے کو لے لیجئے، قطع نظر اس کے کہ یہ رسم ماضی اور حال میں ارتباط پیدا کرتی ہے اس کی یہ خصوصیت کیا کم قابل توجہ ہے کہ اس رسم کی بجا آوری کے ساتھ وہ تمام جذبات تازہ ہو جاتے ہیں، جو سرفروشی وجاں نثاری کے لئے ضروری ہیں، قربانی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آج اگرچہ دنبہ کی، بکری کی، گائے کی یا اونٹ کی قربانی کی جاتی ہے، لیکن حقیقۃً اس جذبے کے ماتحت کہ قربانی کرنے والا خود اس کے لئے تیار رہے کہ اگر رضائے الٰہی کا سوال درپیش "من انصاری الی اللہ" کی صدا بلند ہو، اور دین حق کو انسانی خون کی ضرورت ہو تو یہی چھری جو آج اس جانور پر چل

رہی ہے خود اپنے حلقوم پر بھی چلنے گی اور چلنا چاہیئے، یہی جذبہ تھا، جس نے کئی سو برس بعد سبط رسولؐ اور جگر گوشۂ بتولؓ، امام مظلومؑ کو رضائے حق کے لئے جان کی بازی لگانے پر مجبور کر دیا!

اسی طرح اس رسم کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس طرح ایک خاص موقع پر چند روپے صرف کر دینے کے بعد خدا کے راستے میں مال و زر قربان کرنے کا جذبہ بھی نہ صرف یہ کہ پیدا ہوتا رہتا ہے، بلکہ تازہ بھی ہوتا رہتا ہے ان مصالح کی بنا بھی قربانی کی رسم کو غیر ضروری قرار دینا یا اس کی موجودہ صورت کو دوسری اصطلاحی صورتوں میں مدغم کر دینا ایک بہت بڑا ظلم ہے جس کی تلافی آسان نہیں،

مضمون کے آخر میں صاحب مضمون نے ارشاد فرمایا ہے،

"اگر اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان قربانی کی رسم جاری رکھنا چاہتے ہیں تو ان کو عید الضحی اور حج کے موقع پر موجودہ اسلامی انجمنوں کو روپیہ بھیجنا چاہیئے"

تجویز کے معقول ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن دینی معاملات کو اس قسم کی تجاویز پر "قربان" کر دینا درحقیقت بہت بڑی غلطی ہے، کل ایک صاحب یہ تجویز پیش کر سکتے ہیں کہ سیکڑوں ہزاروں روپیہ صرف کر کے لوگ خواہ مخواہ حجاز جاتے ہیں، جس سے کوئی خاص فائدہ

قرآن اور اس کی فضیلت

اللہ تعالیٰ کہتا ہے، "ولقد یسّرنا القران للذکر فھل من مدکر؟" یہ ہوا اس کی آسانی کا ثبوت، پھر خدا نے اسے "کریم" بھی کہا ہے، فرمایا ہے، "انّہ لقران کریم" ایک جگہ اسے "حکیم" بھی کہا ہے، "یٰسٓ والقران الحکیم" ایک اور مقام پر اسے "مجید" بھی فرمایا ہے۔ "قٓ، والقران المجید"!

یہ برکتوں الا قرآن، خدا نے، سید الانام، خاتم الانبیا، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا، یہی آنحضرت کا سب سے بڑا معجزہ تھا، جس کا مقابلہ کرنے سے بڑے بڑے فصحا اور بلغا عاجز اور درماندہ تھے، چنانچہ قرآن نے خود چیلنج کیا، "قل فاتوا بسورۃ من مثلہ" یعنی اے رسول ان کفار سے کہدے کہ یہ قرآن کی سی ایک ہی سورت لاسکیں تو لائیں، ایک اور جگہ فرمایا "قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القران لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا" یعنی اے رسول کہدے، اگر، انس وجن ایکا کرکے قرآن کا مثل لانا چاہیں، تو نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد کرکے سرتوڑ کوشش کیوں نہ کر ڈالیں، قرآن نور مبین ہے، بر

نہیں پہنچتا، بہتر ہو کہ لوگ اپنے کرائے وغیرہ کا تخمینہ کرکے اسلامی انجمن
کو وہ رقم دیدیا کریں، محترم مقالہ نگار صاحب خود فرمائیں کہ اگر اس
قسم کی تجاویز پیش ہونے لگیں تو مذہبی اوامر و احکام اور رسوم
و ہدایات رفتہ رفتہ کس قدر جلد ختم ہو جائیں؟

اسی لئے مذہب میں کسی قسم کی "بدعت" کو "ضلالت" سے تعبیر کیا
گیا ہے، اور "ضلالت" کے متعلق ارشاد ہوا ہے اس کا ٹھکانا جہنم ہے
مسلمانوں میں قربانی جیسی صحیح مذہبی رسم کے علاوہ اور بہت سی
غیر شرعی اور مسرفانہ رسوم ہمسایہ اقوام سے اختلاط کی وجہ سے جاری
ہو گئی ہیں، انہیں دور کرنے میں اگر جد و جہد کی جائے، تو وہ عنداللہ
اور عندالناس ہر طرح مشکور ہو۔

آخر میں یہ گزارش شاید بار خاطر نہ ہو کہ نہ صرف "صدائے حق" صاحب
کو بلکہ تمام حضرات کو اس قسم کے مسائل پر اظہار خیال سے بیشتر اس پر غور کرلینا
چاہیئے کہ آیا ان کے سامنے سارا مواد اور تمام ماخذ ہیں یا نہیں؟ بغیر اس
قسم کی تیاری کے قلم اٹھانا اپنی جرأت کا ناروا اور افسوسناک
مظاہرہ ہے۔

(جامعہ اکتوبر ۱۹۳۳ء)

افگندہ نقاب سچائی ہے، اس کے اعمال سے بڑھ کر کوئی عمل روشن نہیں، اس کے احکام سے بڑھ کر کوئی حکم واضح نہیں، اس کی بلاغت سے بڑھ کر کوئی فصاحت نہیں اس کی فصاحت پر کسی دوسری فصاحت کو ترجیح نہیں، اس سے بڑھ کر فائدہ رساں کوئی اور کتاب نہیں، اس سے بڑھ کر لذیذ کوئی اور قول نہیں،

رسولؐ اللہ کا قول ہے۔" قرآن میں تم سے پہلوں کی واقعات ہیں تمہارے بعد آنے والوں کی خبریں ہیں، تمہارے لئے، ضروری احکام وہدایات ہیں،!" ایک اور موقعہ پر آنحضرت نے فرمایا،" سب سے زیادہ ویران گھر وہ ہے جو قرآن سے خالی ہو!"

شعبی کا قول ہے،"جو قرآن پڑھتا ہے، وہ اپنے رب عزوجل سے باتیں کرتا ہے۔"

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں" اے بیٹے، قرآن کی تلاوت سے غافل نہ ہو، صبح وشام اس کی تلاوت کیا کرو، کیونکہ قرآن مردہ قلب میں زندگی پیدا کرتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، بدکاریوں سے دور رکھتا

حضرت سفیان ثوری، رحمۃ اللہ علیہ رمضان کے شروع ہوتے ہی فرائض وسنن کے علاوہ دوسری عبادتیں یکسر ترک کر دیتے تھے اور صرف قرآن کی تلاوت میں لگ جاتے تھے۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا تو اہل علم کی مجلسوں میں اٹھنا بیٹھنا ترک کر دیتے، مذاکرہ حدیث بھی ملتوی کر دیتے اور سارا وقت قرآن کی تلاوت میں صرف کیا کرتے تھے،

ابو حنیفہ اور شعبی رحمہما اللہ تعالیٰ رمضان کے مہینہ میں ساٹھ ختم کیا کرتے تھے، حضرت علیؓ کا قول ہے، "جس نے قرآن پڑھا، پھر مر گیا، اور جہنم کا مستحق قرار پایا، اس نے قرآن پڑھنے کے بجائے گویا آیات اللہ سے ٹھٹھا کیا، امام شعبی کا قول ہے کہ زبان، کان اور دل کی منادی ہے قرآن اس طرح پڑھو کہ کان سن لے، اور دل سمجھ لے،

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ جس نے کھڑے ہو کر نماز میں قرآن پڑھا اسے ہر حرف کے بدلہ میں سو نیکیاں ملیں گی، جس نے بیٹھ کر نماز میں قرآن پڑھا، اسے ہر حرف کے بدلے میں پچاس نیکیاں ملیں گی، جس نے نماز کے علاوہ بحالت وضو قرآن کی قرأت کی، اسے ہر حرف کے بدلہ میں پچیس نیکیاں ملیں گی، جس نے بغیر وضو کے تلاوت کی اسے دس نیکیاں ہر حرف کے بدلہ میں ملیں گی،

آنحضرتؐ کا فرمان ہے "قرآن پڑھو، اور روؤ، اگر رونا نہ آئے تو روہانسی صورت بنالو" !صالح المزنی سے روایت ہے کہ میں نے ایک بار، عالم خواب میں، رسول اللہ کے سامنے قرآن پڑھا، آپ نے

فرمایا، اے صالح اس قرأت کے ساتھ رونا کہاں ہے؟"

حضرت عثمان، جمعہ کی رات کو، سورۂ بقر سے مائدہ تک، سنیچر کی رات کو سورۂ انعام سے ہود تک، اتوار کی رات کو، سورۂ یوسف سے مریم تک دوشنبہ کی رات کو، سورۂ مریم سے طٰسم موسیٰ و فرعون تک، منگل کی رات کو سورۂ عنکبوت سے ص تک، بدھ کی رات کو سورۂ رحمٰن تک اور جمعرات کی رات کو، باقی قرآن پڑھ ڈالتے تھے،

حضرت علی سے مروی ہے کہ ایسی عبادت سے کوئی فائدہ نہیں جو تفقہ سے خالی ہو، ایسی تلاوت رائیگاں ہے جو تدبر سے محروم ہو

ایک رات حضرت عائشہؓ دیر سے حاضر خدمت ہوئیں، حضورؐ نے پوچھا، یہ دیر کیوں ہوئی؟ فرمایا، ایک شخص قرآن کی تلاوت کر رہا تھا، اس سے اچھی قرأت میں نے کسی کی نہیں سنی، حضور کھڑے ہوئے اور بڑی دیر تک، اس آدمی کی قرأت خود بھی سنتے رہے، پھر فرمایا " یہ سالم ابو حذیفہ کا غلام ہے، خدا کا شکر ہے کہ میری امت میں ایسے لوگ ہیں،"!

ابی عمر کہا کرتے تھے، کہ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ سفر میں ہو یا حضر میں، دن ہو یا رات قرآن کریم کی تلاوت کیا کرے"

السید الجلیل صاحب الکرامات والمعارف، والمواہب واللط

ابراہیم الخواص رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ دل کے روگ کا علاج پانچ چیزیں ہیں،

(۱) قرآن کی تلاوت تدبر کے ساتھ،

(۲) پیٹ کا خالی رہنا،

(۳) رات کا جاگنا بہ سلسلۂ عبادت،

(۴) سحر کے وقت بارگاہ الٰہی میں تضرع

(۵) نیکو کاروں کی صحبت،

قرآن کی تلاوت آواز سے کی جائے، یا چپکے چپکے دونوں کے بارے میں آثار موجود ہیں، اور فضیلت کا بیان دونوں طرف کے سلسلہ میں موجود ہے، علماء کا ارشاد ہے کہ اگر قاری، ریا کاری کے خوف سے چپکے چپکے پڑھتا ہے، تو اس کے لئے افضل یہی ہے، اور اگر ریا کاری کا اندیشہ نہیں ہے تو قرآن کا باآواز پڑھنا افضل ہے بشرطیکہ اس آواز سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہونچے، تلاوت کی فضیلت کے بارے میں احادیث کثیرہ موجود ہیں، جو ان کا استقصا کرنا چاہے اسے چاہیئے کہ شیخ مشائخ الاسلام محی الدین نووی قدس اللہ روحہ کی "کتاب التبیان فی آداب حملۃ القرآن" کا مطالعہ کرے،

ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول

اللہ نے فرمایا، جو شخص ہر رات کو سورۂ واقعہ کی تلاوت کرے گا، وہ
فقر و فاقہ سے دور رہے گا، جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول
اللہ رات کو اس وقت تک آرام نہیں فرماتے تھے، جب تک الم
تنزیل الکتاب، اور تبارک الملک، کی تلاوت نہ فرمالیں، اور حضرت
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا، جو
رات کو اذا زلزلت پڑھ لے اس نے گویا، نصف قرآن پڑھ لیا، اور
اور جو قل یا ایہا الکفرون پڑھ لے، اس نے گویا چوتھائی قرآن پڑھ
لیا، اور جو قل ہو اللہ پڑھ لے اس نے گویا تہائی قرآن پڑھ لیا،

وضع حدیث

نومبر ۱۹۳۰ء کے جامعہ میں ایک مقالہ عنوان بالا سے شائع ہوا ہے مضمون کے مطالعہ کے بعد ہر شخص یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے،

"اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلا شبہ صحیح ہیں، اس طرح مخلوط ہو گئیں، کہ بڑے بڑے نقادوں کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ" اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں" جامعہ، صفحہ ۴۳۴، (نومبر ۱۹۳۰ء)

گویا" سچائی کے وہ قطرے" اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں" اس طرح مدغم ہوئے کہ اس پردۂ عالم پر متحقق طور پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے حدیث صحیح کے نام سے باور کیا جا سکے، جس کے متعلق یہ سمجھا جا سکے کہ وہ قول رسول ہے، جس کے متعلق یہ اعتماد کیا جا سکے کہ وہ لوث کذب و دروغ سے پاک ہے لیکن کیا واقعات بھی اس دعوے پر شاہد ہیں؟ کیا حقیقتہً یہ دعویٰ ایسا ہے کہ جس پر ایمان لایا جا سکتا ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہب کے نام پر، جذبات کے نام پر، قرآن وحدیث کے نام پر، آپ کے احساسات سے اپیل کروں اور یہ چاہوں

تیمم کس کس طرح کیا جا سکتا ہے ؟ یہ اور اس قبیل کے بیسیوں جزئی سوالات ہیں جن کا جواب قرآن مجید میں نہیں مل سکتا، لا محالہ ہمیں اس "عمل" کو ڈھونڈھنا پڑے گا، جسے خود قرآن نے "اسوۂ حسنہ" کے نام سے یاد کیا ہے، اور اُس "قول" کی جستجو کرنی پڑے گی جسے قرآن ہی نے "ان ھو الا وحی یوحیٰ" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ جب ہم میں کسی بات میں اختلاف ہو، راہ حق مفقود ہو رہی ہو تو لا محالہ "ردوہ الی اللّٰہ و رسولہ" پر عمل کرنا پڑیگا اب عہد حاضر میں خدا براہ راست ہم پر وحی نازل نہیں کر سکتا کہ وہ ہمارے "تنازع" کا خاتمہ کرے، اگر قرآن میں وہ چیز ہمیں نہیں ملتی، تو ہم سوا اس کے اور کیا کر سکتے ہیں کہ رسول کی طرف رجوع کریں، رسول بھی مرئی اور مادی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں تو چارۂ کار سوا اس کے اور کیا رہجاتا ہے کہ رسول کے اقوال، اس کے اعمال وافعال، اور اس کے بنائے ہوئے راستوں، اس کے کئے ہوئے فیصلوں اور اس کے فرمائے ہوئے ارشادات کو مشعل راہ بنائیں اور اسی کی روشنی میں تلاش و تجسس اور غور و تفحص سے وہ راہ حق ڈھونڈیں جس کے ہم متلاشی ہیں،

کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ

"وضاعین و کذابین کی ایک بے شمار فوج پیدا ہو گئی،

کہ آپ مذکورہ بالا دعویٰ کی صداقت اس لئے تسلیم نہ کریں کہ اس سے حدیث
پر زد آتی ہے، حدیثیں مشتبہ ہو جاتی ہیں اور اقوال رسول کی جو نعمت عظمیٰ
ہمارے پاس تھی وہ چھینی جاتی ہے، اگر وہ دعویٰ دلائل کی بنیاد پر استوار
ہو سکے تو یقیناً ہمیں اس "دفتر بے معنی" کو "غرق مئے ناب" ہی نہیں بلکہ اس "جھوٹ
اور کذب" کے سیلاب میں بلا تامل غرق کر دینا چاہیئے، آج کی صحبت میں اسی
موضوع پر گفتگو مقصود ہے کہ آیا وہ "جھوٹ اور کذب کا سیلاب" ہے
یا حقائق و معارف کا بحر بیکراں؟

یہ حقیقت ہے کہ عہد رسالت میں احادیث کے ضبط و کتابت کی
طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی، اس لئے کہ احتمال تھا کہ قرآن و حدیث میں
میں مخلوط نہ ہو جائیں، اس کے علاوہ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں
خود "حدیث ناطق" موجود تھی، یعنی سرکار رسالت کا وجود باجود، جب تک
رسالت مآب رونق بخش کارگاہ حیات رہے اس وقت تک حدیثیں منضبط
نہیں ہو سکیں اس لئے کہ رسول اللہ کی حیات طیبہ جس وقت تک باقی رہی
اس وقت تک استفسار و استصواب، سوال و جواب اور پوچھ گچھ کا
جاری رہا، نماز کے متعلق شبہ ہوا کہ "خیط ابیض" اور "خیط اسود"
کیا مراد ہے؟ سرکارؐ نے اس کی تشریح فرما دی، امامت کون کرے
کا حق ہے، کے وقت کی نماز فرض ہوتی ہے، سنتوں کی حیثیت کیا

جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی، بلکہ ان میں سے
بعض کا پیشہ یہی تھا، صفحہ ۴۳۴"

اس صورت میں بھلا حدیث پر اعتماد کی کیا صورت ہے؟ اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس مشکوک و مشتبہ صورت مسئلہ میں کمزور پہلو پر عمل کیا جائے؟

جواب نہایت غیر مشتبہ ہے، آج ہم بے تامل کذابین وضاعین حدیث کی ایک فہرست پیش کر دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں مسئلہ پر جتنی حدیثیں وارد ہوتی ہیں وہ غلط ہیں، موضوع ہیں، باطل ہیں،

لیکن ہمارے قول کی بنیاد کیا ہے، ان "وضاعین وکذابین" کے ہم شاہد عینی نہیں، ہم نے نہ انہیں جھوٹ بولتے سنا، نہ وضع حدیث کرتے دیکھا، ہمارا مبلغ علم یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے، نقادان فن نے، اور حدیث و اشخاص کے پرکھنے والوں نے متفقہ طور سے ان کے ضعف، کذب اور دروغ گوئی کا پردہ فاش کیا ہے، اس پر اعتماد کریں، اور ان لوگوں کو کاذب، وضاع اور نہ معلوم کیا کیا سمجھیں لیس معاصرین کے قول کی روشنی میں ہمعصرین و نقادان اسماء الرجال کی رائے کے مطابق ہم ایک جماعت کو غیر ثقہ قرار دے سکتے ہیں، دروغ گو

باور کر سکتے ہیں تو ایک دوسری جماعت کے متعلق اس کی توثیق قبول نہیں کر سکتے؟ اور پھر جب یہ حقیقت بھی ہم پر روشن ہے کہ ان ائمہ جرح و تعدیل نے بلا تذبذب بلا تامل، بلا پس و پیش، جس جماعت کی توثیق کی اسے سچا جانا، تنقیدی نظر ڈالنے کے باوجود اسے کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا، اس کی ساری زندگی ان کے سامنے گزری ہے، انہوں نے کبھی بھی اس جماعت کے کسی فرد کو کسی آلودگی میں ملوث نہیں پایا، نازک سے نازک موقع پر ان کا اعلان صداقت زلزلہ انداز قصر طاغوت ثابت ہوا، سخت سے سخت آزمائش پر ان کی زبان سے اگر نکلا تو کلمہ حق، جرح کرتے وقت انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ امام وقت ہے، علامہ دہر ہے عوام کے نزدیک مقبول و محبوب ہے، ان کا دوست ہے رشتہ دار ہے عزیز ہے، انہوں نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بڑی سے بڑی شخصیتوں پر جرح کی، تنقید کی، ان کی زندگی کے ہر پہلو کو پبلک کے سامنے پیش کیا، اور بتلا دیا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، پھر وہ کون سے اسباب وعلل ہیں جو مانع ہوتے ہیں، کہ ہم اس توثیق کے بعد انہیں ثقہ نہ مانیں، راست گو نہ مانیں، صداقت شعار نہ مانیں، ہم اگر نہ بھی ماننا چاہیں تو ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے اور مجبور کرتا ہے کہ ہم ان کی رائے پر اعتماد کریں، اور ان کے فرمودہ حق کو بالکل "حق" مانیں، یہ ضرور ہے کہ

التاريخ وقال حسان بن زيد لم
نستعن على الكذابين بمثل
التاريخ اقوال للشيخ كم سنه وفي
اے تاريخ ولدت فان اقر بمولده
عرفنا صدقه من كذبه وقال
الحسن بن الربيع قدمت بغداد
فلما خرجت شيعني اصحاب الحديث
فلما برزت الى الخارج قالوا توقف
فان احمد بن حنبل يجئ فقعدت
واخرجت الواحي فلما جاء

شروع کردی تو ہم نے تاریخ سے
کام لینا شروع کیا، اور حسان زید
کہتے ہیں کہ کذابین کے لئے تاریخ
سے بڑھ کر ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے
میں شیخ سے اس کا سن دریافت کرتا ہوں
اس کی تاریخ ولادت پوچھتا ہوں
اگر وہ سچ سچ کہدیتا ہے تو ہم اس کا
صدق اس کے کذب سے پہچان لیتے ہیں
اور حسن بن ربیع کہتے ہیں کہ ایک بار
میں بغداد گیا جب میں چلنے لگا، تو
اصحاب حدیث نے میری متابعت
کی جب میں باہر پہنچا تو انہوں نے کہا
ذرا ٹھہر جایئے، احمد بن حنبل آرہے ہیں

قال لي في اي سنة مات عبد الله
بن المبارك فقلت سنة احدى
وثمانين فقيل لم ماتريد بهذا؟
فقال اريد الكذابين[1]

جب وہ آئے تو مجھ سے پوچھا، کہ
عبد اللہ بن مبارک کا کس سنہ
میں انتقال ہوا تھا؟ میں نے کہا
۱۸۱ھ میں، پھر ان سے دریافت کیا

[1] ابن عساکر صفحہ ۲۷

جب آثار و اخبار کی کثرت ہوئی، اور مکہ شریف و مدینہ منورہ سے باہر
قال اللہ و قال الرسول کا غلغلہ بلند ہوا تو ان میں خرقہ پوشان مکر وسالوس
بھی تھے، جو بظاہر مسلمان تھے، لیکن جن کے قلوب کفر و شرک کی تاریکی
سے ظلمت شب تاب کا منظر پیش کر رہے تھے، انہوں نے اپنے اغراض
نامسعود کے لئے اپنے مصالح سیاسی کے لئے اور اپنی کامیابی و کامرانی
کے لئے دنیا میں غلط احادیث کی نشر و اشاعت کرنا چاہی، یہودیت
اور عیسویت، اسرائیلیات، حدیث کے نام سے پیش کرنا چاہا، لیکن
وہ اپنے مقصد میں بالکل کامیاب نہیں ہو سکے، فوراً ہی ائمہ جرح
و تعدیل کی ایک جماعت پیدا ہوئی، اسماء الرجال سے بحث کرنے والا
ایک گروہ ہوا اور اس نے ان لوگوں کے عزائم باطلہ کو تار تار کر کے
رکھ دیا، اس نے ان کی پردہ دری کی، ان کے سوانح حیات قلمبند کئے
ان کے صدق و کذب کا امتحان کیا، ان کی دیانت و ثقاہت کو جانچا
ان کی صداقت اور راست گوئی کی پڑتال کی اور بالآخر انہیں بے نقاب
کر کے چھوڑا، ان کے لئے ایک مستقل تاریخ بنائی جس میں ان کے پوست کندہ
حالات ملتے ہیں، ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ

قال سفیان الثوری لما استعمل   سفیان الثوری کہتے ہیں کہ جب
الرواۃ الکذب استعملنا لھم   راویوں نے کذب کی آمیزش

كتاب العلائي اسماء وقعت له زائدة ثم فيها دله العلامة قاضي القضاة ولي الدين ابو زرعة الحافظ ابن الحافظ الى من ذكره العلائي واخرج المدلسين بالتصنيف من المتاخرين المحدث الكبير المتقن برهان الدين الحلبي سبط ابن العجمي غير متقيد بكتاب العلائي فزاد عليهم قليلاً فجميع ما في كتاب العلائي من الاسماء ثمانية وستون نفسا وزاد عليهم ابن العراقي ثلاثة عشر نفسا وزاد عليه الحلبي اثنين وثلاثين نفسا وزدت عليهما تسعة وثلاثين نفسا فجملة ما في كتابي هذا مائة واثنان وخمسون نفسا۔[1]

ہے پھران کے فرزند ارجمند علامہ قاضی القضاۃ ولی الدین ابو زرعہ نے ان چیزوں کو شامل کیا ہے، جو علائی نے ذکر کی ہیں،

متاخرین میں جن لوگوں نے مدلسین کی تخریج کی ہے ان میں جلیل القدر محدث برہان الدین الحلبی ہیں جنہوں نے علائی کی پابندی نہیں کی، علائی کی کتاب میں کل اسماء جن کی تخریج ہوتی ہے ٦٨ ہیں ابن عراقی نے اس پر ١٣ ناموں کا اور اضافہ کیا ہے حلبی نے ٣٢ نام اور ایزاد کئے ہیں، اور میں نے ان پر ٣٩ نام اور بڑھائے ہیں، پس میری کتاب میں کل ١٥٢ نفوس کا تذکرہ ہے

[1] كتاب طبقات المدلسين لابن حجر

گیا کہ آپ کا اس سوال سے کیا مطلب
تھا؟ فرمایا میں کذابین کی شناخت
اسی طرح کرتا ہوں۔

علامہ ابن حجر جو اساطین علم حدیث میں ہیں، فرماتے ہیں کہ

قد افرد اسماء المدلسين بالتصنيف
من القدماء الحسين بن علي
الكرابيسي صاحب الامام الاعظم
الشافعي، ثم النسائي، ثم الدار
قطني، ثم نظم شيخ شيوخنا
الحافظ شمس الدين الذهبي
في ذلك ارجوزة وتبعه بعض
تلامذته وهو الحافظ ابو
محمد احمد بن ابراهيم المقدسي
فزاد عليه من تصنيف العلائي
شيئا كثيرا مما فات الذهبي
ذكره ثم ذيل شيخنا حافظ العصر
ابو الفضل بن الحسين في هوامش

قدما کی تصانیف میں مدلسین کی ج
تفرید کی ہے ان میں حسین بن علی الکرا
صاحب امام شافعی ہیں پھر نسائی
دار قطنی، پھر ہمارے استاذ الاسا
علامہ ذہبی نے کچھ اضافہ کیا ہے
ان کے بعض تلامذہ نے اس باب
ان کی پیروی کی، ان میں حافظ
محمد احمد بن ابراہیم مقدس ہیں، علا
نے اپنی تصنیف میں وہ تمام چ
ایزاد کیں جو علامہ ذہبی سے ر
تھیں پھر ہمارے استاذ ابو الفض
حسین کا ذیل ہے۔ علائی کی ک
کے حاشیہ میں زیادہ اسما

یہ اتنی تحقیق آپ کو معلوم ہے کس چیز پر کی گئی ہے یہ وہ وضاعین
وکذابین نہیں جو اس "جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں شناوری کر
رہے ہوں، وہ کبھی نہیں ہیں، جن کا پیشہ حدیث کا گھڑنا ہے، وہ کبھی نہیں
ہیں جو اسرائیلیات کی اشاعت کر رہے ہوں، وہ کبھی نہیں ہیں جن کا وظیفہ
حیات کذب و دروغ کی نشر و ترقی ہو، بلکہ یہ لوگ مدلسین ہیں، یہ وہ لوگ
ہیں جو حدیث بیان کرتے ہیں، سلسلہ رواۃ بیان کرتے ہیں، لیکن اپنے شیخ
کا معروف نام نہیں ظاہر کرتے، بلکہ غیر معروف نام سے انتساب کرتے
یہ ایک قسم کی تدلیس ہوتی، یہ کیسے ممکن تھا کہ اسماء الرجال کے مبصرین
کی نگاہ دوررس سے بچ جائے ان پر بھی کتابیں تصنیف ہوئیں، ان
پر اضافہ کیا گیا، ذیل لکھے گئے، اور ڈھونڈھ ڈھونڈ کر ان لوگوں کو منصہ
شہود پر جلوہ گر کیا گیا، آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ جب مدلسین کے ساتھ
اتنا شغف کیا گیا تو "وضاعین وکذابین کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا گیا ہو
ان پر بھی دفتر کے دفتر سیاہ کئے گئے، کتابیں لکھی گئیں، تاریخیں ضبط
تحریر میں آئیں، اور بالآخر انہیں بے نقاب کر دیا گیا، علامہ ذہبی کی
میزان الاعتدال اور علامہ ابن حجر کی تہذیب التہذیب اور تقریب التہذیب
اس پر شاہد عادل ہیں، امام بخاری، امام نسائی، وغیرہ نے مستقل
تصنیفیں لکھیں جن میں، التاریخ الصغیر، کتاب الضعفا والمتروکین

للبخاری اور کتاب الضعفا والمتروکین لنسائی زیادہ قابل ذکر ہیں،

ان کتابوں میں اور اسماء الرجال کی دوسری کتابوں میں رواۃ پر مفصل بحث ملے گی، ان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی زندگی کا ہر گوشہ بے نقاب کیا گیا ہے بخوف طوالت ان کتابوں سے میں کوئی تفصیلی اقتباس نہیں پیش کرنا چاہتا ہوں، اگر ضرورت ہوئی تو کسی آئندہ موقع پر تفصیل سے یہ عرض کیا جا سکتا ہے، کہ ان دفاتر میں کیا کیا ہے اور ہم حدیث کے حسن و قبح کی جانچ پرتال سے کس قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں، نیز یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ رواۃ حدیث نے جمع حدیث میں کس قدر دقتیں اور مصیبتیں اٹھائی ہیں؟ طاہر جزائری پر مولانا اسلم نے کافی اعتماد فرمایا ہے، وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

قد کان للصحابة رضی اللہ عنہم عنایة شدیدة فی معرفة الحدیث وفی نقله لمن لم یبلغه فقد ذکر البخاری فی صحیحه فی کتاب العلم ان جابر بن عبد اللہ رحل مسیرة شهر الی عبد اللہ بن انیس فی حدیث واحد۔[1]

صحابہ رضی اللہ عنہم معرفت حدیث میں بہت توجہ فرماتے تھے، اسی طرح نقل و ضبط میں بھی خصوصاً اس حدیث کے بارے میں جو کسی کو اب تک نہ پہنچی ہو جیسا کہ امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں کتاب العلم میں ذکر کیا ہے جابر بن عبد اللہ عبد اللہ بن انیس کے پاس ؟ ایک مہینہ

[1] توجیہ النظر صفحہ ١٠

يشغلهم العمل فی اموالهم وان ابا هريرة كان يلزم رسول الله بشبع بطنه ويحضر ما لا يحضرون ويحفظ ما لا يحفظون۔[1]

کی دیکھ بھال میں سرگرداں رہتے تھے لیکن ابو ہریرہ رسول اللہ کا دامن پکڑے ہوئے تھا کبھی آپ سے جدا نہیں ہوتا تھا، وہ اس وقت بھی حاضر رہتا تھا، جس وقت لوگ غیر حاضر ہوتے تھے، وہ اسے بھی یاد رکھتا تھا جسے لوگ نہیں یاد رکھتے تھے،

حضرت ابو ہریرہ نے اپنی صفائی میں خود یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں، اس جگہ یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے، کہ بعض صحابہ جو قلت روایت کے حامی تھے، وہ ڈرتے تھے کہ

اذ الاكثار مظنة للخطاء فی الحديث عظيم الخطر۔[2]

کہیں کثرت روایت سے غلطی نہ سرزد ہو، اور حدیث میں غلطی ایک بہت بڑا خطرہ ہے،

برعکس اس کے حضرت ابو ہریرہ قرآن شریف کی اس وعید سے ڈرتے تھے اور چاہتے تھے کہ جو کچھ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے وہ میں بیان کر دوں تاکہ میں ان لوگوں میں نہ شمار کیا جاؤں، جو حق وھدایت کو

[1] توجیہ النظر صفحہ ۱۱ [2] توجیہ النظر

کی مسافت طے کرکے صرف ایک
کے لئے گئے۔

ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین حدیث کے بار
میں بہت سخت تھے، وہ خود بھی روایت بہت کم کرتے تھے، اور دو
کو بھی کم کرنے دیتے تھے، اور حضرت ابوہریرہ پر بھی یہی اعتراض کیا جا
ہے کہ وہ کثیر الروایۃ تھے، چنانچہ حضرت عمر نے انہیں کثرت روایت
روکا بھی ہے، اس کی صفائی خود حضرت ابوہریرہ نے بایں الفاظ
ہے کہ:۔

ان الناس یقولون اکثر ابوھریرۃ
ولولا ایتان فی کتاب اللہ ما
حدثت حدیثا ثم یتلوا ان
الذین یکتمون ما انزلنا من
البینات والھدیٰ والیٰ قولہ
الرحیم) ان اخواننا من
المھاجرین کان یشغلھم
الصفق فی الاسواق و ان
اخواننا من الانصار کان

لوگ کہتے ہیں ابوہریرہ کثیر الرو
ہے اگر دو آیتیں میرے پیش نظ
ہوتیں تو میں کبھی حدیث بیان ک
(ان الذین یکتمون ما انزلنا
البینات والھدیٰ الی قولہ
ہمارے مہاجرین بھائی تجارت
مشغول رہتے تھے، ہمارے بھا
بھائی تجارت میں مشغول رہتے
ہمارے انصار بھائی اپنے ما

س کی صداقت ثابت ہوگئی ہو، انہوں نے کبھی انکار نہیں فرمایا، بلکہ اسے
تسلیم کیا، اور نافذ کیا، چنانچہ اسی تذکرۃ الحفاظ میں جس سے مولانا نے
واقعہ نقل فرمایا ہے، غالباً اسی صفحہ پر اور اس نقل شدہ واقعہ کے
کرے پہلے ایک دوسرا واقعہ بھی مذکور ہے جو بہر حال ہمارے لئے
بل غور ہے کہ

کان اول من احتاط فی قبول	وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے حدیث
الاخبار فروی ابن شہاب	کے قبول کرنے میں سب سے پہلے
عن قبیصۃ بن ذویب ان	احتیاط برتی، ابن شہاب قبیصہ بن
الجدۃ جاءت الی ابی بکر	ذویب سے روایت کرتے ہیں کہ ایک
تلتمس ان تورث فقال ما	عورت آئی جو "جدہ" کا حق طلب
اجد لک فی کتاب اللہ شیئاً	کرتی تھی، حضرت ابوبکر نے فرمایا
وما علمت ان رسول اللہ	کہ قرآن مجید میں تو میں تیرے لئے
ذکر لک شیئا ثم سال الناس	کچھ نہیں پاتا، اور نہ یہ جانتا ہوں کہ
فقام المغیرۃ فقال سمعت رسول	رسول اللہ نے اس بارے میں کچھ فرمایا
اللہ یعطیھا السدس فقال لہ	ہے، پھر آپ نے لوگوں سے دریافت
ھل معک احد؟ وشہد محمد بن	کیا تو اٹھے اور کہا کہ میں نے رسول اللہ
مسلمۃ بمثل ذالک فانفذ	سے سنا ہے وہ سدس عطا فرماتے

چھپاتے ہیں، لہذا جہاں تک ان کا حافظہ ان کی اعانت کرتا تھا وہ حد
بیان فرماتے تھے، اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتے تھے، ا
یہ بات بالکل "ظاہر اور باہر" ہے کہ حضرت ابوہریرہ اور دوسرے جلیل
القدر صحابہ کا مسلک میں اختلاف، اختلاف فی الاجتہاد کی حیثیت
تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ یہی اختلاف مسلک امت کے لئے باعث ر
ثابت ہوا، خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ اگر اس میں اتنا
آغاز کارہی میں نہ کرتے، تو یقیناً تلبیس و تدلیس کا دروازہ کھ
جاتا، لیکن ابتداہی میں ان کی اس احتیاط پسندی نے غور و
کے دروازے کھول دیئے اور اب جو قدم اٹھتا تھا وہ سوچ سمجھ

مولانا اسلم صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ

"حضرت ابوبکر نے ایک مجموعہ احادیث بھی لکھا تھا جس میں
تقریباً پانسو حدیثیں تھیں، مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہ
سے لے کر آگ میں جلا دیا کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ ممکن ہے
کہ میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھ دی ہو
اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو۔" (جامعہ صفحہ ۳۲)

خطوط کشیدہ الفاظ اس پر دال ہیں کہ یہ حضرت ابوبکر کا زیا
زیادہ جذبۂ احتیاط پسندی تھا، ورنہ حدیث کو قبول کرنے میں

تھا ابو بکر رضی اللہ عنہ[1]۔ تھے حضرت ابو بکر نے پوچھا کو ا
شاہد؟ محمد بن مسلمہ نے شہادت
دی تو آپ نے اسے نافذ فرمایا
اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر اگرچہ محتاط تھے، لیکن
بایںہمہ اگر کوئی سچی حدیث انہیں مل گئی ہے تو انہوں نے اسے قبول ک
ہے، جب انہوں نے قبول کر لیا تو امت کیوں نہ قبول کرے گی؟ ر
صحت کا معیار، سو ارباب نظر نے ایسے ایسے اصول وضع کر دیئے کہ
احادیث کی صداقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہیئے، اس ح
ایک "سخن گسترانہ" بات اور عرض کر دوں کہ مولانا نے حضرت اب
کا جو واقعہ نقل فرمایا ہے، کہ انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ ج
اس کو خود صاحب تذکرۃ الحفاظ نے مراسیل میں شمار کیا ہے، او
کا پایۂ استناد جتنا بلند ہے مولانا مجھ سے زیادہ واقف ہیں،
حضرت عمر کا تشدد اس بارہ میں بہت زیادہ واضح ہے
کثرت روایت پر وہ حضرت ابو ہریرہ کو پیٹنے کی دھمکی بھی دے
ہیں لیکن اس کے باوجود اگر ان کے معیار کے مطابق انہیں کوئی
حدیث مل گئی ہے تو انہوں نے بھی اسے تسلیم فرما لیا ہے، ا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبی ذکر ابی بکر

حضرت عمر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

وهو الذي سن للمحدثين التثبت في النقل وركان متوقف في خبر الواحد اذا اوتاب قال الحريري عن ابي نضرة عن ابي سعيد ان ابا موسىٰ سلم على عمر من وراء الباب ثلاث مرات فلم يوذن له فرجع فارسل عمر في اثره فقال لم رجعت قال سمعت رسول الله اذا سلم احدكم ثلاثا فلم يجب فليرجع قال لتاتيني على ذالك ببينة او لافعلن بك فجاءنا ابو موسىٰ منتقعا لونه ونحن جلوس فقلنا ما شانك فاجرنا فقال هل سمع احد منكم؟ فقلنا نعم كلنا سمعه فارسلوا معه

حضرت عمر وہ بزرگ ہیں جنہوں نے محدثین کے لئے تثبت فی النقل لازم کر دیا اگر آپ کو شک ہوتا تو خبر واحد میں کبھی کبھی آپ تامل فرماتے، حریری ابو نضرہ سے اور وہ ابو سعید سے روایت کرتے ہیں کہ ابو موسیٰ نے دروازے کے پیچھے سے حضرت عمر کو تین بار سلام کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو وہ واپس آئے حضرت عمر نے انہیں بلوایا اور کہا کہ تم واپس کیوں گئے، انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ تم میں سے جب کوئی تین بار سلام کرے اور جواب نہ ملے تو اسے واپس ہو جانا چاہئے، حضرت عمر نے کہا کہ تمہیں اس قول پر دلیل لانا پڑے گی، ورنہ میں بری طرح پیش

مما انفرد به واحد، وفی ذالك
حص علی تکثیر طرق الحدیث
لکی نفی عن درجة الظن الی
درجة العلم او لواحد یجوز
علیه النسیان، والوهم ولا
یکاد نحو ذلك علی ثقتین لم
یخالفهما احد وقد کان عمر
من دجله یخطی الصاحب علی
رسول الله یامرهم ان یقلو
الروایة عن بنیم ولئلا
یتشاغل الناس بالاحادیث

ثقہ آدمی روایت کریں تو وہ بہت
زیادہ اقوی اور ارجح ہوجایا کرتی
ہے بہ نسبت اس کے کہ منفرداً کسی
شخص سے روایت کی گئی ہو اس سے
یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر
طرق حدیث کی کثرت کی طرف لوگوں
کو مائل کرنا چاہتے تھے، تاکہ حدیث
درجہ ظن سے درجہ علم تک پہنچ جائے
کیونکہ ایک آدمی کے لئے یہ ممکن ہے
کہ اس پر نسیان و وہم کا غلبہ ہو
اور جب دو ثقہ آدمی روایت کریں
تو یہ اندیشہ کم ہوجاتا ہے۔ حضرت
عمر اس سے ڈرتے رہتے تھے کہ بیان
حدیث میں کوئی خطا سرزد ہوجائے
انہوں نے حکم دے رکھا تھا کہ روایۃ
کم کی جائے تاکہ لوگ حفظ حدیث
سے غافل نہ ہوجائیں۔

لہ تذکرۃ الحفاظ۔

وجلا منهم حتی اتی عمر فاخبره[۱] | آؤں گا، تو ابو موسیٰ ہمارے پاس آئے چہرہ کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا، ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے ہم نے پوچھا کیا حال ہے؟ انہوں نے اپنے واقعہ سے مطلع کیا اور دریافت کیا کہ تم میں سے کسی نے اسے سنا ہے ہم نے کہا، ہاں ہم میں سے ہر شخص نے سنا ہے، تو ان کے ساتھ ایک آدمی کر دیا، اس نے حضرت عمر کو اس کی خبر دی،

علامہ ذہبی اس واقعہ پر ذیل کی رائے ظاہر فرماتے ہیں جو بڑی حد تک قابل قبول ہے کہ

احب عمران یتاکد عن خبر ابی موسیٰ بقول صاحب اخر ففی هذا دلیل علی ان الخبر اذا رواه ثقتان کان اقوی وارجح | حضرت یہ چاہتے تھے کہ ابو موسیٰ کی حدیث کسی دوسرے آدمی سے اور زیادہ موکد ہو جائے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کو جب

۱؎ تذکرۃ الحفاظ

علامہ ذہبی نے جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ بہت صحیح ہے اور یہی وہ جذبۂ احتیاط پسندی تھا کہ جس سے حضرت عمر قلت روایت اور کثرت روایت کو پسند فرماتے تھے، اور جب ایسا ہوتا تھا، تو بلا تامل وہ حدیث کو تسلیم کر لیتے تھے جیسا کہ آگے آتا ہے کہ

روی هشام من ابیه المغیره بن شعبة ان عمر استشارهم فی املاص المرأة یعنی السقط فقال له المغیرة قضی فیه رسول الله بغرة فقال له عمر ان کنت صادقاً فات احداً لعلیم ذالك قال فشهد محمد بن مسلم ان رسول الله قضی به[1]

ہشام اپنے والد مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے سقط کے بارے میں مشورہ کیا، تو مغیرہ نے کہا کہ رسول اللہ نے ایک لونڈی کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے تو حضرت عمر نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دوسرا آدمی لاؤ جو اس سے واقف ہو، محمد بن مسلم نے شہادت دی کہ رسول اللہ نے ایسا فیصلہ کیا

آگے چل کر دوسرا واقعہ جو پیش کیا جاتا ہے اس میں حضرت عمر نے اپنا مسلک اور واضح کر دیا ہے کہ جب حضرت عمر نے مسجد کی توسیع کے لئے حضرت عباس سے ان کی زمین چاہی تو انہوں نے انکار کیا

[1] تذکرۃ الحفاظ۔

حدیث بیان کی کہ تم زیادتی نہیں کر سکتے، تو حضرت عمر نے کہا کہ اس پر دلیل لاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا، پس انہوں نے ایک جماعت انصار سے اس کا تذکرہ کیا۔ انصار نے حضرت عمر سے تصدیق کی کہ ہاں یہ حدیث صحیح ہے پھر حضرت عمر نے فرمایا کہ

انی لم اتهمك ولكني اجبت ان اتثبت[1]	میں تمہیں غیر معتبر نہیں سمجھتا لیکن یہ چاہتا تھا کہ حدیث ثابت ہو جائے۔

اسی طرح حضرت علیؓ بھی پورے اطمینان کے بعد حدیث قبول فرماتے تھے، یہاں تک کہ وہ تو

انه يستحلف من يحدثه بالحديث[2]	جو شخص حدیث بیان کرتا تھا، اس سے قسم لے لیتے تھے،

طاہر جزائری نے حضرت ابوبکر کے اس واقعہ پر جب آپ نے سدس دلایا تھا، بہت عمدہ بات لکھی ہے کہ

الا تراه لما نزل به امر الجدة	کیا تم اسے نہیں دیکھتے کہ اس عورت
ولم يجده في الكتاب كيف سأل	والے واقعہ میں جب حضرت ابوبکر
عنه في السنن فلما اخبره	نے قرآن میں اس کے متعلق کچھ نہیں
الثقة لم يكتف حتى استظهر	پایا، تو اس بارے میں سنن وحدیث

[1] تذکرۃ الحفاظ ۲، [2] تذکرۃ الحفاظ

بثقة اخر ولم يقل حسبنا كتاب الله كما تقوله الخوارج
کی طرف توجہ کی، اور جب ثقہ نے حدیث بیان کی تو آپ نے صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ ایک دوسرے ثقہ سے اسے موکد کر لیا اور یہ نہیں کہا کہ ہمارے لئے تو "کتاب اللہ" کافی ہے۔ جیسا کہ خوارج کہا کرتے تھے

اور حضرت ابوبکر یہ فرما کیسے سکتے تھے جب کہ ان کے سامنے یہ بھی تھا کہ

فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون (قرآن مجید)
اگر تم کوئی چیز نہ جانتے ہو تو "اہل ذکر" سے دریافت کرو،

اور اہل ذکر ان سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا، جنہوں نے ایک ایک حدیث کے لئے دور دراز کی مسافتیں طے کیں، طرح طرح کے مصائب برداشت کئے، آفات و حوادث کا مقابلہ کیا، فاقے کئے لتے باندھے راستے کی الٹینوں میں پڑھا، مسجد کے چراغ میں پڑھا غرض اس نام سے جو مصیبت آئی اسے انگیز کیا، صرف اس لئے کہ اقوال رسول مدون ہو جائیں، ارشاد رسول منضبط ہو جائیں اور

ے توجیہ النظر صفحہ ۱۲۔

سرکار رسالت کا کوئی فعل اور قول پردۂ خفا میں رہے،

اور مولانا نے جو فرمایا کہ

"صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم دیا تھا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو، اور جو کچھ کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اس کو مٹا ڈالو" جامعہ صفحہ ۲۲۶

تو جس کتاب سے مولانا نے یہ حدیث لی ہے اسی کتاب میں یہ حدیث بھی ملتی ہے کہ

عن ابن جریج عن عطا عن عبد اللہ بن عمرو قال قلت یا رسول اللہ اقید العلم؟ قال نعم قال وما تقییدہ قال کتابتہ،	ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے پوچھا کہ کیا علم قید کیا جا سکتا ہے؟ فرمایا، ہاں، میں نے پوچھا اس کی تقید کیا ہے، فرمایا، کتابت،

و	اور
عن حماد بن سلمۃ عن محمد بن اسحٰق عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال قلت یا رسول اللہ اکتب ما اسمع	حماد بن سلمہ محمد بن اسحاق سے وہ عمر بن شعیب سے وہ اپنے والد سے وہ اپنے والد سے دریافت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے پوچھا کہ

منك ؟ قال نعم ، قلت فی الرضا او الغضب قال نعم فانی لا اقول فی ذالك كله الا بالحق ،	میں وہ سب کچھ لکھ لیا کروں ، جو آپ سے سنوں ، فرمایا ، ہاں ! انہوں نے کہا کہ آپ خوشی سے فرما رہے ہیں یا غصہ سے ؟ فرمایا سوا سچ کے میں اور کچھ نہیں کہتا ،

اور سب سے بڑھ کر بخاری کی یہ حدیث کہ

عن ابی ھریرۃ انہ قال ما من احد من اصحاب النبی اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمر فانہ کان یکتب ولا اکتب ۔	ابوہریرہ کہتے ہیں کہ اصحاب رسول میں باعتبار علم حدیث کے کوئی مجھ سے زیادہ نہیں ہے ، سوا ابن عمر کے اس لئے کہ وہ لکھ لیتے تھے ، جو سنتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا ،

اگر یہ حدیث کتابت حدیث کی مخالفت میں ہو تو ایک سے زائد اس کی تائید میں ہیں ، یہ تناقض اور تباین کیونکر رفع ہوں ، اور ان میں سے کسے سچ سمجھا جائے ، اور کسے ناقابل عمل ، اس کا جواب بجائے اس کے کہ میں اپنی طرف سے کچھ دوں مناسب ہو گا کہ اسی کتاب سے دوں ، جس کی بعض باتوں سے " وضع حدیث " کے نتائج اخذ کئے گئے ہیں ، کہ

قال ابو محمد ونحن نقول ان فی هذین المعنیین احدهما ان یکون من منسوخ السنة بالسنة کانه نهی فی اول الامر ان یکتب قوله ثم رای بعد لما علم ان السنن تکثر وتفوت الحفظ ان تکتب وتقید والمعنی الاخر ان یکون خص بهذا عبد الله بن عمرو لانه کان قارئا لکتب المتقدمة ویکتب بالسوبانیة والعربیة وکان غیره من الصحابة امیین لا یکتب منهم الا الواحد واذا کتب لم یتقن ولم یصب التهجی فلما خشی علیهم الغلط فیما یکتبون نهاهم ولما امن علی عبد الله

ابو محمد کا اور خود ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اس باب میں جمع قول کی اور رفع تناقض و تخالف کی دو صورتیں ہیں پہلی تو یہ کہ سنت سنت سے منسوخ ہو گویا یوں ہوا کہ پہلی بار رسول اللہ نے اس سے منع فرمایا کہ آپ کے اقوال ضبط تحریر میں آئیں، اس کے بعد جب آپنے ملاحظہ فرمایا، کہ سنن کی کثرت ہو رہی ہے، ممکن ہے یہ چیزیں حافظہ سے نکل جائیں لہذا انہیں لکھ لیا جائے اور نقل کر لیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کہ یہ حکم عبد اللہ بن عمرو کے لئے مخصوص ہوا اس لئے کہ وہ کتب قدیمہ کے عالم تھے، سریانی اور عربی لکھنا جانتے تھے، ان کے علاوہ جو صحابہ تھے، وہ باستثنا چند امی محض تھے، اس لئے

بن عمرو ذالك اذن له۔

ان کی کتاب میں یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے کچھ غلطی ہو جائے، لہذا کتابت سے منع فرمایا، لیکن جب ان پر یقین ہو گیا۔ کہ اب ایسا نہیں ہوگا تو اجازت دے دی۔

لے توجیہ النظر

اب آپ کے سامنے دونوں حدیثیں اور دونوں صورتیں آگئیں کہ اگر سرکار رسالت نے منع بھی فرمایا تو بہ مصالح اور جب وہ مصالح زائل ہو گئے تو خود ہی کتابت کی اجازت دیدی، اب اس میں نہ کوئی تناقض ہے نہ تبائن نہ تخالف، اور اس کی مزید توثیق حضرت ابو ہریرہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے، جس میں انہوں نے عبداللہ بن عمر کو اپنے سے عالم بالحدیث اس بنا پر تسلیم کیا ہے، کہ وہ حدیث لکھ لیا کرتے تھے اور یہ نہیں لکھتے تھے، اور ظاہر ہے یہ فعل کتابت رسول اللہ کی زندگی ہی میں ہوتا تھا،

لہذا جب احادیث و سنن کی کثرت ہوئی اور یہ ناممکن ہو گیا کہ انسانی حافظہ میں محفوظ رہ سکیں، تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کا زہد و ورع، حلم و دیانت، راستبازی، اور حق پسندی، ان کی ومعاودت خشیۃ فی اللہ، اور استقامت علی الحق، کا ہر فرد و بشر

ہے اور انہیں اسباب کی بنا پر دنیا انہیں ثانی "عمر بن الخطاب" کے نام سے یاد کرتی ہے) کتابت حدیث کا حکم دیا، اس کی جمع و تدوین کی کوشش کی اس کے ضبط و اشاعت کے احکام صادر فرمائے، خدا ان پر اپنی بے شمار رحمت نازل فرمائے کہ ان کی ایک بدعت حسنہ نے امت اسلامیہ کو ایسا خیر کثیر دیا کہ جب تک اس صفحہ ارض پر مسلمانوں کا وجود ہے اس وقت تک مسلمان ان کی ان مساعی حسنہ کا مشکور رہو گا، کتابت حدیث کی تائید میں میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں، لیکن قبل اس کے کہ میں اس پر کچھ گذارش کروں ایک بات پیش نظر رہنی ضروری ہے، مولٰنا نے فرمایا ہے کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن	مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ
ومن کتب عنی شیئًا فلیمحہ	نہ لکھو، اور جو کسی نے قرآن کے
(حدیث)	سوا کچھ لکھا ہو تو مٹا ڈالے،

لیکن پوری حدیث یوں ہے، جسے مسلم نے تخریج کیا ہے کہ

لا تکتبوا عنی غیر القران ومن	مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو
کتب عنی شیئا غیرہ فلیمحہ	اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو
وحدثوا عنی فلا حرج	تو مٹا ڈالے، ہاں مجھ سے حدیث
	بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں،

اور اس کے معاً بعد ارشاد ہوا کہ

ومن کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعده من النار

جس نے جان بوجھ کر میرے متعلق غلط بیانی کی اسے چاہیئے کہ وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنائے۔

اور اس کے بعد طاہر جزائری فرماتے ہیں کہ

قال کثیر من العلماء نهاهم عن کتابة الحدیث خشیة اختلاطه بالقرآن، وهذا لاینافی جواز کتابة اذا امن اللبس وبذالك یحصل الجمع بین هذا وبین قوله علیه الصلوٰة والتسلیم فی مرضه الذی توفی فیه ایتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعده۔[1]

بہت سے علماء کا یہ خیال ہے کہ کتابت حدیث سے اس لئے منع فرمایا، کہ قرآن مجید اور حدیث میں اختلاط نہ ہو جائے اور یہ ممانعت جواز کتابت کے منافی نہیں ہے جبکہ لبس واختلاط کا اندیشہ نہ رہے اور اس خیال کو مزید تقویت یوں ہوتی ہے کہ اپنے مرض الموت میں خود رسول اللہ نے کاغذ منگایا کہ میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھدوں کہ تم اس کے بعد گمراہ نہ ہوسکو،

[1] توجیہ النظر۔

طاہر جزائری کی ان تصریحات کے بعد یہ معاملہ اور زیادہ مستحکم ہو گیا ہے اور حالات و واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں، کہ للبس فی القرآن کے خوف سے منع فرمایا گیا اور جب یہ اندیشہ رفع ہو گیا، تو ظاہر ہے پھر کسی قدغن کی ضرورت نہ تھی؛

ایک جگہ مولانا نے فرمایا ہے کہ

"جملہ اصولیین اور محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے یقینی نہیں کہا ہے، بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے، انہوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں، مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول، یا ضعیف، منکر، موضوع، اور مردود، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے، ورنہ روایت کی دو ہی صورتیں ہیں، صحیح یا غلط" (جامعہ صفحہ ۲۳۶)

میں مولانا کے اس قول سے بھی اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہوں، محدثین نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں، مثلاً ضعیف، موضوع، منکر، مردود، صحیح، حسن، مقبول، وغیرہ "ان سے خود" یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ "وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے" بلکہ ان سے "صرف یہ ظاہر ہوتا ہے" کہ مثلاً محدثین حدیث متواتر کو قطعی اور یقینی

•اللہ کے غیر اللہ سے انہیں مرعوب و متاثر ہوتے آپ نے کبھی نہ دیکھا جھوٹ بولتے کبھی نہ سنا، غرض آپ کو ان پر پورا اعتماد ہے وہ آپ سے کہتے ہیں کہ "فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو تو بسم اللہ کر لیا کرو" اب آپ یقیناً بلا پس و پیش ان کی بات پر اعتماد کریں گے، اور تسلیم کریں گے، کہ انہوں نے جو کچھ کہا سچ کہا، ان لوگوں کے کہنے کے بعد اب وہی "زید" جو "نہایت کذاب، مفتری، دروغ گو، اور بد باطن شخص" ہے آپ کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ "فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا تو بسم اللہ کر لیا کرو" اب آپ اس کے بارے میں کیا ارشاد فرمائیں گے، اس کے اس قول کو جھوٹا سمجھیں گے یا سچا! لا محالہ آپ زید کو نہیں بلکہ زید کی اس بات کو سچ سمجھنا پڑے گا بس یہی متابعات کی کیفیت ہے کہ چونکہ وہ متواتر حدیث کی متابعت میں ہوتی ہیں، اس لئے انہیں صحیح سمجھا جاتا ہے،

یہ جھگڑا تو خیر رواۃ کے متعلق تھا کہ حدیث کی بعض کتابوں میں سلسلۂ رواۃ ذرا طویل ہوتا ہے، لیکن ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں اس قسم کا کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے، مثلاً موطا امام مالک اکثر و بیشتر وہ تین چار واسطوں سے رسول اللہ تک پہنچتے ہیں، مثلاً مالک، عن نافع، عن ابن عمر، عن النبیؐ امام مالک کی صداقت و دیانت میں جمہور امت کو اتفاق ہے، نافع ابن

مانتے ہیں تو ایک حدیث ہے جو اپنے شرائط کے اعتبار سے متواتر ہے لیکن چند "موضوع، منکر اور ضعیف" حدیثیں بھی ہیں جو اس حدیث متواتر کی تائید کرتی ہیں، تو ہم ان کو باصطلاح محدثین متابعات میں داخل کریں گے، یعنی کسی "موضوع، منکر اور ضعیف" حدیث سے ہم استناد نہیں کریں گے، لیکن اگر وہ کسی "صحیح، مشہور، اور متواتر" حدیث کی تائید کرتی ہوں، تو ان بچی حدیثوں کی صحت بھی پایہ یقین تک پہنچ جائے گی، چنانچہ بخاری میں جو بعض ضعیف رواۃ پائے جاتے ہیں، یا علامہ ابن جوزی نے "صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے" تو اس کا نہایت صاف واضح اور غیر مشتبہ جواب یہی ہے کہ وہ حدیثیں، یا وہ رواۃ متابعات کے تحت میں ہیں نہ کہ اصل مسئلہ پر احتجاج کے لئے اور اس طریقہ پر ان رواۃ یا احادیث پر اعتماد کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے "مثلاً زید ایک نہایت کذاب، مفتری، دروغ گو، اور بد باطن شخص ہے، وہ آپ سے کہتا ہے کہ فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو تو بسم اللہ کر لیا کرو، آپ بلا تامل کہہ سکتے ہیں، کہ تو دروغ گو ہے، ہمیں تجھ پر اعتماد نہیں لیکن عمرو، بکر، خالد، کی صداقت، دیانت، راست بازی،، زہد، تقوی، پاکبازی آپ کے نزدیک مسلم ہے، غیر مشتبہ ہے، آپ نے ان میں محامد کے سوا معائب کبھی نہ دیکھے نہ سنے، سوا

انکار حدیث

ستمبر کے جامعہ میں ایک مضمون "منکرین حدیث" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، میں اپنے محترم، پروفیسر سید عابد حسین صاحب مُدیر جامعہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے موقع مرحمت فرمایا کہ میں بھی اس موضوع پر کچھ عرض کر سکوں،

لیکن قبل اس کے کہ اصل بحث پر گفتگو کا آغاز کیا جائے، یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں مخاطب محترم مقالہ نگار نہیں ہیں، بلکہ وہ "منکرین حدیث ہیں جن کی موصوف نے ترجمانی فرمائی ہے،

منکرین حدیث کا خیال ہے کہ

"جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی ہے، اسی وقت سے اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی ہے، جو اس کی دینی حیثیت کی منکر رہی،"

سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اس غلط فہمی کی تصحیح کر دی جائے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ

لم اسمع احد انسبہ الناس	مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں، جسے
اونسب نفسہ الی علم یخالف	لوگ اہل علم کہتے ہوں یا وہ خود اپنے

عمر کے مولیٰ ہیں، ان پر بھی زبان طعن دراز نہیں ہو سکتی، خود ابن عمرؓ وہ ہیں کہ جن کے زہد اور شغف فی السنۃ کا سارا زمانہ قائل ہے، خود سرکار رسالت کے دربار سے خوشنودی مزاج کا تمغہ انہیں مل چکا ہے، ان کے بعد نبی کریم ہیں۔ اس سلسلۂ رواۃ کو محدثین کرام "سلسلۃ الذہب" کہتے ہیں، لہذا ان "سچائی کے قطروں" کو تو" اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب" سے الگ رکھنا ہی پڑے گا۔

(جامعہ۔ اگست ۳۱ء)

لھم عذابٌ مھین۔ بعض آدمی وہ ہیں، جو خریدار ہوتے ہیں، حدیث کے مشغلہ کے، تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلا علم کے اور اسکو مذاق بنالیں، یہ لوگ ہیں جن کے لئے خوار کرنے والا عذاب ہے، اس آیت میں "لہو الحدیث" کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے، مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی۔"

یہ ہے پہلی دلیل کا خلاصہ، جسے میں نے بعینہ نقل کر دیا ہے، غالباً محترم مقالہ نگار بھی اس باب میں متفق ہوں کہ اس دلیل میں منکرین حدیث نے حد درجہ تدلیس و تلبیس سے کام لیا ہے، پہلے یہ دعویٰ کرنا، کہ قرآن کے علاوہ، کسی سنت اور کسی حدیث کی پیروی کا حکم نہیں ہے، بلکہ ممانعت ہے، پھر "فبای حدیث بعدہ یومنون" اور اسی قسم کی دوسری آیات میں "حدیث" کا ترجمہ "حدیث" کرنا اتنی بڑی بد دیانتی ہے، کہ علمائے جرح و تعدیل، اور ائمہ نقد و بحث نے ایسی تلبیس مبین کے لئے کوئی لفظ نہیں وضع کیا،

عربی کا ہر ابجد خواں جانتا ہے، اور یقیناً منکرین حدیث کا ہر فرد جانتا ہے، کہ حدیث کے معنی "بات" کے ہیں، اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں، اگر فن حدیث مراد ہوتا تو اس کے ذکر کا اس جگہ موقع کیا تھا

فی ان فرض اللہ عزوجل اتباع امر رسول اللہ لحکمہ بان اللہ عزوجل لم یجعل لمن بعدہٗ الا اتباعہٗ۔[1]

تئیں اہل علم سمجھتا ہو اور اس کی مخالفت کرے گا کہ اللہ نے کہا ہے کہ اطاعت کی جائے امر رسولؐ کی اس کے حکم کے سبب کہ اللہ نے بعد صرف رسول کی اتباع بتائی۔

اس رفع غلط فہمی کے بعد، منکرین حدیث کے خیالات و دلائل اور ان کے جوابات بترتیب پیش کئے جاتے ہیں، پہلا اعتراض منکرین حدیث کا یہ ہے کہ

"سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت اور کسی حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے، فبایّ حدیث بعدہٗ یؤمنون اس قرآن کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے؟ فبای حدیث بعداللہ وآیاتہ یومنون، اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے، زیادہ تصریح اس آیت میں ہے، ومن الناس من یشتری لھوالحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم و یتخذھا ھزوا، اولٰئک

[1] کتاب الام صفحہ ۲۵۰

کیا جب حضور سرور کائنات قرآن مجید پیش فرماتے، تو لوگ یہ کہتے تھے کہ حدیث قرآن سے اولیٰ وافضل ہے، آپ قرآن کی دعوت کیوں دیتے ہیں" حدیث" کی دعوت دیجئے تو ہم قبول کریں؟

ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہاں مخاطب کفار ومشرکین ہیں کہ خدا کی ان کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود، قرآن کے اعجاز اور رسول کی غیر مشتبہ صداقت کے باوجود کفر وشرک کے معائب ونقائص معلوم کر لینے کے باوجود، اگر قرآن پر نہیں، تو آخر

فبای حدیث بعدہ یومنون ۔ وہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں گے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ اس آیت سے اتباع حدیث کی ممانعت نکلتی ہے، محترم مقالہ نگار نے یقیناً بیجا رواداری سے کام لیا کہ منکرین حدیث کی اس تلبیس کو یوں ہی درج مضمون فرما دیا، مولانا کو فٹ نوٹ میں اس دجل وفریب کا پردہ فاش کر دینا چاہیئے تھا،

"لہو الحدیث" والی آیت کے ترجمہ میں بھی منکرین حدیث نے اسی طرح اپنے" فہم قرآن" کا نہایت نادر نمونہ پیش کیا ہے، جودت طبع اور سخن فہمی عالم بالا کا منکرین اگر یہی ثبوت پیش کرتے رہے تو "معلوم شد" اور دلیل کتنی غیر معقول ہے کہ اگر اس جگہ حسب خیال مفسرین مراد تھا تو اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی! اس کا جواب بجز

اس کے کہ میں حدیث و روایت سے دوں، بہتر ہے کہ قرآن مجید سے دوں
آیت قرآنی ہے،

اعبد ربك حتىٰ یاتیك	جب تک تمہیں موت نہ آجائے
الیقین،	اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو،

اس جگہ "یقین" کے معنی "موت" کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے منکرین حدیث کے موجودہ زمانہ تک سب اس کے معنی یہی سمجھ رہے ہیں، خود منکرین حدیث بھی، یہ کوئی نہیں کہتا کہ

واعبد ربك حتىٰ یاتیك الیقین	جب تک تمہیں یقین نہ آجائے اس وقت تک عبادت کرو،

اور اس کے بعد چھوڑ دو، تو اگر اس جگہ یقین کے معنی "موت" کے ہیں، تو آخر خدا کو کیا دشواری تھی کہ "موت" کہہ دیتا؟ "یقین" کہہ کے خواہ مخواہ لوگوں کو شبہ میں ڈالنے کے کیا معنی؟

"جواب بالکل "ظاہر و باہر" ہے قرآن مجید کا ایک خاص پیرایہ بیان ہے، ادائگی مفہوم کے لئے حسب موقع جو کنایہ، جو استعارہ، جو تشبیہ سب سے زیادہ بلیغ اور مؤثر ہوتی ہے، وہ لائی جاتی ہے، اس پر اعتراض کرنا، کہ اس جگہ یہ کیوں ہے اور وہ کیوں نہیں، کوئی بہتر طریقہ [illegible]

نہیں،

آگے چل کر کہا گیا ہے کہ

"کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے ان پر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود رسول کے سامنے پیش کر کے ان کی تصدیق کی ہے؟ پھر کسطرح انہیں جزو ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا رکھتے ہو"؟

جواب اثبات میں ہے، جن حدیثوں کو ہم نے تسلیم کیا ہے، آسمانی مہر یقیناً ہے، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ رسول کے مطابق ہم ان پر عمل کرتے ہیں، آسمانی مہر تو ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ	تمہارے لئے رسول ایک اچھا
اسوۃ حسنہ وما ینطق عن	ہے رسول اپنی طرف سے کچھ
الھویٰ ان ھو الّا وحیٌ یّوحیٰ	کہدتیا، بلکہ وہ جو کہتا ہے
	کیا ہوا ہوتا ہے۔

اور

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما	رسول جو کچھ دے اس
نہاکم عنہ فانتھواﮦ	جس سے منع کرے با

اور اس قبیل بہت سی آیتیں ہیں، جن میں حکم رسول

رض کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر میں احکام رسول وارد
ہیں، سنت رسول موجود ہے، تو اسے ترک کیونکر کیا جا سکتا ہے جبکہ خود
سول اللہ بھی تاکید فرماتے ہیں، کہ میری سنت کو پکڑے رہنا کبھی گمراہ
ہیں ہوگے، خلفاء راشدین میں جو شخص سریر آرائے خلافت ہوتا ہے
مہور امت کے سامنے اعلان کرتا ہے، کہ میں کتاب اللہ کو دلیل راہ
اؤں گا، سنت رسول کو چراغ ہدایت سمجھوں گا، اگر اس میں کوتاہی
روں، تو مجھ سے مواخذہ کرنا، تو آخر وہ کونسی "سنت" تھی جس کی پیروی
اعلان ہو رہا ہے، جس کی اتباع کا دم بھرا جا رہا ہے لا محالہ ماننا پڑے
، کہ وہ ہی سنت، جو سلف سے خلف تک پہونچی ہے، جس کے متعلق
بت ہے کہ رسول اللہ نے ایسا کیا، جس کے متعلق خود رسول نے کہا،

لیکم بسُنّتي — تمپر میری سنت واجب ہے،

وقت آخر رسول اللہ قلم دوات مانگتے ہیں کہ میں تمہیں ایسی چیز لکھ دوں
کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو، حضرت عمر فرماتے ہیں، ہمارے لئے
ب اللہ اور سنت رسول کافی ہے، حضور خاموش ہو جاتے ہیں ظاہر
کہ وہ قرآن نہیں تھا، جس کے متعلق حضور کچھہ تحریر فرماتے، اس لئے
س کی تو آپ نے عمر بھر تبلیغ کی تھی، اس کے تو حفاظ موجود تھے
یہ پورے طور سے شایع ہو چکا تھا، اس لئے اس کے متعلق کسی

ہدایت کی ضرورت نہ تھی معلوم ہوتا ہے کوئی دوسری چیز بھی تھی جس پر
اور یہ ہدایت کا انحصار تھا، قرآن سے ہدایت بے شبہ ہوتی تھی، لیکن
اس ہدایت کا تکملہ اسوقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک حضور کوئی دوسری
چیز تحریر نہ فرماتے لیکن حضرت عمر نے جب فرمایا کہ ہمارے لئے کتاب
وسنت کافی ہے، تو حضور خاموش ہو رہے، گویا آپ نے اس سے اتفاق
فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز آپ تحریر فرمانا چاہتے تھے، وہ
ہو ہی رہی تھی، حضور انور کی وفات کے بعد ہی جب انعقاد حکومت ہو
لگا، اور حضرت صدیق نے انصار کے جواب میں حدیث پڑھی، کہ خلافت
قریش کا حق ہے، تو ہزار ہا صحابہ میں سے کسی کی زبان سے یہ نکلا، کہ
کو احکام دین سے کیا تعلق؟

جس قرآن کی مقالہ نگار صاحب تلاوت کرتے ہیں، خدا معلوم اس
میں آیات ذیل بھی ہیں یا نہیں؟ وَمَنْ اصدق من اللہ حدیثا
(اللہ سے بڑھ کر سچی "حدیث" بیان کرنے والا اور کون ہے) واما بنعمۃ
ربك فحدث (اپنے رب کی نعمتوں کی "حدیثیں" بیان کرتے رہو)
أفبھذا الحدیث انتم مدھنون (اے کافرو کیا تم اس "حدیث"
کو سرسری بات سمجھتے ہو؟) فَذَرْنِی وَمن یکذب بھذا الحدیث
اب چھوڑ دو ہم کو اور اس "حدیث" کے منکر کو) اَللہُ نزل احسن

الحدیث (اللہ نے اپنی بہتر سے بہتر "حدیث" اتار رہی ہے) قال ھٰؤلاء لقوم لا یکادون یفقھون حدیثا (ان کافروں کی کیا شامت ہے کہ فہم "حدیث" کے قریب ہو کر بھی نہیں گزرتے؟) اگر مقالہ نگار کے علم اللغات میں لفظ "حدیث" سے قرآن مجید میں حدیث نبوی ہی مراد ہے، تو کیوں نہ آیات بالا سے "منکرین حدیث" اور "انکار حدیث" کے لئے سخت سے وعیدیں قرآن مجید ہی سے سمجھی جائیں؟

اس کے علاوہ اس کا تو ہر شخص کو اعتراف ہے کہ صحابہ کرام نے مذہب خود رسول اللہ سے سیکھا تھا، انھوں نے رسول اللہ کی زبان سے سنا تھا اپنے کانوں سے رسول اللہ کو حرام و حلال کا فتویٰ دیتے، چیزوں کو اچھا برا کہتے سنتے تھے، اگر کوئی شبہ ہوتا تھا، تو وہ رسول اللہ سے پوچھ لیتے تھے، اور وہ بتلا دیتے تھے، لہذا ان کا مذہب، ان کا فہم، ان کا تفقہ فی القرآن، ان کا اعتصام بالکتاب، اور ان کی رائے ہمارے مقابلہ میں ارفع و اعلیٰ ہے، خلفاء راشدین کا عہد دیکھئے کہ ان حضرات کا مسلک کیا تھا، کیا وہ صرف تمسک بالکتاب کو کافی سمجھتے تھے، کیا انہیں ہر چیز قرآن میں مل جاتی تھی، حضرت ابوبکر کا یہ واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، کہ ایک عورت جدہ کا حق طلب کرتی ہوئی آئی آپ نے کہا میں کتاب اللہ میں تیرا کوئی حق نہیں پاتا، تو مغیرہ اٹھے اور کہا کہ رسالت پناہ نے سدس دلوایا ہے

حضرت ابوبکر نے پوچھا کوئی گواہ بھی ہے؟ محمد بن مسلمہ نے شہادت دی، تو
حضرت ابوبکر نے بلا تامل اسے نافذ فرما دیا[1]، حضرت فاطمہ زہراؓ نے جب باغ
فلک سے متعلق اپنا دعویٰ پیش کیا، تو اس کی تردید بھی حضرت صدیق نے ایک
حدیث ہی پڑھ کر کی، کہ نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث. اس
وقت نہ حضرت صدیق کو یہ خیال آیا، نہ حضرت زہراؓ نے یہ سمجھا نہ صدہا
صحابہ میں سے کسی کو یہ نکتۂ دقیق یاد آیا، کہ حدیث کو احکام دینی سے کیا
تعلق، حدیث کی حیثیت تو تمام تر تاریخی ہی ہے۔ اس پر ذہبی نے تذکرہ
میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب قرآن میں حضرت ابوبکر نے کچھ نہیں پایا تو سنن
کی جستجو فرمائی اور جب ثقہ سے خبر مل گئی، تو آپ نے اس پر اکتفا نہیں کیا
بلکہ ایک دوسرے ثقہ سے اس کی تصدیق کی اور نافذ کرایا، خوارج کی طرح
یہ نہیں کہا کہ ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے[2]۔

اسی طرح حضرت عمر بھی قلت روایت اور کثرت طرق کے حامی تھے
چنانچہ حضرت عباس کی زمین والے واقعہ میں شہادت لی، ویسا ہی فیصلہ
کیا، جیسا حدیث کے مطابق ہونا چاہیئے تھا، اور پھر خود ہی فرما دیا،
میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا ہوں، صرف تاکید مقصود تھی[3]،
خود رسول اللہ کے زمانے میں بھی "حدیث" کی "تاریخی" حیثیت نہ

[1] و [2] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابی بکر ۱۲ [3] تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمر ۱۲

تھی، بلکہ "دینی" حیثیت تھی، رسول اللہ نے جب معاذ بن جبل کو یمن بھیجا ہے تو فرمایا کہ اگر تمہارے پاس کوئی مقدمہ آیا تو کس طرح فیصلہ کروگے کہا، کتاب اللہ سے، فرمایا، اگر کتاب میں نہ ملے تو؟ کہا، سنت رسول سے، فرمایا، اگر اس میں بھی نہ ہو تب؟ کہا تب میں اپنی رائے سے کام لونگا۔[1] اس پر رسول اللہ کے خوش ہونے کے کیا معنی؟

حضرت ابن عمر کا یہ واقعہ بھی خاصی حیثیت رکھتا ہے۔

حدثنا سلیمان بن حرب عن ایوب عن نافع عن ابن عمر کان یکری مزارعه علی عهد النبی وابی بکر و عمر و عثمان وصدرا من امارة معاویة ثم حدث عن رافع بن خدیج ان النبی نهی عن کراء مزارع فذهب ابن عمر الی رافع وذهبت معه فسأله فقال نهی النبی عن کراء المزارع

سلیمان بن حرب ایوب سے وہ نافع سے بیان کرتے ہیں، کہ ابن عمر اپنے کھیت کرائے پہ دیدیا کرتے تھے رسول اللہ کے عہد میں بھی، حضرت ابوبکر، و عمر و عثمان کے عہد میں بھی اور جناب معاویہ کے عہد میں بھی کچھ عرصے تک، پھر ان سے رافع بن خدیج کی حدیث بیان کی گئی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کراء ارض سے منع فرمایا ہے، تو

[1] اس حدیث کی مشکوٰۃ نے ترمذی ابوداؤد اور دارمی کے حوالے سے تخریج کی ہے۔

نقال بن عمر قد علمت انا کن نکری مزارعنا علیٰ عہد رسول اللہ۔

ابن عمر نے کہا تم جانتے ہو ہم رسول اللہ کے زمانے میں بھی ایسا کرتے رہے ہیں،

حدثنا یحیی بن بکیر ثنا اللیث عن عقیل عن ابن شہاب قال اخبرنی سالم ان عبد اللہ بن عمر قال کنت اعلم فی عہد رسول اللہ ان الارض تکری ثم خشی عبد اللہ ان یکون النبی قد احدث فی ذالک شیئا لم یکن علم فترک کرا الارض۔[1]

ابن شہاب کہتے ہیں، کہ مجھے سالم نے خبر دی کہ عبد اللہ بن عمر نے کہا، کہ میں رسول اللہ کے عہد میں یہ جانتا تھا کہ زمین کرایہ پہ دی جا سکتی ہے پھر عبد اللہ ابن عمر ڈرے کہ مبادا رسول اللہ نے کچھ اس باب میں فرمایا ہو، اور انہیں علم نہ ہو، اس خیال کے آتے ہی انہوں نے زمین کرایہ پہ دینی چھوڑ دی،

اس میں خاص طور سے غور طلب امر یہ ہے کہ عبد اللہ ابن عمر خود صحابی ہیں، حاضر باش بزم رسول ہیں، ان کے زہد و تقوی اور دیگر محامد و محاسن کی ایک دنیا قائل ہے خود رسالت پناہ خوشنودی مزاج کا اظہار فرما چکے ہیں، رسول اللہ کے عہد میں، حضرت ابو بکر کے عہد میں، حضرت

---

[1] بخاری ص ۳۱۶

عمر کے عہد میں، حضرت عثمان کے عہد میں اور جناب معاویہ کے عہد امارت میں کچھ عرصہ تک وہ ایک کام کرتے رہے ہیں، اس کے بعد انہیں رافع بن خدیج کی حدیث پہونچتی ہے، خود تحقیق حال کے لئے رافع کے ہاں پہونچتے ہیں، وہ وہی جواب دیتے ہیں، خود صحابی ہیں، رسول کے زمانہ سے اسوقت تک ایک کام کرتے آئے، کسی نے ٹوکا نہیں، پھر خیال آتا ہے کہ ممکن ہے رسول اللہ نے فرمایا ہو اور مجھے علم نہ ہو سکا ہو، لہذا اس کام کو چھوڑ دیتے ہیں، اگر احادیث صرف تاریخی درجہ رکھتی تھیں، دینی حیثیت کی مالک نہیں تھیں، تو عبد اللہ ابن عمر باوجود جلیل القدر صحابی ہونے کے کیوں ایک پُر منفعت کام چھوڑ دیتے ہیں اگر وہ حدیث کی دینی حیثیت کے قائل نہ ہوتے تو کیا قیامت تک وہ ایسا کر سکتے تھے، ؟ صرف یہی دینی حیثیت تھی، جس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اسے چھوڑ دیں،

حضرت ابن عمر ہی کا ایک دوسرا واقعہ بھی قابل تامل ہے۔

قال ابن عمر لجابر بن زید	حضرت عبد اللہ بن عمر نے جابر
انك من فقهاء البصرة	بن زید سے کہا کہ بیشک تم بصرہ
فلا تفت الا بقرآن ناطق	کے فقہا میں سے ہو، لیکن اپنی
او سنة ماضية فانك	رائے سے کبھی فتویٰ نہ دینا سوا

ان فعلت غیر ذالك هلكت واهلكت[1]۔

قرآن وسنت کے، اگر اس کے علاوہ تم نے کیا تو خود بھی ہلاک ہوگے، اور دوسروں کو بھی ہلاک کروگے،

اس کے علاوہ

قال ابو النضر لما قدم ابوسلمة البصرة اتیته وانا والحسن فقال للحسن، انت الحسن ما کان احد بالبصرة احب الی لقاء منك وذالك انه بلغنی انك تفتی برائك فلا تفت برائك الا ان یکون سنة عن رسول الله او کتاب منزل[2]۔

ابوالنضر کہتے ہیں کہ جب ابوسلمہ بصرہ آئے، تو میں حسن کے ساتھ وہاں گیا، انہوں نے حسن سے کہا کہ بصرہ میں تم سے زیادہ ملاقات کا اشتیاق مجھے کسی اور سے نہیں تھا، لیکن مجھے معلوم ہوا ہے، کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو، اپنی رائے سے کبھی فتویٰ نہ دو، یا سنتہ رسول سے یا کتاب الہٰی سے۔

اگر سنت کی کوئی دینی حیثیت صحابہ کی نظروں میں نہیں تھی، تو عبداللہ بن عمر، ابوسلمہ کو کیوں یہ نصیحت کر رہے ہیں، کہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دو، بلکہ سنت سے دو، کتاب سے دو، اگر دینی حجت ق

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۷۵ بحوالہ دارمی ۱۲، [2] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۷۵ بحوالہ دارمی ۱۲

کتاب بھی، تو صرف کتاب پر زور دینا چاہیئے تھا لیکن صحابی ہونے کے باوجود وہ زور دے رہے ہیں، بلکہ ڈرا رہے ہیں کہ دیکھو اگر اپنی رائے سے فتویٰ دیا تو ہلاک ہوئے، کتاب الٰہی اور سنت رسول دونوں کو اپنے سامنے رکھو اور فتویٰ دو، صرف "تاریخی" چیز کی اتنی حیثیت نہیں ہو جاتی، کہ وہ "دینی" چیز کے دوش بدوش، بہ ثبات "عقل و ہوش" رکھی جائے؟

علاوہ ازیں

قال الشعبی ماحدثوک من رسول اللہ فخذ بہ وما قالوہ برائہم فالقہ فی الحش[1]	شعبی کہتے ہیں کہ اگر لوگ تم سے حدیث بیان کریں تو تم اسے لے لو، لیکن اگر اپنی رائے بیان کرنے لگیں، تو اسے غلاظت میں پھینکدو،

یہ حدیث بھی قابل تامل ہے، اسے بھی شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک خاص عنوان کے ماتحت ذکر کیا ہے اور شاہ صاحب کا پایہ علم حدیث میں جتنا ارفع و اعلیٰ ہے اس سے سب واقف ہیں خیر، وہ حدیث یہ ہے،

لا الفین احدکم متکئا علیٰ — نہ ہو کہ میں تم میں سے کسی کو ایسا

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۵۷ بحوالہ دارمی

اریکتہ، یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او رغبت عنہ فیقول لا ادری ما وجدناہ فی کتاب اللہ اتبعنا۔

پاؤں کہ وہ ٹیک لگائے ہوئے تکیہ پر بیٹھا ہو، اس کے پاس میری باتوں میں سے کوئی ایسی بات آئے جس کا میں نے حکم دیا ہو یا منع کیا ہو اور وہ کہے کہ میں تو اسے نہیں جانتا قرآن میں تو ہے نہیں کہ میں اس کی پیروی کروں،

معلوم ہوتا ہے کہ سرکار رسالت نے اپنی چشم بصیرت سے سب کچھ مطالعہ فرمالیا تھا، ورنہ ایسی بات وہ کیوں فرماتے؟

شاہ ولی اللہ صاحب جو اسرار و رموز شریعت کے ماہر خصوصی ہیں ایک اور بات فرماتے ہیں، جو ہر منکر حدیث کے لئے سرمایۂ تفکر ہے یعنی رسول اللہ سے جو کچھ مروی ہے، اس کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کا بعض حصہ

مستند الی الوحی وبعضہا مستند الی الاجتہاد وبمنزلۃ الوحی لان اللہ تعالیٰ عصمہ من ان لیقرر ایہ علی الخطاء[1]

وحی سے مستند ہوگا، یا حضور کے اجتہاد کبھی بمنزلہ وحی کے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

وماموں کر دیا ہے کہ آپ کی رائے
گرامی غلط واقع ہو،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انبیا معصوم ہیں، لہذا ہمارے رسول بھی غلطی اور غلط روی سے معصوم تھے، محفوظ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص مرتبہ پر سرفراز فرمایا تھا، ان سے کسی غلطی کا صدور ناممکن تھا پھر اس کے تسلیم کرنے کے بعد فرمودۂ رسول ظاہر ہے ریب و شک سے پاک، اور اسی طرح واجب العمل اور واجب التسلیم ہے، جس طرح کوئی منصوص امر جس پر نص وارد ہو، غرض اس قبیل کی بہت سی چیزیں مل سکتی ہیں، جن سے حدیث کی دینی حیثیت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ خود عہد صحابہ میں اس کی دینی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے اور اس عہد سے آج تک امت اسے مانتی چلی آتی ہے
پھر اب یہ دعویٰ کہاں تک قابل پذیرائی ہے؟

"یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور بہ ہے
اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم
فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول
اور اطاعت رسول فرض ہے تو لازم آتا ہے کہ اس کے
اقوال و اعمال جمع کئے جائیں، تاکہ امت اس کی اطاعت

کرے۔ اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جس قدر امراء ہوئے ہیں، ان میں سے بھی ہر ایک کا مجموعۂ حدیث ہونا چاہیئے، ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی، کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے جس میں رسول اور امرا دونوں داخل کئے گئے ہیں"

امعان نظر سے اگر اس دلیل کا مطالعہ کیا جائے، تو ظاہر ہو جائیگا کہ واقعہ یوں نہیں ہے۔ قرآن نے یقیناً خدا، رسول اور اطاعت امیر کا حکم دیا ہے، اور ہمیں اطاعت کرنی چاہیئے، لیکن کیا رسول اور امیر کا درجہ ایک ہے؟ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں، اور کتنی معقول بات فرماتے ہیں کہ

اقول انتظام الدین یتوقف علیٰ اتباع سنن النبی و انتظام السیاسۃ الکبریٰ یتوقف علی الانقیاد للخلفاء فیما یأمرونہم¹	میرا خیال ہے کہ انتظام دین سنن نبوی کی پیروی پر منحصر ہے، اور انتظام سیاستہ کبریٰ خلفا اور امرا کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے۔

شاہ صاحب کا یہ قول اتنا مبرہن ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا

ـــــــــــــــ
۱؎ حجۃ اللہ البالغہ ۱۲

دین چونکہ ایک اٹل اور نہ بدلنے والی چیز ہے اس لئے اس میں تو قرآن و سنت نبوی ہی کی پیروی ہوگی، اور سیاست ایسی چیز ہے، جو مصالح کے لحاظ سے ہر وقت بدلتی رہتی ہے، اس لئے امرا اور خلفا کی اطاعت وانقیاد کا حکم ہے، اس لئے کہ اسلام کے نزدیک۔

الفساد اکبر من القتل   فساد قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے

اسلام جماعت انسانی کو ایک نظام اور ضابطہ کے اندر رکھنا چاہتا ہے اسی لیئے اگر کوئی حبشی غلام بھی امیر ہو تو بھی اس کی اطاعت واجب ہے لیکن اگر وہ کتاب و سنت سے اعراض کرے تو خواہ وہ حبشی نہیں عمر فاروق ہو، ایک بدو اسے تکلے کی طرح سیدھا کرنے کی دھمکی دیسکتا ہے، خود قرآن اور حدیث میں جابجا اس کی تفصیل ملے گی، کہ امیر کی اطاعت اسی وقت تک فرض ہے، جب تک وہ متبع کتاب و سنت ہے، اور جب سے اعراض کرے تو اس کی پیروی ساقط، مسلمان پر پڑوسی کا حق ہے، دوستوں کا حق ہے، والدین کا حق ہے، قرابت داروں کا حق ہے، امیر وقت کا حق ہے لیکن اگر کوئی بات خلاف سنت ہو، خلاف کتاب ہو، تو یہ تمام حقوق ختم ہو جائیں گے، مسلمان ان تمام بندشوں سے آزاد ہو جائیگا، اور وہ صرف خدا کی اطاعت کریگا، ارشاد رسول کی پیروی کریگا، لہذا ثابت ہو گیا کہ نظم و انتظام کے قایم رکھنے کیلیئے امیر کی اطاعت واجب تو ہے، لیکن اسی وقت تک، جبتک

وہ کتاب وسنت پر چلے، میرے اس دعوے کی دلیل قرآن ہی میں اور اسی آیت میں ملتی ہے کہ

وان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرّسول۔ — اگر کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ درپیش ہو تو خدا اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

اس جگہ "امیر" کا لفظ "ردوہ" میں اسی لئے نہیں داخل کیا کہ اگر وہ کتاب وسنت کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو خدا اور رسول کی طرف لوٹاؤ یعنی قرآن وحدیث میں اس کی جستجو کرو، لہٰذا اگر "ردوہ" میں امیر داخل ہوتا تو یقیناً امراء اسلام کے مجموعۂ احادیث تیار کرنے کی ضرورت تھی، لیکن جب اس میں نہیں ہے، صرف "اطیعوا" میں ہے تو ہم اس کی اطاعت کریں گے اور جب کوئی بات پیدا ہوگی، تو خدا اور رسول کی طرف لوٹائیں گے، اس وقت امیر کو پوچھیں گے بھی نہیں، اور اسی کے مطابق عمل کریں گے، اب یقیناً یہ بات ثابت ہوگئی، کہ امراء اسلام کے مجموعہ احادیث تیار کرنے کی ضرورت کیوں نہیں ہے، اور رسول اللہ کے مجموعۂ حدیث کی ضرورت کیوں ہے؟

اس کے علاوہ سوال یہ ہے کہ جس طرح رسول متعین ہوا ہے، کیا اولی الامر کی تعیین پر بھی وہی جزم ووثوق کیا جاسکتا ہے؟ کیا مقالہ نگار صاحب اس پر تیار رہیں، کہ جس طرح آنحضرت صلعم کے رسول ہونے پر ان کا ایمان ہے اسی طرح وہ اکبر وشاہجہاں یا اورنگ زیب وصلاح الدین کے اولوالامر

ہونے پر حلف شرعی لے سکتے ہیں۔؟

آگے کہا ہے کہ

"یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اطاعت ہو گی، اولوالامر کی اطاعت کے حکم سے حل ہو جاتا ہے کہ جو اس کی جانشینی کریں گے؛"

اگر ایسا ہوتا تو "ردوہ" میں امیر کا لانا ضروری تھا، اور اس میں امیر اسی لئے نہیں لایا گیا، کہ اس کا ہر وقت امکان ہے کہ کوئی امیر غاصب ہو شرابی ہو، حکم خدا اور رسول کی پرواہ نہ کرتا ہو، لہذا اگر ایسا ہو تو آخری فیصلہ اولوالامر" پر نہیں، بلکہ ان کے اولوالامر" یعنی خدا اور رسول رکھا گیا مثلاً یوں سمجھئے کہ مصطفےٰ کمال پاشا کی حکومت نے اگر بقول بعض، مسجدیں مقفل کرا دیں، نماز غیر ضروری قرار دی، پارلیمنٹ کا کوئی مذہب نہیں رکھا قوانین اسلام پر عمل کرنا چھوڑ دیا، اور ایک دوسرا دستور حکومت وضع کر لیا، تو کیا انہیں کوئی منکر حدیث "جانشین رسول" مان لے گا نہیں اور یقیناً نہیں، تو ایسی صورت میں چارہ کار سوا اس کے اور کیا ہے کہ معاملہ خدا اور رسول کے سپرد کیا جائے اس لئے کہ رسول کے متعلق تو کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اتنا "نیشنلسٹ" ہو جائے گا۔ کہ قرآن کو چھوڑ کر یورپ اور اس کی دوسری نوآبادیوں کے اصول پر دستور حکومت

وضع کرے، بتلایا جائے کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ کیا اس کی اتباع کی جائے، ؟ جواب اگر نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے، تو پھر لامحالہ ہمیں رجعت قہقری کر کے اسی طرف لوٹنا ہوگا، جس نے "اولوالامر" کی اطاعت واجب کی ہے، اب یہ حکمت سمجھ میں آگئی ہوگی کہ "اطیعوا" میں امیر کا ذکر بقاء نظم وانتظام کے لئے ہے، اور "ردوہ" میں عمداً اور مصلحتاً نہیں ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو تو اس کا تدارک کسی ایسے "جانشین رسول" سے نہیں ہوگا، بلکہ صرف قرآن وحدیث سے پہلی ہی دلیل کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ

"دراصل حکم کتاب اللہ ہے، رسول یا امیر اس سے اپنے فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور رہیں اسی لئے فرمایا وَمَا اختلفتم فی شیئٍ فحکمه الی اللہ۔

اور اسی لئے فرمایا "وَاِن تنازعتم فی شیئٍ فردوہ الی اللہ والرسول" اگر صرف "اللہ" مقصود تھا، تو لفظ "رسول" کے نہ لانے میں یہاں کیا "دشواری" تھی، معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے بعد اگر کوئی چیز مامور ہے تو وہ رسول ہے، قرآن کے بعد اگر کوئی چیز واجب العمل ہے، تو وہ حدیث ہے۔

ان کھلی ہوئی آیتوں اور نشانیوں کے بعد آخر منکرین حدیث

فبای حدیث بعدہ یومنون اور کس چیز پر ایمان لائیں گے

دوسری دلیل ہے کہ

"کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں رسول کے حکم کے بھی اتباع کا تو حکم موجود ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی لیکن خود رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا، اس کی بھی تصریح قرآن میں ہے، اتبع ما اوحی الیک من ربک پھر رسول کو اعلان کر دینے کا حکم دیا گیا، قل انما اتبع ما اوحی الی من ربی لہذا رسول بجز وحی کے کسی کا پیرو نہیں تھا، اس لئے اس کی پیروی بعینہ قرآن کی پیروی ہے"

ثابت ہوا کہ حدیث کی پیروی بعینہ قرآن کی پیروی ہے.....
اس لئے کہ احادیث بھی تو آخر امور دین ہی کے متعلق ہیں، اور یہ "تاریخی" طور سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ میری پیروی کرو، صحابہ کی پیروی کرو، اگر ایسا کرو گے تو ہدایت یاب ہو گے، لہذا رسول کی پیروی عین قرآن کی پیروی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ سب اس تفصیل سے قرآن میں موجود بھی ہے، اس لئے قرآن نے کہلوایا،

قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی (اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری (رسول اللہ کی) پیروی کرو۔ اور اس کی پیروی موجب رضا مندی خدا ہے، اور اس کی پیروی ہے کیا؟ وہی جس کے متعلق اس نے حکم دیا، جس کے متعلق اس نے کیا اور چونکہ رسول کی پیروی موجب رضا مندی خدا ہے،

وما ینطق عن الھویٰ ان ھوا الا وحی یوحیٰ (فرمودۂ رسول وحی ہی ہے اور ہے کیا؟) اس لئے کہ خدا نے اسے رسول بنایا، اس کی پیروی اپنی رضامندی کا سبب بتائی تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا قول کوئی معمولی قول نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ وحی ہے اور کچھ نہیں، آگے پھر کہا گیا ہے۔ کہ

"یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا، سب وحی تھا، جس کے ثبوت میں آیت وما ینطق عن الھویٰ الخ پیش کی جاتی ہے، صحیح نہیں۔ کیونکہ کفار کو جو انکار تھا وہ قرآن کے متعلق تھا، اسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی، اس کے متعلق نہ انکار تھا، نہ بحث، قل انما انذرکم بالوحی"۔

[illegible]

… غلط تھا۔ کفار کو انکار محض وحی قرآنی ہی سے نہ تھا۔ بلکہ مطلقاً وحی سے تھا

چنانچہ پہلی ہی آیت میں تصریح ہے کہ "نطق رسول" وحی ہے، اور یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ وہی نطق رسول وحی ہے، جو امور دین میں ہو، اور وہی حدیثیں واجب العمل ہیں جو امور دین میں ہوں" ورنہ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی، اس کے متعلق" نہ اصرار ہے، نہ دعویٰ کہ وہ واجب العمل ہیں یعنی اگر رسول اللہ نے حضرت عائشہ سے گھر میں کوئی بات کہی یا حضرت فاطمہؓ سے کچھ فرمایا، تو امتیان محمدؐ ہر شوہر یا باپ پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ بھی اپنی لڑکی سے وہی کہے اور اسی طرح کہے، لیکن اگر رسول نے کہا کہ طواف یوں کرو یعنی یوں کرو، نماز میں یوں کھڑے ہو، یا اور اسی قبیل کے اقوال و اعمال جو دین سے متعلق ہیں دیئے، تو وہ ہمارے لئے بلاشبہ واجب العمل ہیں، ان کی پیروی کی جائے گی، اور جو پیروی کریگا، خدا اس سے خوش ہوگا،

تیسری دلیل میں احادیث کو ظنی بتلایا گیا ہے اور اس لئے ناقابل عمل، اس پر گفتگو بیکار ہے، اس لئے کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو ہوچکی ہے کہ وہ کہاں تک قابل عمل ہیں،

چوتھی دلیل میں ایک بہت دلچسپ بات یہ کہی گئی ہے کہ تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی، اور پھر اسکو محکم یوں کیا گیا ہے کہ

"بعض جگہ حدیثیں بالکل قرآن کے خلاف جاتی ہیں جن

وجہ سے علما قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں
مثلاً اللہ نے مالدار مسلمانوں پر مرنے سے پہلے والدین اور
اقربا کے لئے وصیت فرض کی ہے، کتب علیکم اذا
حضر احدکم الموت ان ترک خیرن الوصیۃ
للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین۔
مگر حدیث کہتی ہے" لا وصیۃ لوارث" علما نے اس
حدیث کی وجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے عائلی مصالح
کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جسکو اہل تقوی پر ایک حق
قرار دیا ہے منسوخ کر ڈالی"

تعجب ہے کہ اس برہان قاطع پر جو منکرین حدیث نے پیش کی ہے
کیا کہا جائے، ؟ اگر یہ منکرین حدیث سے اس قدر بیزار ہیں تو قرآن
مجید پر تو پورے طور سے وسعت نظر ہونی چاہیئے تھی، نہ یہ کہ ادھر
ادھر کی کتابوں میں جو کچھ کسی نے لکھدیا، وہ سچ سمجھ لیا گیا، دعوے
اور دلیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حدیث نے اتنا بڑا ظلم کیا ہے
کہ لوگوں کو حق وصیت سے محروم کر دیا، اب وہ بیچارے کیا کریں
واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت اس وقت اتری جب تک قرآن مجید میں اعزا
واقربا کے حصص مقرر نہیں ہوئے تھے، اس کے بعد یہ پورا رکوع

ہوا جس میں باقاعدہ ہر شخص کے حصص مقرر کر دیئے گئے ہیں، تو اس کی ضرورت نہیں رہی، اور بحث والقاق دیکھیئے کہ اس میں بھی رسول کی پیروی فرض کی جا رہی ہے:

یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر
مثل حظ الانثیین فان کن
نساء فوق اثنتین فلھن
ثلثا ما ترك، وان کانت واحدۃ
فلھا النصف، ولابویہ لکل
واحد منھما السدس مما
ترك ان کان لہ ولد، فان
لم یکن لہ ولد وورثہ
ابواہ فلامہ الثلث فان
کان لہ اخوۃ فلامہ السدس
من بعد وصیۃ یوصی بھا
اودین، اٰباؤکم وابناؤکم
لاتدرون ایھم اقرب لکم
نفعًا، فریضۃ من اللہ

اللہ تم کو وصیت کرتا ہے کہ تمہاری
اولاد میں مرد کے لئے عورت سے دو
گنا حصہ ہے اور اگر عورتیں دو سے
زیادہ ہوں تو جو چیز وہ چھوڑ گیا
ہے تو دو تہائی اس چیز کا ملے گا اور
ایک ہے تو اس کے لئے نصف ہے
اور ماں باپ میں ہر ایک کو چھٹا حصہ
ملے گا اس صورت میں کہ اس کے
اولاد ہو۔ اور اگر نہ ہو تو والدین
ہی وارث ہوں گے، اور ماں کو
تیسرا حصہ ملیگا، اور اس کے بھائی
ہوں تو چھٹا حصہ ملے گا، اس وصیت
کے بعد جو وہ کر جائے، یا قرض کے
دینے کے بعد تمہارے باپ اور

واللّٰہ علیم حکیم ۝ تلك حدود
اللّٰہ ومن یطع اللّٰہ ورسولہ
یدخلہ جنت تجری من
تحتہا الانہا وخلدین فیہا
وذالك الفوز العظیم ومن
یعص اللّٰہ ورسولہ و
یتعد حدودہ یدخلہ
نارا خالدا فیہا ولہ
عذاب مہین۔
(پ ۴ - ع)

اور اگر اس سے بھی زیادہ ہوں تو
تو وہ سب ثلث میں مشترک ہوں گے
وصیت یا قرض کے بعد، اس میں
کسی کو ضرر نہیں ہے، یہ اللہ کی طرف
سے ہے اور وہ علیم وحکیم ہے، یہ اللہ
کے حدود ہیں، جس نے اللہ اور
رسول کی اطاعت کی وہ جنت میں
میں داخل ہوگا، جس کے نیچے نہریں
بہتی ہیں، اور ہمیشہ رہے گا اور
یہی سب سے بڑی کامیابی ہے
اور جس نے اللہ اور رسول کی نا
فرمانی کی، حدود سے گزر گیا، تو وہ
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں
داخل ہوگا، اور اس کے واسطے
ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

اس پورے رکوع میں "عائلی مصالح کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ اللہ
تعالیٰ نے سابقہ آیت کریمہ " واذا حضرا حدکم الموت ان ترك

ان الله کان علیما حکیما ۵ ولکم
نصف ما ترك ازواجکم ان
لم یکن لهن ولد فان کان
لهن ولد فلکم الربع مما
ترکن من بعد وصیة یوصین
بها او دین، ولهن الربع مما
ترکتم ان لم یکن لکم ولد
فان کان لکم ولد فلهن
الثمن مما ترکتم من بعد
وصیة توصون بها او دین
وان کان رجل یورث کلالة
او امرأة وله اخ او اخت فلکل
واحد منهما السدس فان
کانوا اکثر من ذلك فهم
شرکاء فی الثلث من بعد
وصیة یوصی بها او دین ۵
غیر مضار۔ وصیة من الله

تمہاری اولاد اس سے ناواقف ہیں
کہ کس میں زیادہ نفع ہے ان میں،
یہ تمہارے واسطے اللہ کی طرف سے
فرض کیا گیا ہے اور وہ علیم وحکیم
ہے، اور تمہاری بی بی جو چھوڑ کر
مرے اس میں تمہارا نصف کا حصہ ہے
اگر اس کے اولاد نہ ہو، اور اگر ہو تو
تمہارے لئے چوتھائی حصہ ہے وصیت
یا قرض کے دینے کے بعد اور اگر
تمہارے اولاد نہ ہو، تو تمہاری جائداد
میں بی بی کا چوتھائی حصہ ہے اور
اگر ہو تو پھر آٹھواں حصہ ہے بی بی
کے لئے وصیت اور قرض کے بعد اور
اگر ایسا کوئی آدمی ہو جس کی میراث
کلالہ یا ایسی عورت کہ ہے اس کے
واسطے بھائی یا بہن تو ان دونوں
میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا

خیرن الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی
المتقین" کا اجمال کافی نہ سمجھ کر یہ پورا رکوع نازل فرمایا، اور اس میں
باقاعدہ لڑکا، لڑکی، والدین، شوہر، بی بی بھائی، بہن سب کے حقوق
متعین کر دیئے، اب ہر مسلمان ان کی تعمیل پر مجبور ہے۔ اور ورثا کو بھی
حصے از روئے شرع شریف ملیں گے، لہذا اس صورت میں وارث کیلئے
وصیت کی ضرورت ہی کیا باقی رہجاتی ہے، ؟ وصیت تو اس وقت کی
جاتی ہے، جب آدمی مر رہا ہو اور اسے یقین ہو کہ میرے مرنے کے بعد یہ
کام ایسا نہیں ہوگا، تو وہ وصیت کر کے اپنی آرزو محکم کر جاتا ہے
اور پھر وہ پوری ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کا اندیشہ ہی نہیں، وارث کو
حق بہر حال ملیگا، چاہے وہ دینا چاہے، چاہے نہ دینا چاہے، تو پھر
وارث کے لئے وصیت کی کیا حاجت رہ گئی، ؟ لیکن اگر وصیت کرنے
والا اپنی جائداد سے کار خیر کے لئے غریبوں اور یتیموں کے لئے، کچھ وصیت
کرنا چاہتا ہے، کہ بطور صدقۂ جاریہ کے وہ کام آئے، تو اس کا حق بھی
شرع نے باقی رکھا ہے، وہ اپنی جائداد کے ثلث حصہ میں جس قسم کی ...
کو چاہے وصیت کر سکتا ہے اور وہ اس کی وفات کے بعد نافذ ہوگی
لیکن ثلث سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا، اور اگر وہ کر بھی دے
تو قاضی اسے منسوخ کر دے گا، اس لئے کہ حقوق اقربا باقی ر...

جائیں گے، اور یا مالی حقوق مقصد خداوندی نہیں، وصیت ثلث میں نافذ رہے گی، اور یہ جو کچھ ہوگا قرآن مجید کے اس رکوع کو پیش نظر رکھ کے ہوگا،

اور حدیث کے اوپر یہ الزام لگانا کہ وہ عائلی مصالح کو تباہ کر رہی ہے بڑی زیادتی ہے، احادیث وسنن میں اکثر ایسے واقعے ملتے ہیں کہ کوئی صحابی اپنی سب سے زیادہ "عزیز ومحبوب" چیز راہ خدا میں وقف کر دینا چاہتے ہیں، لیکن رسول خدا انہی "عائلی مصالح" کی بنا پر انہیں باز رکھتے ہیں اور اسے ان کے اقربا میں بحصّہ رسدی تقسیم کرا دیتے ہیں، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیث پر یہ الزام کیسے لگ سکتا ہے؟

اب یہ مسئلہ صاف ہوگیا کہ جب تک ذوی القربیٰ کے حقوق کی باقاعدہ تعیین نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک کیلئے وہ آیت کافی تھی جس میں والدین وغیرہ کے لئے وصیت کرنے کا حکم ہے لیکن جب حقوق پر پورا ایک رکوع نازل ہوگیا، تو وہ اجمال اس تفصیل میں مدغم ہوگیا اور اب امت کا اسی پر عمل ہے، اور چونکہ سب کے حقوق خود قرآن نے متعین کر دیئے ہیں۔ اب ان میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہوسکتی ہے لہٰذا وارث کے لئے وصیت کرنا ایک بے معنی سی بات ہے، البتہ اس ثلث میں جس پر وصیت کرنے والے کو پورا اختیار رہے، ہر قسم کی

کہ مجھ سے زیادہ عالم بالحدیث سوا عبداللہ بن عمرو کے کوئی نہیں، اس لئے کہ وہ لکھ لیتے تھے، اور میں نہیں لکھتا تھا[1]. کتابت کا یہ فعل ظاہر ہے، آنحضرت کے زمانہ میں ہی ہوتا تھا، خود طاہر جزائری نے اس کی توجیہ بھی کی ہے کہ جب لبس واختلاط کا اندیشہ رفع ہوگیا تو آپ نے کتابت کی اجازت دیدی تھی[2]، ورنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست زاہد و عابد شخص کتابت حدیث کا حکم اپنے عہد خلافت میں کیسے دے سکتا تھا، اور صحابہ اور تابعین اس کی پیروی کیسے کر سکتے تھے؟

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ

"حضرت ابوبکر نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کر دیا اس لئے کہ اختلاف کا اندیشہ تھا، انہوں نے تقریباً پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی لکھ رکھا تھا اسے بھی جلا دیا[3]"

یہ بھی غلط ہے۔ یہ قول تذکرۃ الحفاظ سے لیا گیا ہے اور خود صاحب تذکرۃ الحفاظ، علامہ ذہبی نے ان دونوں واقعات کو "مراسیل" میں شمار کیا ہے، اور مراسیل کا پایہ استناد قطعاً ساقط ہے۔ مراسیل ہمارے

---

[1] و [2] توجیہ النظر، [3] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابی بکر:۔ یہاں ایک بات اور عرض کر دی جائے کہ بعض لوگ مراسیل کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں، لیکن جمہور محدثین کرام قطعاً اسے ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں، اور کبھی اس سے احتجاج نہیں کرتے ہمیں جمہور محدثین کا مسلک پیش نظر رکھنا چاہیے۔ (رئیس احمد جعفری)

وصیت کر سکتا ہے، اور وہ نافذ ہو گی، لیکن اس کے بعد وصیت کا دروازہ بند ہے، اور گویا حکم قرآن سے بند ہے،

پانچویں دلیل یہ ہے کہ

"صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا۔ لا تکتبوا عنی غیر القرآن الخ"

یہ "الخ" کیا چیز ہے؟ محترم مقالہ نگار نے اس جگہ بھی بیجا رواداری سے کام لیکر منکرین حدیث کو انتہائی تلبیس کا موقع دیا۔ پوری حدیث یوں ہے۔

لا تکتبوا عنی غیر القرآن — مجھ سے سوا قرآن کے کچھ نہ لکھو ہاں

وحدثوا عنی فلا حرج۔ — حدیث بیان کرو۔

"حدثوا عنی فلا حرج" کو نہ لکھنا صرف "الخ" لکھ کے ٹال دینا بہت بڑی زیادتی ہے، جب پوری حدیث اس طرح سامنے آجاتی ہے، تو اعتراض کی صورت ہی بدل جاتی ہے، یعنی رسالت پناہ نے اس اندیشہ سے کہ قرآن وحدیث خلط ملط نہ ہو جائیں، کتابت سے تو منع فرمایا، اور حدیث بیان کرنے کی اجازت دیدی، اور بعد کو جب یہ اندیشہ رفع ہو گیا، تو آپ نے کتابت کی اجازت بھی عبداللہ بن عمرو کو دیدی، جیسا کہ خود حضرت ابوہریرہ نے ایک مقام پر اعتراف فرمایا ہے

لئے حجت نہیں بن سکتے، نہ ہم ان سے احتجاج کر سکتے ہیں، یہ جاننے کے بعد تعجب ہے کہ منکرین حدیث اسے کیسے پیش کرتے ہیں، یہ واقعہ تو خیر مراسیل میں سے ہے، لیکن صاحب تذکرۃ الحفاظ نے بڑے زور و شور سے حضرت ابو بکر کا وہ واقعہ نقل کیا ہے، جب آپ نے جدہ کا حق حدیث سے دلوایا ہے، اور اس کے بعد لکھا ہے، کہ دیکھو حضرت ابو بکر کو جب قرآن میں ایک چیز نہیں ملی، تو سنن کی جستجو کی اور جب سنن میں مل گئی تو اسے نافذ کر دیا۔ اور خوارج کی طرح یہ نہیں کہدیا کہ ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے۔[1]

خود حضرت عمر کا یہ عالم تھا کہ وہ قلت روایت اور کثرت طرق کے حامی تھے، اس قلت روایت اور کثرت طرق کا مطلب سمجھ لینا چاہیئے تاکہ روایت کے معنی یہ ہیں، کہ رسول اللہ سے یونہی اندھا دھند روایت نہ کر دی جائے، بلکہ خوب سمجھ بوجھ کر، حزم و احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیئے اور کثرت طرق کا مطلب یہ ہے کہ ایک حدیث متعدد راویوں سے اور متعدد طرق سے روایت کی جائے، تاکہ اس کی صداقت اور حقیقت غیر مشتبہ ہو جائے، چنانچہ حضرت عمر نے "املاص" کے متعلق قرآن مجید میں کچھ نہیں پایا، تو حدیث کی طرف رجوع کیا، اور جب حدیث مل

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ ذکر ابی بکر

تو قبول کیا، اسی طرح حضرت عباس کے واقعہ میں جس کا ذکر آ چکا ہے، جب آپ کو شہادت مل گئی تو آپ نے قبول فرما لیا[1] اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی، جب حدیث ملتی تھی، تو حلف لیکے اسے قبول فرما لیتے تھے[2]، یہ کبھی نہیں فرماتے تھے کہ ان کی تو صرف "تاریخی" حیثیت ہے، دینی حیثیت سے ہم نہیں مانتے، نیز حضرت علیؓ منکرین حدیث کی روایت سے منع فرماتے تھے، اور مشہور حدیث کی ترغیب دیتے تھے[3] ان باتوں کو پیش کرنے کے بعد ایک دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ

> "حضرت ابن عباس نے بھی حضرت ابوہریرہ کی حدیث "الوضوء مما مست النار" اور حضرت علی کی "نهی عن المتعة" اور حضرت ابوسعید خدری کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا۔"

اس سے گویا یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس حدیث کے قائل نہیں تھے، حالانکہ یہ کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتا، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس ان تینوں حدیثوں کو قبول نہیں فرماتے تھے، جو ان کے نزدیک پایۂ تحقیق تک نہیں پہونچتی تھیں، اور ان تین حدیثوں میں بھی پہلی حدیث منسوخ ہے، حدیث کی کتابوں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمرؓ، [2] و [3] تذکرۃ الحفاظ حضرت علی

شہادت در شہادت، در شہادت، در شہادت، عقلاً، عرفاً

یا قانوناً کسی لحاظ سے قابل سماعت نہیں۔"

حیرت ہوتی ہے کہ اس میں ناممکن کونسی چیز ہو گئی؟ صحابہ سے تابعین روایت کرتے ہیں، تابعین سے تبع تابعین روایت کرتے ہیں ان سے اور ثقہ لوگ، اگر ایک بات ایک سچا آدمی کہے تب تو وہ قابل قبول ہے اور اگر دس سچے آدمی اسی بات کو کہیں تو وہ ناقابل قبول؟ یہ استدلال بدیع تو یقیناً ناقابل فہم ہے، ہمارے پاس روایت کرنے والوں کی زندگی کا ایک ایک صفحہ محفوظ ہے، ان کے کردار، ان کی گفتار، ان کے عادات واطوار سب ہمارے سامنے ہیں، ان کا بیٹھنا، اٹھنا، ان کا کھانا، پینا ان کی بات چیت، ان کے عیوب وفضائل، ان کے محامد ومعائب سب ہماری نظر میں ہیں، تو آخر وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر ہم انہیں ساقط الاعتبار سمجھ لیں، آخر شہادت، در شہادت، در شہادت در شہادت "عقلاً، عرفاً، یا قانوناً کس اعتبار سے قابل سماعت نہیں امام شافعی نے بتایا ہے، کہ قبول حدیث کا معیار کیا ہے۔

اخبرنا ابو محمد الربیع بن سلیمان المرادی الموذن صاحب الشافعی بای شئ

ابو محمد کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی سے دریافت کیا کہ رسول اللہ سے حدیث ثابت کس طرح ہوتی ہے

میں متعدد روایتیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں رسول اللہ نے اسے ترک فرما دیا تھا، آپ نے گوشت نوش فرمایا اور بلا وضو کے نماز پڑھی اور خود جابر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ نے آخر میں "مما مست النار" سے وضو ترک کر دیا تھا، اور اسی پر امت کا عمل یا تواتر چلا آ رہا ہے، تو اسے حضرت ابن عباس نے بہت اچھا کیا نہیں مانا، اس لئے کہ یہ ماننے کی چیز ہی نہیں تھی، رہی دوسری حدیث "نہی عن المتعہ" سے انکار کی، تو ممکن ہے حضرت علی کی اس حدیث میں انہیں کچھ شبہ ہوا ہو، اس لئے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کیا، لیکن ان کے اس انکار کو خود صحابہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن زبیر کو حضرت ابن عباس کے اس مسلک کا جب علم ہوا، تو انہوں نے نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی کہ جس طرح وہ بصارت سے محروم ہیں اسی طرح بصیرت سے بھی، ذرا متعہ کر کے وہ دیکھیں تو، پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں، اور تیسری حدیث جس کا حضرت ابن عباس نے انکار فرمایا ہے، اسے بیان کرنا چاہیئے تھا، کہ وہ کیا تھی، یوں تو اس کے متعلق کچھ نہیں عرض کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ

"عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہو گیا، اور

ایھما الناسخ فنذھب الیٰ — توہم دونوں روایتوں میں سے جو
اثبت الروایتین[1]۔ الخ — روایت سب سے زیادہ اثبت ہوگی
اسے تسلیم کریں گے۔

امام صاحب نے اس موضوع پر اپنے اور خیالات بھی ظاہر فرمائے ہیں، لیکن ان کا اس بحث سے زیادہ تعلق نہیں، اس لئے انہیں ہم چھوڑ دیتے ہیں، مذکورۂ بالا اقوال میں امام صاحب نے قبول حدیث کا معیار روشن کر دیا ہے، اور یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ اگر احادیث میں اختلاف ہو تو ہمیں کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے۔

غرض کہنا یہی ہے کہ اگرچہ "شہادت در شہادت" چار بار نہیں لاکھ بار ہو، لیکن اگر رواۃ ثابت ہوں، ثقہ ہوں، عدول ہوں، تو وہ بلا تامل و بلا تذبذب قبول کی جائیں گی، لیکن اگر حقیقۃً منکرین حدیث اس "شہادت در شہادت" سے گھبراتے ہیں، تو ایک دوسری کتاب بھی ہے جس میں صرف "شہادت در شہادت ہے" اور بس۔ یعنی موطا امام مالک۔ امام مالک تبع تابعی ہیں، وہ زہری سے روایت کرتے ہیں، جو تابعی ہیں وہ صحابہ سے روایت کرتے ہیں، جو بلا ریب و شک عدول ہیں، امام مالک کی ثقاہت میں کسی کو شبہ ہی نہیں، اسی طرح زہری بھی غیر مشکوک ہیں

---

[1] کتاب الام جز سابع صفحہ ۱۷۷

ثبت معجز عن رسول الله
فقال قد كتبت هذه الحجة
فى كتاب جماع العلم فقلت اعد
من هذا مذ هبك ولا تبال
ان يكون فيه فى هذا الموضع
فقال الشافعى اذا حدث
الثقة حتى ينتهى الى الرسول
فهو ثابت عن رسول الله
ولا ترك الرسول الله حديثاً
ابداً الاحديثا وجد عن
رسول الله حديث يخالفه
واذا اختلف الاحاديث
عنه فالاختلاف فيها وجهان
احدهما ان يكون بها ناسخ
ومنسوخ فنعمل بالناسخ و
نترك المنسوخ والآخر
ان تختلف ولا دلالة على

فرمایا میں اس مبحث پر "جماع العلم"
میں کافی لکھ چکا ہوں۔ میں نے عرض
کیا، مجھے یہاں بھی دوہرا دیجئے، تو
انہوں نے فرمایا کہ جب ثقہ، ثقہ سے
روایت کرکے رسول اللہ تک پہنچا دے
تو وہ حدیث رسول ہے، پھر ہم
کسی حدیث کو اس وقت تک نہیں
چھوڑیں گے، جب تک ہمیں یہ معلوم
ہوجائے کہ کوئی دوسری حدیث
اس کی مخالف ہے، اور مخالفت
کی بھی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ
ایک ناسخ اور دوسری منسوخ
ہو، اگر ایسا ہو تو ہم ناسخ پر عمل
کریں گے، اور منسوخ کو ترک کر دیں
گے اور اگر احادیث میں اختلاف
ہو اور اس پر کوئی دلیل
نہ ہو کہ کون ناسخ ہے اور کون منسوخ

دتوثیق کررہا ہوں، وہ وہ ہے جس نے کبھی عمر بھر جھوٹ نہیں کہا، دروغ بیانی سے کام نہیں لیا، کذب و دجل اپنا پیشہ نہیں بنایا، اس کی ساری عمر حق پژوہی اور راست گوئی میں گذری، اس کی زندگی کا ایک ایک صفحہ، اس کی دیانت راست بازی، اور صداقت شعاری کا، زبان حال سے ترجمان ہے، تب اس نے شہادت دی، کہ ہاں یہ ثقہ ہے، اگر اس کے بعد بھی وہ ثقہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا، تو آخر اور معیار صداقت ہے کیا؟ رہا یہ سوال کہ اب خود اس توثیق کرنے والے کی، ثقاہت معرض بحث میں آتی ہے، تو اس کا جواب بھی وہی ہے، تا آنکہ یہ سلسلہ صحابہ تک پہونچ جائے، جو سب کے سب عدول تھے، اور ان سے رسول تک جس نے ان صحابہ کی توثیق کی، انہیں ستارہ بنایا، کہ جو اس کی رہنمائی قبول کریگا، ہدایت پائیگا، اس طرح یہاں آکر یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ لیکن؟

> "رواۃ میں طبقہ اول صحابہ کا ہے، ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں، صحابہ کرام کی عظمت اور جلالت شان کی وجہ سے، ہم اس اصول پر جو غیر صحیح، قرآن کے خلاف اور محض عقیدتمندی کا فیصلہ ہے، بحث کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن اس امر پر اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے، حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن

اور صحابہ پر زبانِ طعن دراز نہیں ہوسکتی ، غرض موطا کے جتنے بھی طرق ہیں وہ تین یا چار سے نہیں بڑھتے ، اور وہ سرچشمۂ نبوت کے قطرے ہیں جن کی لطافت و پاکیزگی میں کون ہے جو شک کرے ؟ موطا امام مالک کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اصح کتاب بعد کتاب اللہ ، موطا امام مالک ہی کو مانتے ہیں ، پھر بخاری کو ، پھر مسلم کو لیکن اس کا کیا علاج کہ منکرین موطا کو بھی نہیں مانتے ، آخر

فبای حدیث بعد اللہ و   اللہ اور اس کی نشانیوں کے بعد
آیاتہ یؤمنون ۔   وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے

چھٹا اعتراض نہایت سنگین اور بہت زبردست ہے ،

" ثقاہت کو تولنے کی کون سی میزان ہوسکتی ہے ؟ کیا یہی کہ ثقہ لوگ ان کو ثقہ کہیں ، پھر ان ثقہ کہنے والوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے ، جس کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی اور شہادت نہیں ہوسکتی ، لہٰذا حدیث کا سارا دارومدار شروع سے آخر تک ظن پر ہے "

آخر اس کے علاوہ اور میزان ہو کیا سکتی ہے کہ ثقہ کو ثقہ ، ثقہ کہے ، لیکن اس کے اس قول کی بنیاد ظن اور تخمین پر نہیں ، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ پر ہوتی ہے ، اسے جب یقین ہو جاتا ہے . کہ جس کی ثقاہت کی بین تصدیق

میں ہے، ومن اهل المدینه مردوا علی النفاق لا تعلمهم نحن نعلمهم، مسلمان کہلاتے تھے؛ رسول اللہ تک کو ان کے نفاق کا علم نہ تھا، نیز واقعۂ افک میں جو لوگ شریک تھے، جن پر حد قذف پڑی، جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا، لاتقبلوا لهم شهادةً ابدا، وہ بھی مسلمان کہے جاتے تھے، علاوہ بریں ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے، کہ رسول اللہ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا، "لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض" دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑکر، باہمی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا، ان کو بھی ابوبکر و عمر کے ساتھ ثقاہت کے پلے میں ہموزن رکھ دیا جاتا ہے،"

مقالہ نگار صاحب کا "اجتہاد" ان بزرگ کے متعلق کیا ہے جنہوں نے حسب بیان قرآن ایک نبی حضرت ہارون پر غصہ کیا، انہیں داڑھی پکڑ کر گھسیٹا اور ان کے تھپڑ مارا؟

پہلے اس "فتنہ" کے مسئلہ کو بھی صاف ہو جانا چاہیئے، پھر عدالت پر گفتگو ہوگی، صحابہ کی باہمی لڑائیاں، مثلاً حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کی جنگ درحقیقت کسی نفسانی جذبہ کے ماتحت نہیں تھی، بلکہ "حسن نیت" کے ساتھ غلط "فہمی کا نتیجہ" تھی اور

الاعمال بالنیات — اعمال کا مدار نیت پر ہے۔

اسی لئے ان بزرگان امت کی یہ اجتہادی غلطی نہ فتنہ تھی، "نہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے" کے مرادف، یہی وجہ ہے کہ حضرت علی حضرت عائشہ کا ہمیشہ احترام فرماتے رہے، کبھی آپ نے ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی، بلکہ ام المومنین، ام المومنین کہتے رہے، ورنہ اگر نفسانیت کی خاطر ہوتی، کسی مقصد نفس کے ماتحت ہوتی، تو دوسرے صحابہ اس میں کیوں آلودہ ہوتے، اور خود حضرت عائشہ جن کی برأت خود قرآن نے کی اور حضرت علیؓ جن کو رسالت پناہ نے بمنزلہ ہارون کے کہا، کیونکر ایسی غلطی فرما سکتے تھے، کیا قرآن اس ہستی کی برأت کر سکتا تھا؟ جو فتنہ و فساد میں ملوث ہونیوالی ہو، ؟ کیا رسول اللہ اسے بمنزلہ ہارون علیہ السلام کہہ سکتے تھے، جو جنگ و جدل کرے، نہیں اور یقیناً نہیں یہ صرف ان بزرگان امت کی اجتہادی غلطی تھی، جس کا بعد میں ہر ایک کو اعتراف بھی تھا اور ثبوت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عائشہ کو، اور حضرت عائشہ نے حضرت علیؓ کو کبھی بُرا بھلا نہیں کہا، بلکہ اپنے اپنے ذمہ سے درگذر فرمایا اور اگر اسے فتنہ تسلیم کر لیا جائے، تو معاذ اللہ قرآن نے غلطی کی کہ برأت کی اور (نعوذ باللہ) رسول اللہ نے بیجا کیا، کہ حضرت علی کو بمنزلہ ہارون سمجھا، خدا ہم پر رحم کرے، ہماری لغزشوں کو معاف کرے، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ قرآن کو تمام باتوں کا علم تھا، سرکار رسالت کی چشم بصیرت

ہر چیز کا مطالعہ کر رہی تھی، قرآن نے جو کچھ کہا سچ کہا، رسول نے جو کچھ فرمایا، صحیح فرمایا، والذی جاء بالصدق وصدق به اولٰئك هم المتقون۔

اب صحابہ کی عدالت پر گفتگو آتی ہے۔ امت کا صحابۂ کرام کی عدالت وثقاہت پر جو اجماع ہے، اور ان کو نقد وبحث اور جرح وتعدیل سے جو ماوراء تصور کیا جاتا ہے، اس کی وجہ "محض عقیدتمندی" نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔ علامہ ابن حجر نے اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی پیش نظر رہے۔

اتفق اهل السنة على ان	حضرات اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ
الجميع عدول ولم يخالف	تمام صحابہ عدول ہیں، اس باب میں
فی ذالك الا شذ وذ من	کوئی اختلاف نہیں ہے سوا مبتدعہ
المبتدعة وقد ذكر الخطيب	کی ایک مختصر سی ٹولی کے، خطیب
فی الكفاية فصله نفيس	نے "کفایہ" میں نہایت نفیس بحث
فی ذالك فقال عدالة الصحابة	اس موضوع پر کی ہے، وہ کہتے ہیں
ثابتة معلومة بتعديل الله	کہ صحابہ کی عدالت وثقاہت تو خ[illegible]
لهم واخباره عن طهارتهم	خدا کی تعدیل کے بموجب ہم[illegible]
واختياره لهم فمن ذالك	ہیں، مثلاً "كنتم خير امة اخ[illegible]

قوله تعالیٰ كنتم خير امة
اخرجت للناس، وقوله و
كذلك جعلناكم امة وسطا
وقوله لقد رضي الله عن
المومنين اذ يبايعونك تحت
الشجرة فعلم ما في قلوبهم
وقوله، السابقون الاولون
من المهاجرين والانصار و
الذين اتبعوهم باحسان رضي
الله عنهم ورضوا عنه وقوله
يا ايها النبي حسبك الله و
من اتبعك من المومنين
وقوله للفقراء المهاجرين
الذين اخرجوا من ديارهم
واموالهم يبتغون فضلاً
من الله ورضواناً وينصرون
الله ورسوله اولئك هم

للناس اور كذلك جعلناكم
امة وسطا اور لقد رضي الله
عن المومنين اذ يبايعونك
تحت الشجرة فعلم ما في
قلوبهم اور السابقون
الاولون من المهاجرين و
الانصار والذين اتبعوهم
باحسان رضي الله عنهم
ورضوا عنه اور يا ايها النبي
حسبك الله ومن اتبعك
من المومنين اور للفقراء
المهاجرين الذين اخرجوا
من ديارهم واموالهم يبتغون
فضلاً من الله ورضواناً و
ينصرون الله ورسوله
اولٰئك هم الصادقون ۵
غرض بہت سی آیتوں میں یہ ذکر

من جميع المخالفين بعدهم
والمعدلين الذين يجيئون من
بعدهم، هذا مذهب كافة
العلماء ومن يعتمد قوله ثم
روى بسنده الى ابي زرعة
الرازي قال اذا رأيت الرجل
ينتقص احدا من اصحاب
رسول الله فاعلم انه زنديق
وذالك ان رسول الله حق
والقران حق وما جاء به حق
وانما ادى الينا ذالك كله
الصحابة وهؤلاء يريدون
ان يجرحوا شهودنا ليبطلوا
الكتاب والسنة والجرح
بهم اولى وهم زنادقة
والاحاديث الواردة في
تفضيل الصحابة كثيرة

ایسے آدمی کو دیکھو جو صحابہ میں سے
کسی کی تنقیص کر رہا ہو تو سمجھ لو کہ
وہ زندیق ہے اور اس پر اپنا ایمان
رکھو کہ رسول حق ہے، قرآن حق ہے
اور جو کچھ وہ لایا ہے برحق ہے اور
یہ کہ وہ تمام لوگ جو ان پر جرح
کرنا چاہتے ہیں، وہ کتاب وسنت
کو باطل کرنا چاہتے ہیں، اور بہتر یہ
ہے کہ خود ان پر جرح کی جائے،
وہ سب کے سب زنادقہ ہیں، اور صحابہ
کی تفضیل میں احادیث بھی بہت کثرت
سے وارد ہیں، مثلاً ترمذی اور ابن
حبان نے اپنے "صحیح" میں عبداللہ
بن مغفل کی حدیث ذکر کی ہے کہ
میرے اصحاب کو اپنے خرافات کی
آڑ نہ بناؤ، جو ان سے محبت کرتا
ہے وہ میری وجہ سے ان سے محبت

الصادقون الیٰ قوله انك
رؤف رحیم فی ایات کثیرة
یطول ذکرها واحادیث
کثیرة یکثر تعدادها وجمیع
ذلك یقتضی القطع بتعدیلهم
ولا یحتاج احد منهم مع تعدیل
الله له الیٰ تعدیل احد من
الخلق علیٰ انه لو لم یرد من
الله ورسوله فیهم شیٔ مما
ذکرناه لاوجبت الحال التی
کانوا علیها من الهجرة والجهاد
ونصرة الاسلام، وبذل المهج
والاموال وقتل الاباء و
الاولاد والمناصحة فی الدین
وقوة الایمان والیقین القطع
علیٰ تعدیلهم والاعتقاد
ولنزاهتهم وانهم افضل

موجود ہے کہ صحابہ عادل ہیں، نقہ ہیں
ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
اللہ کی تعدیل کے بعد اب وہ کسی
تعدیل کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اگر
خدا ورسول کی طرف سے یہ کچھ نہ
وارد ہوتا جو ہم نے ذکر کیا ہے پھر
بھی ان کے گراں قدر خدمات، ہجرت
جہاد، اسلام کی مدد، جان کی قربانی
مال کی قربانی آباؤ واولاد کا قتل
راہ اسلام میں مناصحۃ، فی الدین
قوت ایمان، اور عزم وثبات، یہ
سب اسپر شاہد عادل ہیں کہ وہ عادل
ہیں اور وہ اپنے تمام مخالفین سے
اعلیٰ وافضل ہیں، اور ان کے بعد
ان پر جرح کرنے پر آمادہ ہیں،
یہی تمام علماء کا مسلک ہے، ابو
زرعہ رازی کہتے ہیں کہ جب تم کسی

حبدا للمنتقص على هذا
القدر ففيه مقنع [1]

ابن حجر کی یہ بات بہت زیادہ وزن رکھتی ہے کہ اگر قرآن و حدیث میں یہ کچھ نہ بھی وارد ہوتا تو بھی ان کی عدالت و ثقاہت غیر مشتبہ اور شک و شبہات سے پاک تھی، اس لئے کہ جس جماعت نے ہجرت کے مصائب برداشت کئے ہوں، وطن عزیز کو چھوڑا ہو، عزیز و اقربا کو چھوڑا ہو، جہاد کیا ہو، اپنی جانیں قربان کی ہوں، اپنا مال راہ خدا میں لٹایا ہو، غرض طرح طرح کے آفات و مصائب کا مقابلہ کیا ہو، اور یہ سب محض دین کے لئے کیا ہو، تو ان کو اگر عادل نہیں مانیئے گا، تو کسے مانیئے گا، بلا تشبیہ یوں سمجھئے کہ مہاتما گاندھی جی کے جو حالات "نیشنلسٹ اور کانگرسی" حضرات کے سامنے ہیں، ان کی بنا پر کون ہے جو انہیں غیر عادل قرار دے، اور اگر ایسا کرے، تو یقیناً وہ نیشنلسٹ نہیں، کانگرسی نہیں، اسی طرح بلا تمثیل صحابہ کے حالات و واقعات کی موجودگی میں، کون ہے جو ان پر زبان طعن دراز کرے اور اگر کرے تو وہ مسلمان نہیں، بقول ابن حجر کے زندیق ہے، اور پھر قرآن و حدیث کی توفیق مستزاد۔ "نر اظن نہیں،" بلکہ آسمانی مہر ہے، اور اس

---

[1] مقدمۃ الاصابہ فی تمییز الصحابہ صفحہ ۱۱ ر ۱۲ د ۱۳ د ۱۴ ر ۱۵ ر

من اولها على المقصود ماروى
الترمذى وابن حبان فى
صحيحه من حديث عبدالله
بن مغفل قال رسول الله
الله الله فى اصحابى لا تتخذو
هم غرضاً فمن احبهم فبحبى
احبهم، ومن ابغضهم ببغضى
ابغضهم ومن اذاهم فقد
اذانى ومن اذانى فقد اذى
الله ومن اذى الله فلا يوشك
ان ياخذهٗ قال عبدالله بن
هاشم الطوسى حدثنا وكيع
قال سمعت سفيان يقول
فى قوله تعالىٰ قل الحمد لله
وسلام علىٰ عباده الذين
اصطفىٰ قال هم اصحاب محمد
والاخبار فى هذه كثيرة

کرتا ہے جو ان سے بغض رکھتا ہے!
وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان
سے بغض رکھتا ہے، جس نے ان کو
تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف
پہونچائی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی
اس نے اللہ کو اذیت دی، تو اس سے
بلاشبہ مواخذہ کیا جائے گا، عبداللہ
بن ہاشم طوسی کہتے ہیں، کہ مجھ سے
وکیع نے کہا کہ میں نے سفیان سے
سنا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "اے
رسول کہدے کہ ان بندوں پر سلامتی
ہو جو پاک وصاف کئے گئے، تو کہا
کہ وہ اصحاب محمد ہیں، جن کو اللہ نے
پاک وصاف کیا، اور اس جگہ
وہی مراد ہیں، اس موضوع پر اور
احادیث بھی بہت زیادہ مروی
ہیں، لیکن اس جگہ اتنا کافی ہے.

بھی نظر ڈالیئے کہ صحابہ جب روایت کرتے تھے، تو اپنی ذمہ داری کا وہ کس قدر خیال رکھتے تھے، اس لئے کہ ان کے سامنے یہ وعید بھی تھی کہ

من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار۔	مجھ پر جو دیدہ و دانستہ دروغ بیانی کرے اسے چاہیئے کہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنائے۔

چنانچہ اس حدیث کے پیش نظر وہ حدیث بیان کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور جب بیان کرتے تھے، تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی غلطی نقل قول میں ہو جائے، وہ لرزنے لگتے تھے، کانپنے لگتے تھے، ان کی گھگھی بندھ جاتی تھی، مثلاً حضرت ابن مسعود صحابی جلیل القدر کا یہ واقعہ خاص طور سے غور طلب ہے کہ

عن ابی العمیس عن مسلم البطین عن ابن عمرو الشیبانی قال کنت اجلس الی ابن مسعود، لا یقول قال رسول اللہ، فاذا قال قال رسول اللہ استقلۃ الرعدۃ وقال ھکذا، او	عمرو بن الشیبانی کہتے ہیں کہ میں ابن مسعود کے پاس بیٹھا کرتا تھا، وہ "قال رسول اللہ" کبھی نہیں کہتے تھے، اور جب "قال رسول اللہ" کہتے تھے، تو مارے ڈر کے کانپنے لگتے تھے، اور کہتے تھے کہ رسول اللہ نے" اس طرح فرمایا" یا "ایسا ہی فرمایا" یا "تقریبا

نحو ذا او قریب من ذا، او   ایسا ہی فرمایا، یا، یا، یا،

او، [1]

ڈر کا یہ عالم تھا، اپنی ذمہ داری کا یہ احساس تھا، رسول اکرم پر غلط گوئی سے بچنے کی اس درجہ احتیاط تھی، لیکن کرتے کیا، ؟ امت تک رسول کا "اسوہ حسنہ" بھی پیش کرنا ضروری تھا، اس لئے حدیث بیان کرتے تھے، لیکن پورے حزم و احتیاط کے ساتھ اب اگر اس کے بعد بھی ان کی عدالت و ثقاہت غیر مشتبہ ہے تو مجھے نہیں معلوم دنیا میں عدالت و ثقاہت کا معیار کیا ہے ؟

اس جگہ ایک اور خیال کی تصحیح بھی ازبس ضروری ہے کہ احادیث کی تدوین و اشاعت اور ضبط و کتابت کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا، یہ سلسلہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا چنانچہ طاہر جزائری کہتے ہیں، کہ لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ عصر صحابہ اور اوائل عہد تابعین میں سوائے قرآن کے اور کچھ ضبط کتابت میں نہیں آیا تھا، حالانکہ ثبوت اس کا بھی موجود ہے، کہ کتابت کا کام خود عہد نبوی اور عصر صحابہ میں شروع ہو گیا تھا، چنانچہ زید بن ثابت نے "علم الفرائض" میں ایک کتاب تالیف کی تھی، اور بخاری نے اپنی صحیح"

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابن مسعود الامام ربانی ۱۲

میں وہ واقعہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابوہریرہ نے عبداللہ بن عمرو کو اپنے سے افضل بالحدیث اس لئے تسلیم کیا کہ وہ لکھ لیتے تھے، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کتابت کا جو حکم ابوبکر بن حزم کو دیا تھا، وہ خود جلیل القدر تابعی تھے، اور وہ صحابہ میں سے سائب بن یزید، عباد بن تمیم، اور عمر بن سلیم الزرقی اور عمرۃ اور خالدہ بنت انس سے حدیث روایت کرتے تھے، اور اس حکم کے بعد انہوں نے اسے لکھ لیا[2]، اسی طرح زہری بھی جلیل القدر تابعی ہیں، انہوں نے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے حدیث لکھی اور مدون کی، زہری صحابہ میں سے ابن عمر، سہل بن سعد، انس بن مالک، محمود بن الربیع، سعید بن المسیب، اور امامۃ ابن سہل سے اور دیگر صحابہ اور کبار تابعین سے روایت کرتے ہیں ان شاگردوں میں بھی بڑے بڑے اساطین علم و فضل نظر آتے ہیں، مثلاً معمر، اوزاعی، لیث، مالک اور ابن ابی ذئب وغیرہ[3]، غرض یہ معاملہ تو بالکل صاف ہے کہ حدیث کی اشاعت اور کتابت کا کام عہد نبوی میں کچھ کچھ، اور عہد صحابہ اور عصر تابعین میں باقاعدہ شروع ہو گیا تھا، آگے چل کر ایک نہایت دردناک منظر پیش کیا ہے، جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ

---

[1] و [2] و [3] توجیہ النظر"

"صحابہ کے بعد ہر ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کر کے جرح
وتعدیل کے مسلخ میں لائے جاتے ہیں، اور ان کی پوست
کشی کی جاتی ہے، بہت سے خبیث، کذاب اور دجال
وغیرہ قرار دیئے جاتے ہیں، اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت
ہوتی ہے، اور یہ سب کچھ محض ظن زدہ تخمین"

اگر منکرین حدیث اس جرح وتعدیل کے نتائج کو جو قانون شہادت کی سخت سے سخت شرائط کو پوری کرتے ہیں، محض ظن زدہ تخمین، قرار دیتے ہیں، تو پھر منکرین، قرآن کی زبان کیسے بند کریں گے شک جب بڑھتا ہے، تو مرض بن جاتا ہے، اور وہم کہلاتا ہے، جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں،

مقالہ نگار صاحب "ظن" سے بہت خفا ہیں، فرماتے ہیں "حدیثیں باتفاق ائمہ حدیث تمام تر ظنی ہیں .... اور اللہ تعالیٰ ظن کا روادار نہیں..... ان یتبعون الا الظن .... وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا" صفہ ١٧١ جامعہ ماہ ستمبر

اگر ہر "ظن" قابل نفرت اور ظن مطلقاً ممنوع وملعون ہے تو خدا معلوم آیات ذیل کی جیراجپوری تفسیر کیا ہوگی،

وقال للذی ظن انہ ناج منہما   یہاں حضرت یوسف کے "ظن" کا ذکر ہے

یہ بڑھتی جائے گی، جب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا
من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔ والسلام
علیٰ من اتبع الھدیٰ

(جامعہ۔ اپریل ۳۲ء)

استایئس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا۔	یہاں عموماً حضرات انبیاء کے "ظن" کا بیان ہے۔
وظن داؤد انما فتناہ۔	یہاں حضرت داؤدؑ کے "ظن" کا تذکرہ ہے
فظن ان لن نقدر علیہ احد۔	یہاں "ظن" کی نسبت حضرت یونسؑ کی جانب کی گئی ہے
الی ظننت انی ملاق حسابیہ۔	یہاں "ظن" کو ایک مومن جنتی کی جانب منسوب
لو لا اذ سمعتموہ ظن المومنون والمومنات۔	یہاں "ظن" کا انتساب مومنین ومومنات کی طرف ہے۔
خاشعین الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم۔	یہاں مومنین خاشعین کے "ظن" کی حکایت کی گئی ہے۔

مقالہ نگار صاحب کے اصول پر تو یہ تمام ظنون وظنیات یکسر قابل نفریں ہونے چاہیئے۔

ساتواں اعتراض اور زیادہ اہم ہے "کہ قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے اور حدیث تفریق"۔

منکرین حدیث سے گزارش یہ ہے کہ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن موجودہ زمانہ میں تو "اہل قرآن" برعکس معاملہ پیش کر رہے ہیں، اچھا خاصا سکون تھا، اطمینان تھا، سب لوگ حدیث کو مانتے چلے آ رہے تھے اور دفعتہً ان ارشادات عالیہ نے تفریق پیدا کر دی ہے، اور

مامون کا عہد حکومت !

جدید عہد حضارت اور نشر علوم کے ذرائع سے مصر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے، جہاں اس کا دامن تہذیب مغرب سے اثر پذیر ہونے کے باعث داغدار ہے وہاں اس کا پہلو نہایت روشن ہے کہ اس نے ایک مختصر مدت میں علمی و ادبی اعتبار سے نمایاں شہرت حاصل کر لی ہے۔

جدید مصر کے مطبوعات اپنی تحقیق و تدقیق، کاوش جستجو۔ اور غور و فکر کے اعتبار سے نہایت ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اگرچہ ان کی تصنیفات میں کبھی کبھی، کہیں کہیں، مستشرقانہ تحقیق انیق۔ کے نمونے بھی ملجاتے ہیں، جو قابل افسوس ہیں۔

پیش نظر صفحات ایک جدید الشیوع کتاب "عصر المامون" سے ترجمہ کئے گئے ہیں، اصل کتاب مامون اعظم کی تاریخ پر ہے، اور اس ضمن میں خلافت راشدہ سے لے کر عہد ہارون رشید تک کے تمام علمی و ادبی و معاشرتی، انقلابات و تغیرات پر تحقیق اور تدبر سے بحث کی گئی ہے پھر اس کے بعد بسط و تفصیل سے مامون کی سیرت، اخلاق و عادات و شمائل، جود و سخا، شجاعت و بسالت کے نمونے اور کارنامے پیش کئے ہیں، اور پھر عہد مامون کے سیاسی و معاشرتی حالات اس عہد کے

علم وفن، علمی وادبی ترقیاں، محاصل حکومت کے تغیرات، غرض ان تمام چیزوں کو فاضل مؤلف ڈاکٹر احمد فرید رفاعی نے عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے، اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اردو داں حضرات اس سے محروم رہیں۔ ذیل میں اس کتاب کے بعض مباحث کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

علمی ترقیاں

بیت الحکمۃ کی تاسیس اگرچہ ہارون رشید کے عہد حکومت میں ہوگئی تھی، اور خاندان برامکہ کے اہل علم اور قدرشناس علم افراد نے اس میں یونانی، فارسی، اور ہندی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا لیکن مامون کے عہد حکومت میں اس بیت الحکمۃ نے عروج وارتقا کے تمام مراحل طے کر لئے سہل بن ہارون اس بیت الحکمۃ کا منتظم اعلیٰ تھا۔

یحیٰی بن ابی منصور موصلی، محمد بن موسیٰ خوارزمی اور بہت سے ارباب علم وکمال مامون کے عہد حکومت میں اس کے "دار الحکمۃ" اور "بیت الحکمۃ" میں مصروف کار تھے، جن کی فن نجوم میں مہارت ارصاد میں تفتیت ان کے نقشے، اور ان کی زیجیں اب تک مشہور عالم ہیں۔

مامون نے صقلیہ کے مسیحی فرماں روا کو پیام بھیجا کہ وہ اپنا موروثی

اسطرلاب استعمال کیا اور جو طب، علوم حیوانات و نباتات اور جڑی بوٹیوں کے فن میں مہارت تامہ کے علاوہ ریاضیات وغیرہ میں بھی بہت بڑے مرتبے کا مالک ہوا ہے،

مامون کے عہد حکومت میں کتابوں کی بہت زیادہ کثرت تھی، یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، کہ کیا مامون نے بھی ان کتابوں سے فائدہ اٹھایا؟ اور مامون کی اس گرمی سے کیا خاص فائدہ پہنچا مامون کے عہد حکومت کی علمی حالت کیا تھی؟ مشاہیر رجال اور تصانیف کون کون ہیں!

مامون کے افادہ کا جہاں تک تعلق ہے عام اس سے کہ وہ کتابیں یونانی سے ترجمہ کی گئی ہوں، یا فارسی سے، یا کسی اور زبان سے، اس پر ہم اس باب میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں، جس میں مامون کی شخصیت کی تحلیل کی گئی ہے، اور جہاں اس کی زندگی پر بہ حیثیت طالب علم کے، ولی عہد کے، خلیفہ کے عالم و سیاسی کے، اور مذہبی شخصیت کے بحث کی گئی ہے،

عہد مامونی کے علمی زندگی کا خاکہ اس عہد کے رجال و مؤلفات کی تفصیل سو سطور ذیل میں وہی مواد پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے مامون کو کتابیں جمع کرنے کا شوق کیوں ہوا؟ اور خزائنِ روم سے اس نے بیت الکتب خانہ جبراً کیوں منگوایا؟ اس کے متعلق ابن

کتب خانہ جو ہر طرح کے علم و فن کی کتابوں سے لبریز تھا، فوراً دار الخلافت روانہ کردے، یہ پیام پاکر، حاکم صقلیہ تذبذب میں پڑ گیا، ایک طرف مامون کی سطوت وہیبت، اسے لرزہ براندام کررہی تھی، دوسری طرف یہ "خزانہ عامرہ" چھوڑنے پر طبیعت نہیں آمادہ ہوتی تھی، آخر کار اس نے یہ مسئلہ اپنی حکومت کے اعاظم رجال کے سامنے پیش کیا، ان میں سے ایک نے کہا، کہ علوم فنون کا یہ خزانہ فوراً دار الخلافت روانہ کردیجئے ایک سال بھی نہیں گذرے گا کہ ان علوم کی برکت آپ دیکھ لیں گے ان علوم کے ساتھ ہی عقاید و خیالات کو تباہ کرنے والے وہ جراثیم بھی جائیں گے جو ایک سال کے اندر ہی اندر اس قوم کو پارہ پارہ کردینگے شیخ کرد علی فرماتے ہیں، کہ مامون نے اپنے عہد حکومت کے بعض حکماء کو طلب کیا، اور ان کو ایک نقشہ بنانے کا حکم دیا، جو اسی کے نام سے منسوب ہے اس نقشہ میں افلاک و نجوم، برو بحر، زرخیز و ناکارہ زمین، مساکن امم و مدن سب ہی کی پوری پوری تصویر کشی کی گئی ہے، اس کو جغرافیہ بطلیموس، اور جغرافیہ ماریوس سب پر فضیلت دی جاتی ہے۔

زہری کا بیان ہے کہ عراق کے ستر فلسفی اس امر پر مامور تھے، کہ وہ عمال دولت کی مدد کریں، اور جن جن ممالک پر عباسی پرچم لہرارہا تھا ان کی نشان دہی کریں، عرب میں فزاری پہلا شخص تھا، جس نے

ابی اصبعہ اپنی طبقات میں یحیٰی بن عدی سے روایت کرتے ہیں کہ مامون نے کہا میں نے ایک خواب دیکھا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک آدمی بصد دبدبہ وسطوت اس مقام پر بیٹھا ہے، جہاں میں بیٹھا کرتا تھا، اسے دیکھ کر میرے دل میں اس کی عظمت وہیبت بیٹھ گئی، مجھے بتلایا گیا کہ وہ ارسطا طالیس ہے، پھر میں نے اپنے دل میں کہا، کہ مجھے اس سے کچھ پوچھنا چاہیئے، میں نے اس سے پوچھا حسن کیا ہے؟ اس نے جواب دیا جسے عقل اچھا سمجھے، میں نے پوچھا پھر؟ اس نے جواب دیا جسے شریعت مستحسن سمجھے، میں نے پوچھا پھر؟ اس نے کہا جمہور جسے پسند کریں، میں نے سوال کیا پھر؟ اس نے کہا پھر کچھ نہیں،

روم سے کتب فلسفہ وغیرہ منگوانے کا سب سے بڑا سبب یہی خواب تھا، جس کے سبب مامون اور شاہ روم میں خط وکتابت ہوئی، اور بالآخر مامون اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا، پھر مامون نے شاہ روم سے ان علوم قدیمہ کی اشاعت اور ترجمہ کی اجازت چاہی جس کی کچھ تامل کے بعد اس نے اجازت دے دی، حجاج بن مطر، ابن لطریق اور سلم صاحب بیت الحکمۃ کو طلب کیا گیا، جنھوں نے اس کتب خانہ سے حسب مقصد وضرورت کتابیں ترجمہ کیں، حسنین ابن اسحاق کو بھی جو ایک نوجوان انشاپرداز تھا، مامون نے طلب کیا اور نقل

ترجمہ کا کام اس کے سپرد کر دیا، کہ وہ حکماء یونان کی کتابوں کا ترجمہ کرے اور دوسروں کے ترجمہ کی اصلاح کرے یہ ذمہ داری اس نے قبول کر لی،

جو کتاب یونانی سے یا کسی اور زبان سے عربی میں ترجمہ کی جاتی تھی، مامون اس کے برابر سونا تلوا کر دیا کرتا تھا،

قاضی صاعد بن احمد اندلسی کا قول ہے کہ صدر اسلام میں اہل عرب نے علوم وفنون کی طرف توجہ نہیں کی، ان کی دلچسپی کا مرکز ان کی زبان تھی یا احکام شریعت، ہاں طب اس سے مستثنیٰ ہے وہ البتہ اس زمانہ میں بھی ان کے اندر موجود تھی، اور اس کا ہونا ناگزیر تھا، اس لئے کہ اس کا تعلق اہم حوائج زندگی سے تھا، تقریباً یہی کیفیت خلافت بنی امیہ میں رہی لیکن جب تخت خلافت بنو ہاشم میں آیا، تو اس خاندان میں سب سے پہلے جس شخص نے اس طرف اپنی توجہ مرکوز کی وہ خلیفہ ابوجعفر منصور تھا، وہ فقہ کے علاوہ علوم فلسفہ و نجوم میں دسترس رکھتا تھا، پھر جب سریر خلافت پر مامون اعظم جلوہ آرا ہوا تو اس نے اپنے جد محترم کی دیرینہ تمنا پوری کر دی، وہ جب علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوا، تو اس نے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس، وغیرہ کی کتابوں کے نہایت شستہ اور صحیح زبان میں ترجمے کئے اور جب ترجمے اشاعت پذیر ہوئے تو اس نے

جس کے آغاز میں انہوں نے فرمایا تھا، کہ عہد آل عباس میں فن ترجمہ کی تاریخ تین ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

پہلا دور ابو جعفر منصور کی خلافت سے شروع ہوتا ہے اور ہارون رشید پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، جس کی مدت ۱۳۶ھ سے ۱۹۳ھ تک سمجھنی چاہیئے مترجمین کا طبقہ اول یہی ہے، جس میں قابل ذکر اسماء یہ ہیں، یحییٰ بن بطریق، مترجم مجسطی (عہد منصور میں) اور جورجیس بن جبرئیل طبیب، عبداللہ بن مقفع جس نے ادبی کتابوں کے علاوہ ارسطو کی بعض منطقی کا ترجمہ بھی کیا تھا، یوحنا ابن ماسویہ جو ہارون رشید کے زمانہ حکومت میں تھا اور متوکل کے زمانہ تک زندہ رہا، اسے طب کی کتابوں سے بہت دلچسپی تھی، سلام الابرش جس کی برامکہ نے خاص طور سے پرورش کی تھی اور سہیل المطران،

دوسرا دور مامون کے عہد ۱۹۷ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۳۰۰ھ ہجری پر ختم ہو جاتا ہے، مترجمین کا یہ طبقہ ثانیہ ہے، اس عہد کی نمایاں شخصیتیں یہ ہیں، یوحنا بن بطریق، حجاج بن مطر، قسطا بن لوقا بعلبکی، عبدالمسیح بن ناعمہ حمص، حسنین بن اسحاق، اسحاق بن حسنین، ثابت بن قرۃ صابی اور حبیش بن الحسن جسے حبیش ام بن رخت حسنین بھی کہتے ہیں اس عہد میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں، ان میں زیادہ تر بقراط، جالینوس اور

لوگوں کو ان کتابوں کے پڑھنے پر مائل کیا،

مامون حکمار کی صحبت بہت پسند کیا کرتا تھا، علمار کے علمی مناظروں سے بھی اسے بہت دلچسپی تھی، وہ جانتا تھا کہ اہل علم ہی کی وہ جماعت ہے، جس کا شمار برگزیدہ نفوس میں ہو سکتا ہے، اس لئے کہ یہی وہ گروہ تھا جس نے اپنی ساری توجہ علم پر صرف کر دی تھی، اور ان ترغیبات سے بے نیاز تھا، جو لوگوں کو چین و ترک کی طرف لے جاتی تھیں،

بہر حال مامون کے نزدیک فلسفہ و منطق کی یہ اہمیت تھی، جس کا زبردست ثبوت اس کے عہد کے تراجم اور مؤلفات ہیں، ایک خیال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مامون قیاس عقل کی طرف زیادہ مائل تھا اور مذہب اعتزال نے اس پر اپنے نقوش قایم کر لئے تھے، آگے چل کر اس موضوع پر ہم مفصل گفتگو کریں گے، یہاں یہ تو بہر حال ثابت ہو گیا کہ مامون نے ترجمہ و تالیف کی سرپرستی نہایت شاہانہ انداز سے کی بالخصوص مؤلفات ارسطو کا ترجمہ اس عہد کا خاص کارنامہ ہے اس قسم کی تالیفات کے تراجم سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علم کلام اور جدید فلسفۂ افلاطونی کی بنیاد پڑ گئی۔

رفتار نقل و ترجمہ استاد سنتلانہ نے جامعہ مصر میں ایک لیکچر "فلسفہ کے مذاہب کی تاریخ" پر دیا تھا

ارسطو کی کتابیں تھیں، کچھ کتابیں افلاطون کی بھی ترجمہ ہوئیں، باقی انہی کتابوں کے حواشی شروح اور تفاسیر ہیں،

تیسرا دور ۳۰۰ھ چوتھی صدی ہجری کے وسط تک رہتا ہے دور ثالث کے مترجمین میں متی بن یونس ہیں جن کی تاریخ وفات مجہول ہے صرف یہ معلوم ہے کہ ۳۲۲ہجری سے ۳۳۰ ہجری تک وہ بغداد میں تھے پھر سنان بن ثابت بن قرہ یحییٰ بن عدی، ابو علی بن زرعہ، ہلال بن ہلال حمصی اور عیسیٰ بن شہر بخت ان لوگوں نے زیادہ تر ارسطو کی منطقی اور طبیعی کتابوں کا ترجمہ کیا شروح و حواشی میں اسکندر اور یحیی نحوی وغیرہ نے بڑا نام پیدا کیا،

بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد حکومت کی علمی زندگی کا ایک خاکہ ہم دوسرے ابواب میں پیش کر چکے ہیں اب اس جگہ ہمیں مامون اعظم کے عہد حکومت کے مشاہیر علم و فضل کے اسما پیش کرنے چاہئیں۔ عام اس سے کہ وہ علم الافلاک کے ماہر ہوں، یا منطق کے اس لئے ہم نے ابن ندیم کی الفہرست اور طبقات الاطبا ابن ابی اصیبعہ اور کتاب اخبار الحکما للقفطی وغیرہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے اب نام سنیئے کام کی تفصیل کچھ آچکی ہے کچھ آگے آئے گی،

احمد بن محمد بن کثیر فرغانی، ماہر علم نجوم، بختیشوع جورجیش، جبرئیل

بن بختیشوع جبرئیل، حارک حسن بن سہل بن نوبخت۔ ذکریا طیفوری سہل بن شاپور، ابن سہل، سند بن علی، صالح بن بہلہ، ہندی، عباس بن سعید جوہری، عبداللہ بن سہل بن نوبخت، ابوحفص عمر ابن الفرخان موسیٰ بن شاکر اوران کے صاحبزادے، محمد۔ احمد حسن۔ یہ سب منجم تھے، نقطی نے تین او ربیٹوں کا ذکر کیا ہے، جو ہندسہ اور علم الحیل میں کمال رکھتے تھے، اور موسیٰ بن اسرائیل۔ ماشاء اللہ منجم یہودی میخائیل بن ماسویہ یحیٰی بن ابی منصور، یعقوب بن اسحاق اور ابن کے یگانۂ روزگار شاگرد جسنویہ۔ نفطویہ سلمویہ۔ جمویہ۔ احمد بن طیب۔ یوحنا بن بطریق، یوحنا بن ماسویہ نصرانی ابوقریش المعروف۔ عیسیٰ صید لانی، وغیرہ مثلاً آل ثابت وہاسرجویہ وآل الکرانی وابن دہن ہندی مدیر بیمارستان، برامکہ ابن ندیم کا قول ہے کہ یہ شخص سنسکرت سے عربی میں کتابوں کے ترجمہ کیا کرتا تھا، اور منکہ طبیب ہارون رشید، یہ بھی سنسکرت سے عربی میں تراجم کرتا تھا۔ خیر۔ اب کہاں تک یہ طویل فہرست پیش کی جائے۔ اس فہرست کے علاوہ اور بہت سے قابل ذکر اسماء ہیں جو بیشمار ہیں، لہذا انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے،

اب ان افاضل میں سے اگر ہم ایک ایک کے فضائل وخصوصیات حالات وسوانح بیان کرنے لگیں، تو ایک اچھی خاصی "معجم" ہوجائے

اور اگر کچھ نہ لکھیں تو عہد مامونی کا یہ رقع نامکمل رہتا ہے، بعض بر سبیل تمثیل نہ
بر بنائے انتخاب کسی اور جگہ جبرئیل بن بختیشوع اور بعض جلیل القدر
لوگوں کے کچھ حالات لکھدیں گے،

(ج) کتابیں

ذیل میں ہم ان کتابوں کی فہرست پیش کرتے ہیں، جو یونانی، فارسی، سنسکرت، قبطی، عبرانی، لاطینی، اور نبطی زبان سے اس عہد میں ترجمہ ہوئیں، یہاں دلی سپاس کے ساتھ اس کا اعتراف ضروری ہے کہ اس فہرست کے مرتب کرنے میں تراجم الحکما طبقات الحکما، ابن ندیم، اور التمدن الاسلامی سے بڑی مدد ملی ہے۔

سب سے پہلے ہم یونانی کتب فلسفہ و ادب کا تذکرہ کرتے ہیں۔

کتب افلاطون۔

۱	کتاب السیاسہ	مترجم حنین بن اسحاق
۲	" المناسبات	" یحیٰی بن عدی
۳	" النوامیس	" حنین و یحیٰی
۴	" طیماوس	" ابن البطریق تصحیح حنین نے کی
۵	مکتوب افلاطون بنام افرطن	" یحیٰی بن عدی

۶ کتاب التوحید   مترجم یحیی بن عدی

۷ " الحس واللذة   " " " "

۸ " اصول الہندسہ   " قسطا بن لوقا

کتب ارسطو:-

۱ قاطیغوریاس (اقوال)   مترجم حنین بن اسحٰق

۲ کتب العبارۃ   مترجم حنین نے سریانی میں اور اسحٰق نے عربی میں ترجمہ کیا۔

۳ کتاب البرہان   اسحٰق نے سریانی میں و متی نے عربی میں ترجمہ کیا

۴ کتاب الجدل   مترجم یحیٰی

۵ تحلیل القیاس   مترجم یثادورس، اصلاح حنین نے دی۔

۶ کتاب المغالطات او الحکمۃ الموہمۃ   ابن ناعمہ اور ابو بشر نے سریانی میں اور یحیٰی نے عربی میں ترجمہ کیا

۷ الخطابۃ   مترجم اسحاق و ابراہیم بن عبد اللہ

۸ کتاب الشعر   ابو بشر نے سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا

۹ " السماع الطبیعی   مترجم ابو روح صابی و حنین و یحیٰی و قسطا و ابن ناعمہ

۱۰ " السماء والعالم   مترجم ابن البطریق، حنین نے اصلاح دی

۱۱	کتاب الکون والفساد	اسحاق اور دمشقی نے عربی میں ترجمہ کیا
۱۲	″ الآثار العلویہ	مترجم ابوبشر ویحییٰ
۱۳	″ النفس	″ اسحاق
۱۴	″ الحس والمحسوس	″ ابوبشر متی بن یونس
۱۵	″ الحیوان	″ ابن البطریق
۱۶	″ الحروف او الالہیات	″ اسحٰق ویحییٰ، حنین ومتی
۱۷	″ الاخلاق	″ اسحاق
۱۸	″ المرآۃ	″ حجاج بن مطر
۱۹	″ اثو موجیا	″ ″ ″

کتب ارسطو کی متعدد شرحیں اور تعلیقیں بھی لکھی گئیں، اور یہ سلسلہ ... تک جاری رہا۔ اس سلسلہ میں قابل ذکر ثاؤفرطس، دیدوخس برقلس اسکندر، افرودیسی فرفوریوس، امونیوس۔ تامسطیوس، نیقولاوس فلوطرخس اور یحییٰ نحوی ہیں،

ان میں سے بعض کے شروح وتعلیقات کے علاوہ مولفات بھی ... جو تمام تر فلسفہ اور اس کے متعلقات پر ہیں بہت سی ایسی کتابیں ہیں جن کا عربی میں ترجمہ تو ہوا ہے، لیکن ان کے مترجم لامعلوم ہیں، ابن ندیم نے الفہرست میں ان کا تذکرہ کیا ہے لیکن ہم چھوڑتے ہیں۔

جالینوس کی طبی کتابوں کے علاوہ فلسفہ اور ادب کی بعض کتابیں بھی ذکر کی جاتی ہیں، مثلاً "کتاب" مایعتقدہ رایا" جس کا ترجمہ ثابت نے کیا ہے، اور" تعریف المرء عیوب نفسہ" جس کا ترجمہ توما نے کیا ہے۔ اور تصحیح حنین نے اور کتاب الاخلاق جس کے حبیش مترجم ہیں۔ اور کتاب" انتفاع الاخیار باعدائهم ترجمہ حبیش نے کیا، اور" المحرک الاول لامتحرک" جس کا حبیش و عیسیٰ نے ترجمہ کیا ہے اس کے علاوہ اور بھی کتابیں ملتی ہیں۔

کتب طب

بقراط کی کتابیں۔

۱	کتاب عہد بقراط	مترجم حبیش و عیسیٰ
۲	کتاب الفصول	〃 حنین
۳	〃 الکسر	〃 〃 〃
۴	〃 تقدمة المعرفة	〃 حنین و عیسیٰ بن یحییٰ
۵	〃 الامراض الحادہ	〃 عیسیٰ بن یحییٰ
۶	〃 ابیذیمیا	〃 〃 〃
۷	〃 الاخلاط	〃 〃 〃 〃
۸	〃 قاطیطون	〃 حنین
۹	〃 الماء والهوا	〃 حنین و حبیش

٧	علم ارسطو	مترجم	حبيش الاعسم		
٨	تشريح الرحم	〃	〃		
٩	آراء بقراط و افلاطون	〃	〃		
١٠	العادات	〃	〃		
١١	خصب البدن	〃	〃		
١٢	المنى	〃	〃		
١٣	منافع الاعضا	〃	〃		
١٤	تركيب الادويه	〃	〃		
١٥	الرياضة بالكرة الصغيره	〃	〃		
١٦	〃 〃 الكبيرة	〃	〃		
١٧	الحث على تعليم الطب	〃	〃		
١٨	قوى النفس ومزاج البدن	〃	〃		
١٩	حركات الصدر	〃	اصطفان	مصحح	حنين
٢٠	علل النفس	〃	〃	〃	〃
٢١	حركة العضل	〃	〃	〃	〃
٢٢	الحاجة الى النفس	〃	〃	〃	〃
٢٣	الامتلاء	〃	〃	〃	〃

۱۰ کتاب طبیعۃ الانسان — مترجم حنین وعیسیٰ

کتب جالینوس

جالینوس کی مشہور ترین کتابیں یہ ہیں (۱) کتاب الفرق (۲) الصناع
(۳) کتاب النبض (۴) شفاء الامراض (۵) المقالات الخمس (۶) الاسطقس
(۷) کتاب المزاج (۸) القوی الطبیعۃ (۹) العلل والامراض (۱۰) تعرف علل
الاعضاء الباطنۃ (۱۱) کتاب النبض الکبیر (۱۲) کتاب الحمایات (۱۳) البحران
(۱۴) ایام البحران (۱۵) تدبیر الاصحاء (۱۶) حیلۃ البرء ، ان تمام کتابوں کا
ترجمہ حنین بن اسحاق نے عربی میں کر ڈالا ہے ، کتاب العلل الباطنۃ ، النبض
الکبیر ، تدبیر الاصحا اور حیلۃ البرء کا ترجمہ حنین نے نہیں کیا تو ان کتابوں
کو حبیش نے عربی میں منتقل کر ڈالا ، رہیں باقی کتابیں تو ان کے اور ان
کے مترجمین کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

۱	التشریح الکبیر	مترجم حبیش الاعسم
۲	اختلاف التشریح	" "
۳	تشریح الحیوان الحی	" "
۴	" " المیت	" "
۵	علم ابقراط بالتشریح	" "
۶	الحاجۃ الی النبض	" "

۲۴	المرة والسودا	مترجم اصطفان مصحح حنین
۲۵	علل الصوت	" حنین
۲۶	الحرکات المجهوله	" "
۲۷	افضل الهیات	" "
۲۸	سوء المزاج المختلف	" "
۲۹	الادویة المفرده	" "
۳۰	المولود لسبعة اشهر	" "
۳۱	رداء النفس	" "
۳۲	الذبول	" "
۳۳	قوی الاغذیه	" "
۳۴	التدبیر الملطف	" "
۳۵	مداواة الامراض	" "
۳۶	البقراط فی الامراض الحادة	" "
۳۷	الی تراسوبولوس	" "
۳۸	الطبیب و الفیلسوف	" "
۳۹	کتب البقراط الصحیحه	" "
۴۰	محنت الطبیب	" "

۴۱	افلاطون فی طیماؤس	مترجم حنین و اسحاق
۴۲	تقدمۃ المعرفۃ	״ عیسیٰ
۴۳	الفضلاء	״ ״ و اصطفان
۴۴	صفات الصبی بصرع	״ ابن الصلت
۴۵	الاورام	״ ״
۴۶	الکیموس	״ ثابت وحبیش
۴۷	الادویۃ والادواء	״ عیسیٰ
۴۸	الترياق	״ ابن البطریق

اس کے علاوہ اور بھی کتب طب اور ان کے متعلقات ہیں جن کا صاحب "الفہرست" نے ذکر کیا ہے لیکن مترجمین کے نام نہیں لئے ہیں، لایسقوریدس جسے جہانیاں جہاں گشت کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس نے محض گھاس پات، اور جڑی بوٹی کے خواص معلوم کرنے کے لئے ساری دنیا چھان ڈالی، اس کی بھی ایک کتاب ہے جس کی تاریخ آگے آئے گی۔

۳ کتب ریاضیات۔ نجوم و دیگر علوم

اس جگہ ایک سرسری نظر ہمیں علم نجوم، ہندسہ، حساب، موسیقی، اور میکانیات

پر ڈال لینی چاہیئے۔

کتب اقلیدس جس میں اصول ہندسہ بھی شامل ہے حجاج بن مطر نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور اسحاق بن حنین نے بھی اسے عربی میں منتقل کیا ہے۔ ثابت بن قرہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور یہ کتاب اب تک موجود ہے۔

اقلیدس کی جن کتابوں کے مترجمین گمنام ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ کتاب الظاہرات، کتاب اختلاف المناظر۔ کتاب موسیقی۔ کتاب القسمۃ، کتاب القانون۔ اور کتاب الثقل والخفۃ۔

۲۔ کتب ارخمیدس جو کل دس کتابیں ہیں۔ لیکن مترجمین کے نام نا معلوم ہیں۔

۳۔ ایلومینوس۔ صاحب کتاب المخروطات۔ وکتاب قطع السطوح وقطع الخطوط، والنسبۃ المحدودۃ، والادائر المماسۃ ان کتابوں کے مترجمین کے نام نامی بھی نہ معلوم ہو سکے۔

۴ منالاؤس، صاحب کتاب "الاشکال الکرویہ" واصول الہندسہ اس کتاب کا ترجمہ ثابت بن قرہ نے عربی میں کیا ہے۔

۵ دبطلیموس القلوذی جس کی "مجسطی" مشہور عالم ہے۔ جس کے متعلق گزشتہ ابواب میں کہیں گفتگو ہو چکی ہے۔ اس کی دوسری کتاب "کتاب الاربعۃ" کا ترجمہ ابراہیم بن الصلت نے کیا ہے۔ تصحیح حنین نے کی

اور کتاب "جغرافیہ المعمور وصفت الارض" کا ترجمہ ثابت نے کیا ہے جو بہت خوب ہے بطلیموس کی پندرہ اور کتابیں مشہور ہیں جن کے مترجمین نا معلوم ہیں۔

(۶) ابرخس۔ صاحب کتاب "صناعۃ الجبر ولعیرت بالحدود اور کتاب قسمۃ الاعداد" ان دونوں کے مترجمین بھی گمنام ہیں۔

(۷) ذیوفنطس، صاحب کتاب، صناعۃ الجبر۔ مترجم نامعلوم۔

ریاضیات ہیئت اور زیچ میں اور دوسری بہت سی کتابوں کا تذکرہ ابن ندیم نے کیا ہے، لیکن ان کے مترجمین کا نام اسے بھی نہ معلوم ہو سکا۔ مثلاً ابدن السطرتی کی کتاب "العمل بالاسطرلاب المسطح" اس کے علاوہ ارسطرخس کی کتاب "جرم الشمس و القمر" اور کتاب العمل بذات الحلق اور زیچ بطلیموس کی جدولیں جسے "القانون المسیر" بھی کہتے ہیں اور العمل بالاسطرلاب، ان سب کتابوں کا ترجمہ ثاون اسکندری نے عربی میں کیا ہے۔

علاوہ ازیں یونانی سے فن موسیقی میں بہت سی کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں مثلاً نبقوماخس کی کتاب "الموسیقی الکبیر" اقلیدس کی "موسیقی المنسوب" فیثاغورس کی "مقالات فی الموسیقی" وغیرہ اور کتاب الرمیوس۔ ارسطو کا ان کی "کتاب الالقاع اور کتاب الآلات المصوتۃ المسماتہ بالارغن البوقی

اور الاغن الزہری وغیرہ۔

ارخمیدس کے علاوہ اور بھی میکانکی کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے مثلاً "الحیل الروحانیہ" رفع الاثقال وغیرہ وغیرہ۔

فارسی کتابیں

عہد عباسیہ میں فارسی سے عربی میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں زیادہ آداب واخبار، سیر واشعار اور کچھ نجوم وغیرہ سے متعلق ہیں، ان کتابوں کو آل نوبخت اور علی بن زیادہ تمیمی وغیرہ نے عربی میں منتقل کیا ہے۔ باقی کتابیں یہ ہیں۔

۱	کتاب رستم واسفندیار	مترجم جبلہ بن سالم
۲	بہرام شوس	" " "
۳	خدانیامہ فی السیر	" عبداللہ بن مقفع
۴	کتاب آئین نامہ	" " "
۵	" کلیلہ دمنہ	" " "
۶	" مزدک	" " "
۷	" التاج فی سیرۃ انوشیرواں	" " "
۸	" الادب الکبیر	" " "
۹	" " الصغیر	" " "

۱۰ کتاب الیتیمہ ۔ مترجم نامعلوم

۱۱ کتاب ہزار افسانہ ۔ " "

۱۲ " شہر نیاد مع ابرویز " "

۱۳ " الکاہ نامع انوشروان " "

۱۴ " الدار والصنم الذہب " "

۱۵ " بہرام وترسی " "

۱۶ " الدب والثعلب " "

۱۷ " ہزار داستان " "

۱۸ " سیر ملوک الفرس، متعدد حصوں میں ہے۔ ایک کا ترجمہ محمد بن جہم نے کیا۔ دوسرے کا۔ زادویہ بن شاہویہ نے کیا اور تیسرے کا محمد بن بہرام بن مطیار اصفہانی نے۔

ہمیں فردوسی کے شاہنامہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے جو ۳۸۴ھ میں محمود غزنوی کے لیئے لکھا گیا تھا اور ۶۰،۰۰۰ ہزار بیت پر مشتمل ہے جس میں فارس کی قدیم تاریخ پر بھی نظر ڈالی گئی تھی، اس کتاب کا ترجمہ فتح بن علی بنداری نے نثر میں شاہ عیسیٰ الیوبی کے لیئے کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۶۲۰ھ میں مکمل ہوا تھا، عربوں نے فارسی سے بہت سی تاریخی و ادبی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا، بالخصوص مذاہب قدیم سے متعلق تو متعدد کتابیں عربی

میں منتقل ہوئیں۔

سنسکرت۔

اہل عرب نے سنسکرت سے بے شمار کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا بالخصوص طب، نجوم، ریاضی، قصص، حساب اور تاریخ میں تو بہت سی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔ افسوس کہ ان میں سے اکثر سے ہم اس وقت تہی دامن ہیں،

بات یہ ہے کہ بغداد عہد عباسیہ میں منزل کمال کو پہونچ گیا تھا، وہ علماء۔ اطبا، تجار۔ اور سیاحوں کا مرکز تھا۔ جہاں ہر ملک، وقوم کے لوگ آتے تھے، برامکہ کو ہندوستان کے ویدوں سے خاص مناسبت تھی، چنانچہ کنکہ، بازیگر، قلبرفل، اور سندباذ وغیرہ وغیرہ خاص طور سے ہندوستان سے بغداد میں بلوائے گئے تھے،

عہد عباسی کے اختتام کے بعد بھی جب مسلمانوں نے ادب، طب، لغت یا سیر میں کتابیں لکھیں تو ان میں ہندی کتابوں پر اکثر وبیشتر اعتماد کیا ہے۔ مثلاً اگر آپ ابن سینا کے قانون کا مطالعہ کریں، یا کسی اور طب کی بڑی کتاب کو دیکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب وہ بعض امراض کا ذکر کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہندوستانی ویدا سے یہ کہتے ہیں، یا اس مرض کا علاج اس طرح کرتے ہیں، عقد الفرید اور دوسری ادبی کتابوں

میں بھی ان کے مؤلف ہندوستان کے آداب و اخلاق کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں فلاں بات کے متعلق ایسا ایسا ہے۔

کتب طب

صاحب طبقات الاطبا نے عہد عباسی کے مشہور اطبا و علما ہند کا تذکرہ کیا ہے، جو طب، نجوم، اور فلسفہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے مثلاً کنکہ ہندی جو نہایت بلند حیثیت پر فائز تھا، طب کے علاوہ اسے علم نجوم میں بھی پوری دسترس حاصل تھی، اس کے بہت سے مؤلفات تھے، جن میں سے کتاب النموز فی الاعمار، کتاب اسرار الاوالید، کتاب القرانات الکبیر والصغیر، وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، کنکہ کے علاوہ صہنحل اور باکھر وغیرہ بھی بہت بلند حیثیت علما ہند میں کہتے تھے منکہ ہندی کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے، اب اس کی "شان نزول" بھی سن لیجئے یحی ابن خالد برمکی کے اشارہ پر یہ حکیم ہاروں رشید کے معالجہ کے لئے آیا، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہارون صحت یاب ہو گیا، پھر اس نے منکہ کو متوسلین دولت میں داخل کر لیا، منکہ فارسی خوب جانتا تھا، وہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتا تھا، پھر وہ عربی میں ترجمہ کیجاتی تھیں، صاحب طبقات الاطبا نے اس کا بہت مفصل تذکرہ اپنی "طبقات"

میں کیا ہے؟۔

اس عہد میں صالح بن بہلہ ہندی بھی ایک امتیاز خاص کا مالک تھا یہ ہارون رشید کے عہد حکومت میں عراق آیا اور آتے ہی مشہور ہوگیا ہندوستان کے دوسرے مشہور حکماء واطبا میں ایک شاناق بھی ہے اس کی کتاب کا سنسکرت سے فارسی میں منکہ ہندی نے ترجمہ کیا پھر یحیٰی بن خالد کے حکم سے ابوحاتم بلخی نے عربی میں ترجمہ کیا، پھر مامون کے لئے دوبارہ اس کا ترجمہ عباس بن سعید جوہری نے کیا،

دوسرا مشہور حکیم جودر تھا اس کی بھی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔

وہ طبی کتابیں جو سنسکرت سے عربی میں عہد بنو عباس میں ترجمہ ہوئیں۔ ان کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ لیکن کتب ذیل ان کے علاوہ ہیں،

۱۔	اسماء عقاقیر الہند	منکہ ہند نے ترجمہ کیا
۲۔	کتاب سسرو فی الطب	″ ″
۳	استانکر الجامع	ابن دھن نے ترجمہ کیا
۴	صفوۃ الجح	″ ″
۵	کتاب مختصر الہند فی العقاقیر	مترجم نامعلوم
۶	علاجات الحبالی للہند	″ ″

۷ کتاب روسا الهندیہ فی علاجات النساء مترجم نامعلوم
۸ السکر للہند " "
۹ کتاب التوہم فی الامراض والعلل " "
۱۰ " رائی الہند فی اجناس الحیات وسموہا " "

کتب نجوم وریاضی !

فن ریاضیات وکواکب میں ہندوستان کا بڑا درجہ تھا، ہم کہیں سندہند کا ذکر کر چکے ہیں، اہل عرب کی نظر میں اس کی زیچ فن نجوم میں بڑی اہمیت رکھتی تھی، چنانچہ انہوں نے اس کی پیروی کی، اور اسی نہج پر کتابیں تالیف کیں، اس کے مسلک پر جن لوگوں نے تالیف کی، ان میں محمد بن ابراہیم فزاری حبش بن عبداللہ بغدادی اور محمد بن موسیٰ خوارزمی وغیرہ خاص درجہ رکھتے ہیں، ان میں سے فزاری عربوں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے اسطرلاب استعمال کیا، مسلمانوں میں ہر اس فلکی نے جس نے علم نجوم میں کچھ بھی توسیع کرنی چاہی اس کے لئے ان ہندی علماء کی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا، خواہ اصل سنسکرت میں ہوں، یا پھر عربی کے تراجم۔ اکثر مسلمانوں نے آداب کی تحصیل و تکمیل میں اپنا بڑا وقت صرف کیا جن میں ابوریحان۔ البیرونی تو مشہور روزگار

ہیں۔ انہوں نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی، سارے ہندوستان کو چھان ڈالا ہندیوں کے آداب علوم پر دسترس حاصل کی۔ پھر اپنی مشہور کتاب "الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" تالیف کی، علوم ہندیہ پر ان کی اور متعدد بلند مرتبہ تصانیف ہیں خواہ وہ ترجمہ ہوں یا تصحیح یا تنقید۔

اس باب میں ان کی جو کتابیں ہیں ان کے متعلق وہ فرماتے ہیں میں نے ایک کتاب "جوامع الموجود لخواطر الہنود" علم نجوم میں لکھی جو ۵۵۰ اوراق پر محیط تھی، ارکند کی زیج کی میں نے ترتیب و تہذیب کی، اور اس کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا، اس لئے کہ جو ترجمہ موجود تھا، وہ ناقص تھا، پھر میں نے "مدارین متحدین اور متساوین" پر ایک کتاب لکھی اس لئے کہ یہ خیال اتنا جاری تھا کہ کوئی زیج اس سے خالی ہی نہیں تھی، میں نے ایک کتاب حساب میں بھی لکھی، جس میں ہندوستان کے اہل علم کے طریقہ تعلیم درباب حساب کی کیفیت مندرج تھی، میں نے اس پر بھی لکھا کہ مراتب عدد میں اہل عرب کی رائے اہل ہند سے زیادہ قرین صواب میں تھی، اس کے علاوہ اور متعدد کتابیں لکھیں۔

بیان بالا سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کے حکما نجوم وغیرہ میں اہل علم و رائے تھے، اور مسلمانوں نے ان سے بہت کافی استفادہ کیا۔

ادبی کتابیں

ادبی کتابوں میں سے جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں، ان میں ادب تاریخ، منطق، قصص، اور دل بہلاوے کی کتابیں ہیں، مثلاً کلیلہ دمنہ یہ فارسی سے عربی میں ترجمہ ہوئی، زبان بن عبدالحمید ابن لاحق اور علی بن داؤد نے اس کو نظم کا جامہ بھی پہنایا۔ ۲۔ سندباد کبیر۔ ۳۔ سندباد صغیر ۴۔ کتاب البد۔ ۵۔ کتاب یوذاسف۔ ۶۔ یوذاسف مفرد۔ ۷۔ ادب الہند والصین۔ ۸۔ کتاب بابل فی الحکمۃ۔ ۹۔ کتاب الہند فی قصۃ ہبوط آدم۔ ۱۰۔ کتاب طرق۔ ۱۱۔ کتاب ذبک الہندی فی الرجل والمرأۃ۔ ۱۲۔ کتاب حدود منطق الہند۔ ۱۳۔ کتاب سادیرم۔ ۱۴۔ کتاب الہند القتال والباح۔ ۱۵۔ کتاب بیدبا فی الحکمۃ۔ موسیقی میں بھی ایک ترجمہ ہوئی جس کا سنسکرت میں نام تھا "بیافر" جس کے معنی ہوئے حکمت کے پھل۔ اس کتاب میں راگ اور سُر کے اصول بتائے گئے۔

نبطی کتابیں

یونانی سے عربی میں جن فلسفہ اور طب کی کتابوں کا ترجمہ ہوا، انہیں آپ معلوم کر چکے ہیں، اب ہم ان کتابوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو کلدانی

یانبطی زبان سے براہ راست عربی میں ترجمہ ہوئیں اہم کتابیں یہ ہیں۔ کتاب الفلاحۃ النبطیۃ اپنے موضوع پر۔ یہ کتاب فرد فرید ہے احمد بن علی بن مختار نے عربی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کا فرنگی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اگر عربی میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوتا، تو یہ ضائع ہو جاتی اور اس کے ضیاع سے دنیا کو بڑا نقصان پہونچتا، جیسا کہ اس کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے مؤلف کتاب کہتا ہے۔

میں نے یہ کتاب کسدانی (کسدان۔ کلدان۔ نبط، سب کے معنی ایک ہی ہیں) میں پائی۔ جس کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ "کتاب فلاحۃ الارض و اصلاح الزرع والشجر والثمار و دفع الآفات عنہا" کسدانی لوگ اس کی بڑی حفاظت کرتے تھے۔ کہ کہیں کسی کو اس کتاب کا علم نہ ہو جائے اس کے چھپانے میں وہ اپنی پوری کوشش صرف کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی عنایت سے مجھے اس زبان سے واقفیت ہو گئی، اس طریقہ سے میں کتاب پر دسترس حاصل کر سکا، یہ کتاب ایک فاضل شخص کے پاس تھی، مجھ سے اس نے چھپایا۔ جب مجھے علم ہوا تو میں نے کہا۔ اگر تم نے اس علم کو چشم مردم سے پنہاں رکھا، تو پھر لوگ کا ہے کو کبھی تمہارا ذکر کریں گے۔ اگر کوئی ایسی ہی کتاب کی حفاظت کرے تو وہ کتاب کاہے کو ہوئی پتھر ہوئی۔ بس اس نے تصدیق کی اور مجھے اپنی کتابوں کا پہونچا دیا،

بس میں نے ایک کے بعد ایک کا ترجمہ شروع کر دیا، سب سے پہلے جس کتاب
میں نے ترجمہ کیا وہ دوانائی البابلی کی کتاب تھی جس کا موضوع "معرفۃ
اسرار الفلک والاحکام علی حوادث النجوم" تھا وہ کتاب بھی بڑے مرتبہ
کی ہے، اس کے بعد میں نے اس کتاب "الفلاحۃ" کا ترجمہ کیا۔"

۲۔ کتاب طرد الشیاطین (۳) کتاب السحر الکبیر (۴) کتاب السحر الصغیر
(۵) کتاب دوا علی مذہب النبط (۶) کتاب مذاہب الکلدانیین فی
الصنام (۷) کتاب الاشارۃ فی السحر (۸) کتاب اسرار الکواکب (۹)
کتاب الفلاحۃ الصغیر (۱۰) کتاب فی الطلسمات (۱۱) کتاب الحیاۃ داعوت
فی علاج الامراض (۱۲) کتاب الاصنام (۱۳) کتاب القربین (۱۴) کتاب
الطبیعۃ (۱۵) کتاب الاسماء ان میں سے اکثر کتابیں ابن وحشیہ صاحب
کتاب الفلاحۃ نے ترجمہ کی ہیں۔

عبرانی۔ لاطینی اور قبطی کتابیں

یہود کے علوم و آداب بہت کثرت سے عربی میں ترجمہ ہوئے اب ان
میں سے اکثر چیزیں ضائع ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ مواد تو مل ہی
جاتا ہے، عبرانی زبان سے توراۃ کے اسفار کو سعدیہ فیومی المتوفی ۳۳۰ھ
نے ترجمہ کیا عربی میں تورات کا سب سے قدیم ترجمہ وہی ہے۔

نولڈکے اور انسائکلوپیڈیا و برٹانیکا کے مدیر وغیرہ بھی مامون کو نوشیروان سے تشبیہ دیتے ہیں،

حق یہ ہے کہ مامون اور عہد مامون کا زمانہ "قبل از وقت" رہا اگر ان کا دور یہ ہوتا جو اب ہے تو وہ یورپ کی ترقیوں سے بھی بازی لے جاتے، ڈاکٹر طوطح ایک انگریزی رسالہ میں لکھتے ہیں، جب کہ شارلمان اپنے اتراب کے ساتھ مدرسہ میں پڑھنا سیکھ رہا تھا، مامون فلسفہ کا ماہر ہو چکا تھا۔

اپنے مضمون میں ایک دوسرے مقام پر ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں، مامون نے اپنے بیت الحکمۃ کو زیادہ قیمتی بنا لیا تھا جب کہ یونان کے علوم وفنون ترجمہ کرائے۔

عہد مامون کی غیر معمولی ترقیوں پر بہت سے قابل ذکر اقوال موجود ہیں جن میں سے ہم سر ولیم میور کی رائے ایک مقام پر پیش کر چکے ہیں جو کافی ہے، فن تاریخ وجغرافیہ میں اس زمانہ میں کوئی ممتاز ترقی نہیں ہوئی۔

اب ہم خلق قرآن کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں، کہ جس زمانہ کی ذہنی ودماغی، علمی وعقلی فضاء پر بہت اثر انداز ہوا۔

مسئلہ خلق قرآن ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں روایت کی ہے کہ جعد بن درہم نے ہشام کے زمانہ میں

لاطینی سے عربی میں کافی کتابیں ترجمہ ہوئیں اس لئے کہ لاطینی میں بھی بہت سے علوم از قبیل فلسفہ و تاریخ و شریعت وغیرہ موجود تھے افسوس ہے کہ تاریخ کے اس صفحہ کو بھی حوادث دہر نے دھندلا کر دیا ہے۔ اکثر آثار محو ہو چکے ہیں، مترجمین کے ضمن میں ہمیں یحییٰ بن بطریق کا نام نظر آتا ہے یہ غیر زبانوں میں لاطینی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے، انہوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ترجمہ لاطینی ہی سے ہوگا

قبطی زبان سے براہ راست عربی میں شاید ہی کوئی ترجمہ ہوا ہو اکثر ترجمے یونانی زبان کے واسطے سے ہوئے ہیں، خصوصاً قدیم کیمیائی صنعت اور اس قسم کی دوسری چیزوں میں مصریوں کو کمال حاصل تھا ان سے یونانیوں نے لیا، اور پھر یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ کیمیا کا ترجمہ قبطی اور یونانی سے ساتھ ساتھ خالد بن یزید کے حکم سے ہوا تھا۔

عہد مامون کی رفتار ترقی

یہ تھیں اس زمانہ کی کتابیں جن کا تذکرہ ہوا، ان مترجم علوم فنون نے سب سے پہلے عقل و دماغ پر اثر کیا، پھر عربی حضارت و تمدن پر اپنے نقوش قائم کئے ہم دیکھتے ہیں کہ مامون کے زمانہ میں علمی رفتار اتنی سریع ہوئی کہ اس نے ضرب المثل کی صورت اختیار کر لی، یہاں تک کہ

تھا؟ قبل اس کے کہ ہم ان سوالات کا جواب دیں، اور اس مسئلہ پر مختلف حیثیتو
سے نظر ڈالیں، ہم سر ولیم میور کی رائے نقل کر دینا چاہتے ہیں، اگرچہ
ہمارا، ان کا نقطۂ نظر جدا ہے، پھر بھی ہم ان کی رائے اس لئے پیش
کرتے ہیں کہ ایک بڑے مستشرق کی رائے بھی سامنے رہے۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں جہاں مامون کا ذکر کیا ہے کہا ہے
"واقعہ یہ ہے کہ مامون کو فارس سے ایک قسم کا تعصب تھا اس
لئے کہ اس کی ماں کا مسقط راس وہی تھا۔ علویوں کی طرف بھی وہ بہت
مائل تھا، آخری چند سالوں میں اس کے اشارہ ہی سے تعصب اور
آزادی فکر میں ایک اچھا خاصا تصادم ہو گیا، اس لئے کہ بعض مسائل
میں وہ پورا آزاد خیال واقع ہوا تھا، اس نے عیسائیوں کو اس کی اجازت
دیدی کہ وہ بے دھڑک مناظرہ کریں، کہ کون دین افضل ہے، اسلام
یا مسیحیت؟ فارسیت کی طرف اس کا میلان ہمیشہ اس پر اثر انداز ہوتا
رہتا تھا، مامون نے اپنے عہد کے علماء کو اپنے سامنے ان مسائل پر مناظرہ
کی دعوت دی جن پر اس سے پہلے گفتگو بھی ممنوع تھی، مثلاً انسان کا
اپنے خالق سے کس قسم کا رشتہ ہے۔؟ وغیرہ آخر میں ان خیالات کی طرف
مائل ہو گیا تھا۔ جو مذہب صحیح کے مخالف تھے، مثلاً جبر و اختیار میں اس
نے اختیار کا پہلو اختیار کیا تھا، قرآن کے متعلق کہتا تھا۔ کہ اگرچہ وہ وحی

خلق قرآن کی تحریک کی۔ وہ گرفتار کر کے خالد قسری کے پاس بھیج دیا گیا، جو عراق کا گورنر تھا۔ ہشام نے جعد کے قتل کرنے کا حکم دیا، خالد نے اسے قید کر دیا۔ قتل نہیں کیا۔ ہشام کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے خالد کو ملامت کی۔ اور پھر قتل کی تاکید کی۔ خالد نے اسے قید خانے سے نکالا۔ جب بقر عید کی نماز پڑھ چکا۔ تو اس نے اپنے خطبہ میں کہا "لوگو! اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اور قربانی کرو، اللہ تعالیٰ اسے قبول کرے گا، میں چاہتا ہوں کہ آج جعد بن درہم کی قربانی کروں اس لئے کہ وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے گفتگو نہیں کی، اور نہ ابراہیم خلیل اللہ کو اپنا دوست بنایا۔ توبہ توبہ جعد کتنی بڑی بات کہتا ہے، پھر وہ منبر سے اترا، اور جعد کو ذبح کر دیا،

ابن اثیر کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق قرآن کی بدعت کا آغاز عہد اموی میں ہوا، چونکہ فضا موافق نہیں ملی اس لئے نشوو نما نہ پا سکی، یہاں تک کہ مامون کا زمانہ آیا، اب ایک ایسی شخصیت مل گئی جو صاحب نفوذ و اقتدار تھی، جس کی طبیعت سخت گیر تھی، اس موافق فضا میں یہ تحریک خوب پھلی پھولی،

یہاں دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا مامون حقیقتاً حامی تھا، یا یہ اس کے طبع غلو کا نتیجہ تھا جس نے اسے راہ اعتدال سے ہٹا دیا

کی جائیں، اکثر علماء متاثر ہوگئے، اورانہوں نے خلق قرآن کا مسئلہ قبول کرلیا بعض حق آگاہ ہستیاں اپنے مسلک پر قائم رہیں، اور قرآن کے غیر مخلوق ہونے کا اعلان کرتی رہیں، مثلاً امام احمد بن حنبل، جو پابستہ خلیفہ کے لشکر میں لائے گئے۔ کبھی مخالفین کو قتل کی دھمکی دی گئی، ان میں سے بیس آدمی پولیس کی حفاظت میں طوس بھیجے گئے، کہ جب خلیفہ جنگ سے واپس آئے تو کچھ فیصلہ ہو لیکن راستہ ہی میں ان قیدیوں کو اطلاع مل گئی کہ مامون کا انتقال ہو گیا۔"

یہ تو تھی سر ولیم میور کی رائے، اب آپ کے سامنے ہم بھی اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتے ہیں،

یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ مامون یحیٰی بن مبارک زیدی کا شاگرد تھا، جن پر اعتزال کا اتہام لگایا جاتا ہے، ثمامہ بن اشرف سے اس کے جو تعلقات تھے، ان سے بھی آپ واقف ہیں۔ ثمامہ مذہب اعتزال میں مسلک ثمامی کا بانی تھا۔ مامون اسے اتنا پسند کرتا تھا۔ کہ دو بار اس نے

(بقیہ صفحہ ۱۷۶ کا) مامون کو یہ خاموشی پسند نہ آئی، اس نے حمایت پر علماء کو مجبور کیا، جو نہیں مجبور ہوئے۔ انہیں قید و بند کے مصائب جھیلنے پڑے۔

لے۔ قاضی احمد بن داؤد کی نصیحت کے بعد مامون نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا۔

ہے۔ لیکن یہ مسلک ان لوگوں کے خلاف تھا جو قرآن کو ازلی اور غیر مخلوق مانتے تھے[1]، مامون نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ حضرت علی رسول اللہ کے بعد سب سے زیادہ اشرف ہیں، قرآن مجید کی تفسیر بھی وہ اپنی طرف سے کیا کرتا تھا، اس حریت فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے شراب کی اباحت اور متعہ کے جواز کا فتویٰ دیدیا[2]۔

آخری چند سالوں میں مامون اپنے اس مسلک پر بہت سخت ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے والی بغداد کو لکھا۔ کیونکہ خود حملہ روم میں شریک تھا کہ تمام علماء و فقہا کو مجتمع کیا جائے اور اس مسئلہ پر ان سے جوابات طلب

---

[1] شیخ عبدالوہاب بخاری نے اس مسئلہ کے متعلق فرمایا ہے کہ جس طرح اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے حقیقتاً صورت مسئلہ یہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ خلق قرآن کا قول ایک بالکل نئی چیز تھی، رسول اللہ صحابہ تابعین کسی کے ہاں کبھی اس مسئلہ پر کوئی قول نہیں ملتا ہے، نہ حمایت میں، نہ مخالفت میں۔ جب مامون کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہوئی، تو اس نے علماء اثر سے دریافت کیا، انہوں نے پہلے کلام اللہ کو دیکھا، اس میں اس کے متعلق کچھ نہیں ملا، پھر سنت رسول اللہ کو دیکھا، اس میں بھی کچھ نہیں ملا، ظاہر ہے کہ کتاب و سنت کے سوا کس چیز کی طرف رجوع کرتے تھے؟ جب انہوں نے ان دونوں میں کچھ نہ پایا تو ان کی دیانت مذہبی کا تقاضا یہی تھا، کہ خاموش رہیں (باقی صفحہ ۱۷۹ پر دیکھیو)

انجمن ترقی اردو پاکستان
کتب خانہ

عربوں کے آثار!

دنیائے علم و عمران میں

دنیا میں عرب نامی ایک قوم نمودار ہوئی۔ علم و اخلاق سے تہی مایہ۔ تہذیب و تمدن سے عاری، اور فنون و صنائع سے ناواقف۔

پاس ہی روم و ایران کے قصر فلک بوس اپنی عظمت و ہیبت کا اعلان کر رہے تھے، ان کی تہذیب و تمدن کا خورشید جہانتاب ایک عالم پر ضیا بار و کرم گستر تھا، لیکن عرب کا کاشانہ، محروم تھا، وہ جاہل تھے بدخو تھے، لیکن دیکھتے دیکھتے! وہ قوم ایک عالم پر چھا گئی، کشور کشائی اور ملک گیری میں کوئی اس کا ہم نبرد نہ رہا۔ علم و حکمت کی طرف جب متوجہ ہوئی تو یونان کے اسفار و اوراق کو کھنگال کر نئے علم، نئے فلسفے، اور نئے نظریات سے علم و حکمت کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا، تعمیر و صناع کی طرف توجہ مبذول ہوئی، تو الحمرا اور قصر الزہرا کی بنیادیں پڑ گئیں، غرض عرصۂ حیات کے جس گوشہ میں داخل ہوئی، مظفر و منصور، دنیا کے جس چپہ پر قدم رکھا۔ فاتح و کشور کشا کی حیثیت سے، علم و فن کی جس محفل میں داخلہ ہوا تو مسند علم و فن کے امتیاز خصوصی سے

قلمدان وزارت پیش کیا جیسا کہ ہم "باب الوزارت" میں بیان کر چکے ہیں اس سے بھی آپ ناواقف نہیں ہیں کہ مامون مجلس بحث و مناظرہ منعقد کیا کرتا تھا، جس میں ہر قسم کے ارباب رائے و نظر شریک ہوتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر تیز و طرار اور صاحب علم و فضل شخصیت کو مامون کے قرب کا موقع بہم پہونچا۔ مثلاً ابو ہذیل، علاف، ابراہیم ابن سیار وغیرہ، یہ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ ثمامہ، علاف۔ اور ابراہیم مشائخ اعتزال میں شمار ہوتے ہیں، جب یہ تمام حقائق پیش نظر ہیں، پھر تعجب کیا ہے، اگر مامون پر یہ خیالات غالب ہوئے؟

مذکورہ بالا عوامل تو خیر یکساں تھے لیکن اور بھی عوامل تھے، جن کے اثرات بہت قوی ظاہر ہوئے، ایک تو نقل و ترجمہ کی گرم بازاری ہے، مامون کو فلسفہ و منطق کا شوق پیدا ہوا، اس کے دل میں ارسطو وغیرہ کی محبت راسخ ہو گئی، یہاں تک کہ سوتے جاگتے وہ اسی کا نام لیا کرتا تھا، یہ آخری صورت بھی پہلی صورت سے کم مؤثر نہیں تھی، بہر حال ان اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں اعتزال رچ گیا، اور غلو کی بنا پر کچھ سختیاں اس سے سرزد ہوئیں۔ مزید تفصیل کسی آئندہ موقع پر ملے گی۔

خود مختار عناصر پیدا ہو گئے، مگر علمی ترقیوں کو جب بھی فروغ حاصل رہا پہلے اگر ایک مرکز تھا، تو اب علم و فن کی سرپرستی کے متعدد مراکز ہو گئے۔

عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ مختصر مدت میں یونان، فارس اور ہندوستان کے مختلف علوم و فنون کو عربی میں ترجمہ کر لیا ہو، بلکہ انہوں نے ان میں وسعت پیدا کی، جدید اضافے کئے، اور نئے نئے نظریات قائم کئے، جو آج تک حضارت فرنگ کے لئے اساس کا کام دے رہی ہیں۔

فن تاریخ میں عربوں نے ایسا امتیاز حاصل کیا تھا، کہ علماء مغرب کے لئے وہ آج تک مایۂ حیرت و استعجاب ہے، دوسری اقوام و امم کے مقابلہ میں عربوں کے مؤلفات کو جو ترجیح حاصل ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے مثالاً کشف الظنون کو لیجئے، جس میں کتب و فنون کے اسماء سے متعلق مفصل معلومات پیش کئے گئے ہیں، ان کی تعداد جن کی کتاب میں ذکر ہے، ۱۳۰۰ تک پہنچتی ہے اور پھر شروح و اختصارات وغیرہ متزاد، اور وہ تاریخی کتابیں جو سال و سنین کی حسن ترتیب کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں، مثلاً طبری، ابن اثیر، ابوالفدا، یا جو اقوام و ممالک کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئیں مثلاً مسعودی مقریزی، ابن خلدون، وغیرہ اس قبیل کی کتابیں تو حد شمار سے خارج ہیں[1] ایسے ایسے مؤلف و مصنف بھی تھے، جو اپنی عبارت کی روانی و شگفتگی اور

---

[1] زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳۔ ص ۹۳

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرفِ غلط　　لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

دنیا زود فراموش ہے، عربوں کے ملکات و فضائل لوگوں کے ذہن و دماغ سے محو ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا "یاددہانی" کے طور پر اگر کبھی کبھی وہ داستانِ پارینہ زیبِ قرطاس و قلم ہوتی رہے، تو مضائقہ کیا ہے؟

صفحاتِ ذیل مصر کے مشہور علمی رسالہ "المقتطف" کے ایک مقالہ کا ترجمہ ہیں۔ یہ پیشِ نظر رہے کہ رسالہ کا ایڈیٹر مسلمان نہیں عیسائی ہے،

ایک صدی کے اندر ہی اندر، عربوں نے متعدد ممالک پر قبضہ کر لیا، یہاں تک کہ چین جیسے دور دراز مقام پر بھی ان کی فوجیں نظر آنے لگیں نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے نام سے دنیا کی قومیں لرزہ براندام ہو گئیں۔

ملک گیری سے جب ان کی طبیعت سیر ہو گئی، تو انہوں نے علم و فن کی طرف توجہ کی اور تھوڑے عرصہ میں اس میدان میں بھی وہ سب سے آگے نظر آنے لگے، ایک طرف سلطنتِ عباسیہ کا آفتاب نصفت و اقبال مائل بہ غروب تھا، تو دوسری طرف علم و حکمت کا مہرِ درخشاں طلوع ہو رہا تھا، اور آگے چل کر حکومت مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی، بہت سے

تجربات سیاحت سے متعلق تالیف کیں۔ زمین کے جو نقشے بنائے ان میں بھی ایک اسلوب بدیع کے مالک ہوئے ان کیلئے یہ فخر کافی ہے کہ کرہ پر نقشہ کھینچنے کا اصول سب سے پہلے انہیں نے معلوم کیا، خط نصف النہار کا طول درجہ معلوم کرنے میں بھی عرب ہی سب سے اول رہے، مشہور عرب جغرافیہ دانوں میں مسعودی، بیرونی ادریسی، یاقوت، مقریزی، قزوینی، اور ابن بطوطہ، سے ہر شخص واقف ہے۔ ان سب میں ادریسی کی وہ شخصیت وہ تھی، کہ بارہویں صدی عیسوی میں تو اس کا کوئی ہمپایہ پیدا نہیں ہوا، ادریسی ہی نے روجر بادشاہ صقلیہ کی فرمائش سے ایک کتاب "نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق" تالیف کی، جس میں بلاد و ممالک کا نہایت تفصیلی تذکرہ تھا، اس کے علاوہ اس نے روجر کے لئے ایک نقشہ بھی تیار[1] کیا تھا، جس میں اس زمانے کے تمام قابل ذکر اقالیم کو دکھایا گیا تھا، ادریسی کی وہ شخصیت ہے کہ جو جغرافیہ اسلام اور جغرافیۂ فرنگ کے درمیان حلقۂ اتصال کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب "تراث الاسلام[2] میں ہے کہ

"بادشاہ روجر کا ایک مسلمان عالم سے جغرافیہ پر کتاب لکھانا اور نقشہ بنوانا، اس بات کا ثبوت ہے، کہ مسلمان اس زمانے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا مادہ *Map*

[2] کتاب تراث الاسلام *Legacy of Islam*

اور حسن استدلال کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ اکثر عرب مورخوں کو علمائ مغرب
"حکمت گرو" تسلیم کیا ہے، یورپ کے علمی حلقے اس وقت تک ان کتابوں سے مستفید
ہوتے ہیں ابن خلدون ہی کو لیجئے اس نے اپنی مشہور تاریخ کی تالیف میں
ترتیب میں ممالک و مساکن کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ مغرب اور اندلس کے
متعلق اس نے ایسے ایسے معلومات پیش کئے ہیں، جہاں تک کوئی بھی نہ پہو
سکا۔ تاریخ ابن خلدون کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے، یورپ کے ایک مشہور عالم
کا قول ہے کہ "ابن خلدون کا مقدمہ فلسفۂ تاریخ سے لبریز ہے کوئی بھی
تک نہ پہونچ سکا، جہاں تک ابن خلدون کی طبع بلند پہونچی ہے، بلکہ میں تو
کہتا ہوں روم و یونان کے علماء بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچتے۔"

فن جغرافیہ میں بھی عربوں کو تقدم کا شرف حاصل ہے، پہلے تو انہوں نے
یونان وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا، ترجمے کے بعد انہوں نے اس فن کو او
بھی وسیع کیا، اپنے مشاہدات و تجربات سے اضافہ کیا، اس لئے کہ یہ تو
خود ایک جہانگیر قوم تھی، بطلیموس کی بہت سی غلطیوں کی تصحیح عربوں ہی
نے کی[1]۔ اور یہ عرب ہی تھے جو صحرائے افریقہ تک پہنچ گئے، اور بلاد سود
میں بھی اپنے جھنڈے گاڑ آئے۔ گذشتہ اقوام سے عرب اس باب میں
ممتاز ہیں کہ انہوں نے فن جغرافیہ میں بہت سی کتابیں اپنے مشاہدات

---

[1] زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۱

اس بیان سے ان لوگوں کی تسکین ہو جانی چاہیئے، جن کے خیال میں عربوں کا علم طب نظری تھا، اس فن میں ان کے بڑے قیمتی مؤلفات بھی ہیں، مثلاً ابن سینا کا قانون اور ابو القاسم خلف بن عباس زہراوی اندلسی کی کتاب التصریف وغیرہ ان کتابوں سے فرنگیوں نے اپنی نہضت جدید میں بڑے بڑے فائدہ اٹھائے ہیں، اٹھارویں صدی عیسوی تک عربوں کی بعض کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں داخل رہیں، عربوں میں جن لوگوں نے فن طب میں غیر معمولی مہارت حاصل کی، بہت ہیں۔ جسے تفصیل مطلوب ہو، طبقات الحکماء، تراجم الحکماء اور کشف الظنون وغیرہ کی طرف رجوع کرے، یہ بات بہرحال ثابت ہے کہ طب اور صیدلنۃ میں عربوں نے نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی،

اس طب کو ایک باقاعدہ نظام کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، ایک افسر اعلیٰ طلبہ کا امتحان لیتا تھا، ممتاز طالب علموں کو بھی انعام ملتا تھا، چنانچہ صرف بغداد میں بزمانہ خلیفہ مقتدر باللہ ان کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ گئی تھی، اور ان میں وہ ستر افراد مستثنیٰ تھے جو خدمت سلطانی کے لئے مامور[1] تھے۔

اس فن میں صرف مردوں ہی کو کمال نہیں تھا، بلکہ عورتیں بھی مردوں

---

[1] ابن ابی۔ طبقات الاطباء ج ۱ ص ۲۲۲

میں علمی اعتبار سے اپنے تمام اقران و اماثل میں ممتاز تھے۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرب بس نقل و ترجمے کے ماہر تھے، علوم وفنون میں انہیں براہ راست کوئی دسترس نہیں حاصل تھی، یہ تحقیق انیق انہی "یورپ" زدہ حضرات سے ظہور میں آتی ہے جن کا سارا علم و فن رہین منت ہوتا ہے۔ استادان فرنگ کا یا ہمارے وہ نوجوان اس قسم کے اقوال کا اظہار کرتے ہیں، جو فرنگیت سے مرعوب و متاثر ہیں، ورنہ اس قول کا مہمل ہونا بالکل "ظاہر و باہر" ہے، وہ فرنگی علماء جن کو خدا نے عدل و انصاف کا مادہ دیا ہے، اس کے علی الاعلان معترف ہیں کہ عربوں نے نقل و ترجمے میں اپنی مہارت کا جو ثبوت دیا ہے اس سے کہیں زیادہ ہے خود انہیں علوم وفنون میں دستگاہ تھی،

یونانی، سریانی، کلدانی، وغیرہ میں طب پر جو مسالہ تھا، پہلے تو عربوں نے اسے حاصل کیا، پھر اس فن میں انہوں نے تغیر و تبدل کیا، اور حک و اصلاح سے کام لیا، بلکہ اضافہ و ایزاد کے بھی نہایت بے بہا نمونے چھوڑے

کتاب تراث الاسلام میں ہے۔

"عربوں نے طب یونانی میں کافی اضافہ کیا، اور ان کا یہ اضافہ تجربہ پر مبنی تھا، جو اس کا ثبوت ہے کہ وہ طب سے رسمی اور نظری طور سے ہی نہیں واقف تھے، بلکہ عملی حیثیت سے بھی اسمیں کافی ممتاز تھے"

شانہ اتر جانے کی صورت میں اسے بٹھانے کے لئے وہ بھی وہی طریقہ استعمال کرتے تھے جو آج کل رائج ہے۔ اسی طرح جذام، چیچک، کھسرا، وغیرہ کی شکل وصورت اور خصائص وغیرہ کے متعلق عربوں نے تحریری سرمایہ پیدا کیا،

طب کے درس اور مریضوں کے علاج کے لئے ایک خاص عمارت مخصوص ہوتی تھی جس کو "بیمارستان" کہتے تھے۔ اور جس طرح آج کل طبی درسگاہوں سے لوگ سند فراغت حاصل کرکے نکلتے ہیں، وہاں سے بھی وہ طبابت کی سند لیکر نکلا کرتے تھے، علاج کے لئے جو عمارت مخصوص ہوتی تھی، اس میں ہر قسم کا ضروری سامان اور آلات موجود رکھنے کا کافی انتظام تھا،" نرسنگ" کے لئے ملازم تیمار داروں (حذام) کی ایک جماعت ہر وقت موجود رہتی تھی، جو امراض ان کے زمانہ میں معروف تھے، ان کے علاج کے لئے الگ الگ وارڈ (غرفہ) تھے[۲]۔

علم الجراحت سے متعلق تحقیق وانکشاف کا سہرا ذکریا رازی کے سر ہے، اور ان لوگوں میں جنہوں نے عمل بالید، سرجری، اور آلات وغیرہ کے استعمال میں خاص مہارت حاصل کرلی تھی، ابوالقاسم خلف بن عباس

[۱] زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۰

[۲] ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطبا ج ۱ ص ۱۸۳

کے دوش بدوش نظر آتی تھیں، مثلاً اخت حفید، اور اس کی دونوں بیٹیاں، ان عورتوں کو خاص طور سے عورتوں کے معالجہ میں کمال حاصل تھا[1]

موجودہ زمانہ میں جو طریقہ رائج ہے، عرب اس سے بے خبر نہ تھے، ان کے ہاں بھی باقاعدہ نبض دیکھی جاتی تھی، بیشاب کا معائنہ کا کیا جاتا تھا اور وہ لوگ حکماء یونان کے افکار و آراء پر داد تحقیق و تنقید بھی دیتے تھے یونانی کتابوں پر انہوں نے جو حاشیئے لکھے، تعلیقیں تیار کیں، مفید اور مناسب اصلاحات کیں، ان کے علاوہ اور متعدد طریقوں سے وہ اس فن کو جلا دیتے رہتے تھے، وہ عرب ہی تھے جنہوں نے طب میں کلوروفارم جیسی چیزوں کو معالجہ کے لئے ضروری قرار دیا، جس طرح آج کل جراحت کے لئے داغ دینا ایک ضروری سمجھا جاتا ہے، اسی طرح وہ بھی کرتے تھے، عربوں ہی نے سب سے پہلے مرض سل میں ناخونوں کے ٹیڑھا ہو جانے کو ایک علامت کی صورت میں معلوم کیا، یرقان اور ہیضہ کا علاج دریافت کرنے میں عربوں ہی کو شرف اولیت حاصل ہے، جنون کے مرض میں افیون کے فوائد کا انکشاف بھی عربوں ہی کا رہین منت ہے، نزیف (بہتے ہوئے خون کو روکنے) کے لئے ٹھنڈے پانی کا تریڑا دینا بھی عربوں ہی کی ایجاد

---

[1] ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطباء۔

بعض ایسی دوائیں ایجاد کی تھیں، کہ اگر وہ لکڑی پر مل دی جائیں تو آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی شیشے کی صنعت میں بھی عربوں نے اپنے کمال کا سب سے اعتراف کرایا، ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے، کہ علم نباتات میں بھی عربوں نے ایک استاد کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اس علم میں ابن بیطار، اور رشید الدین ابن الصدری غیر فانی شہرت کے مالک ہیں، موخر الذکر کو اس فن کی تحقیق و تجسس کا یہاں تک سودا تھا کہ

"ان کے ساتھ ہمیشہ ایک مصور رہتا تھا، (جب وہ گھاس پات اور جڑی بوٹی کی تحقیق کے لئے نکلتے تھے) مصور کے پاس ہر طرح کے رنگ اور مسالے موجود رہتے تھے، جب رشید الدین ایسے مقامات پر پہنچتے تھے جہاں نباتات کی فراوانی ہوتی تھی، تو وہ اس کا مشاہدہ کرتے تھے، تحقیق کرتے تھے، پھر مصور کو دکھاتے تھے، مصور اس کے رنگ پتیوں کی تعداد، شاخوں اور جڑوں کا پورا پورا اندازہ کر کے بالکل اسی طرح اس درخت کی تصویر کھینچتا تھا، اور ہو بہو اس کی نقل اتار کے رکھ دیتا تھا، اس سلسلہ میں رشید الدین نے نہایت دلچسپ طریقہ اختیار کیا تھا، یہ کہ وہ پہلے مصور کو پودے کی بالکل ابتدائی شکل دکھاتے تھے، اس کی تر و تازہ صورت کی طرف متوجہ کرتے تھے، اور مصور اس کی تصویر لیتا تھا، پھر جب وہ پودا بڑھ جاتا تھا، اس میں دانے آجاتے تھے، تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی،

الزہراوی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔[1]

صیدلتہ دوا سازی، اور جڑی بوٹی کی تحقیق و تفتیش پر بھی عربوں نے خاص طور سے اپنی توجہ مبذول کی، چنانچہ ہندوستان اور دوسرے ممالک سے اس باب میں نہایت وسعت قلب سے انہوں نے فائدہ اٹھایا، یورپ تک کو اس کا اعتراف ہے کہ فن دوا سازی کے بانی ہونے کا فخر عربوں ہی کو حاصل ہے[2]، یورپ میں آج بھی بہت سی جڑی بوٹیاں انہیں ناموں سے معروف ہیں، جو عربوں کے رکھے ہوئے ہیں،

فن کیمیا کے بہت سے مرکبات عربوں ہی کی بدولت عالم وجود میں آئے، عمل تقطیر، عمل ترشیح، عمل تذویب، بخارات بنا کے عرقوں کی کشید قلمیں بنانا، الکحل تیار کرنا، یہ سب وہ چیزیں ہیں، جنہیں پہلے پہل عربوں ہی نے جانا، پہچانا، بہت سے معدنی تیزاب اور نباتاتی قلویات (کھاری چیزیں) اور معدنی قلویات عربوں نے معلوم کیں، ان تمام چیزوں میں وہ مجتہدانہ نظر رکھتے تھے کہ بہت سے قدیم کیمیاوی نظریات کو انہوں نے باطل کر دکھایا،

ارباب نظر سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بارود کو مرکب کی صورت میں عربوں ہی نے پیش کیا، ابن اثیر کا قول ہے کہ "عربوں نے

---

[1] ڈاکٹر احمد عیسیٰ۔ آلات الطب و الجراحت عند العرب ص ۴۔ [2] زیدان تاریخ التمدن الاسلامی

متعلق بھی ان کے مستقل نظریات ہیں کہ اس سے پہلے کسی کی رسائی ذہن وہاں تک نہ ہوئی تھی، بلکہ اس مسئلے میں انہوں نے بہت سے اضافے کئے، یونانیوں کی صحت طلب آراء و افکار کی تصحیح کی، اس مسئلے پر اگر آج عربوں کے اضافے نہ ہوتے تو یہ مسئلہ اس منزل تک نہ پہنچتا، جہاں آج نظر آرہا ہے، بعض ارباب نظر کا خیال ہے کہ اس مسئلے پر عربوں کے مقالات و نظریات ہی کی بدولت دوربین کی ایجاد عمل میں آئی[۱] امراض چشم اور ان کی تشریح سے متعلق بھی عربوں کا بہت سا تحریری مسالہ موجود ہے[۲]

موسیقی میں وتر خامس عربوں ہی کی ایجاد ہے، جسے زریاب نے اندلس میں اضافہ کیا تھا، قانون بھی عربوں ہی کا ایجاد کردہ ہے، اس کی موجودہ ترکیب (ساخت) فارابی کی دی ہوئی ہے[۳] یہ مشہور قصہ تو اکثر کو معلوم کہ فارابی نے ایک باجہ ایجاد کیا تھا، جو صرف دو لکڑیوں سے بنا تھا ان لکڑیوں کی ترتیب میں جب ذرا سا تغیر کر دیا جاتا تھا، تو مختلف قسم کے راگ نکلنے لگتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ وہ سیف الدولہ کے دربار

---

[۱] ۔ انسائیکلو پیڈیا، برٹانیکا۔ مادہ

[۲] ۔ کاجوری۔ تاریخ الفزکیس، ص ۲۳

[۳] ابن خلکان ج ۲ ص ۷۷

پھر جب وہ پودا خشک ہو جاتا تھا، اور گرنے کے قریب ہوتا تھا تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، اس تحقیق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا، کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا کہ گویا وہ بچشم خود پودے کی اس نشو ونما، اور تغیر و تبدل کا معائنہ کر رہا ہے، ظاہر ہے یہ تحقیق کتنی کامیاب اور مکمل ہوتی ہو گی[۲۷]"

میں نہیں سمجھتا کہ آج کل کے ماہرین علم نباتات ابن الصوری سے زیادہ تحقیق و تدقیق کا ثبوت دے سکتے ہیں،

عربوں نے طبیعیات (فزکس) پر بھی اپنی محنت و کوشش صرف کی چنانچہ اس باب میں بھی نئی نئی بحثیں ان کی بدولت ہمیں نظر آتی ہیں پہلے تو انہوں نے یونانی کتابوں کا ترجمہ کیا، اور ترجمے کے بعد اس فن میں انہوں نے حسب عادت وسعت کی، بہت سے مسائل کا اضافہ کیا، ان کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ روز بروز اپنے لئے وہ نئی راہیں پیدا کرتے رہے انہوں نے ایسے آلات بنائے تھے، کہ جن کے ذریعہ سے وہ ثقل نوعی تک کا حساب رکھتے تھے، ایسے ایسے پیمانے انہوں نے تیار کئے تھے کہ ایک گرام کے ۴ . . . . حصہ سے کم وزن کا فرق تک وہ معلوم کر لیتے تھے، نظریہ جذب کے متعلق بھی ان کے بہت سے اقوال ملتے ہیں[۲۸]۔ روشنی کی

۲۷۔ ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطباء ج ۲ ص ۲۱۹

۲۸۔ ڈاکٹر حروف، لبسائط علم الفلک ص ۲۲

تکلیف دہ ثابت ہوا، اترتے وقت اس کے جسم کے پچھلے حصہ میں کچھ چوٹ آئی، اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ پرندہ اترتے وقت اپنے پچھلے حصہ سے زیادہ مدد لیتا ہے، عباس نے یہ غلطی کی کہ دُم نہیں بنائی۔[۱]

اب ہمیں چاہیئے کہ عربوں نے فن ریاضیات اور فلکیات میں جو ترقی کی تھی، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں، ان دونوں مسئلوں پر علما یونان اور ہندوستان کا جو تحریری مواد تھا، اس سے استفادے کے بعد عربوں نے ان مسائل میں بھی قابل قدر اضافہ کیا، حساب میں عدد کے خواص اور دوسرے متعلقات پر انہوں نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں، لفظ صفر پر بھی سب سے پہلے عربوں کے قلم سے نکلا، کسر عشری بھی عربوں ہی کا وضع کیا ہوا ہے، نو کا عدد دگرا کے جمع کرنے کا اصول بھی عربوں ہی کی جانب منسوب ہے۔[۲] ہندی ہندسوں کو انہیں نے نقل کر کے رواج دیا۔ خوارزمی نے اپنی ایک تالیف میں لکھا ہے کہ موجودہ ہندسے ہم کو ہندیوں سے پہنچے ہیں[۳] اور عربوں سے انگریزوں نے لئے ہیں،

۱۔ المقری۔ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۳۱

۲۔ کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۴

۳۔ سمتھ کارپنکی۔ الارقام الہندیہ العربیہ ص ۵

میں حاضر تھا، اس سے سوال کیا گیا کیا تم گانے بجانے سے کچھ ذوق رکھتے ہو؟ فارابی نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر اپنی جیب سے ایک خریطہ نکالا، اسے کھولا، اور اس میں سے دو لکڑیاں نکالیں، انہیں ایک خاص انداز میں ترتیب دیا، اور بجانا شروع کیا، تو یہ حال ہوا کہ مجلس میں جتنے لوگ تھے سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا، پھر ان لکڑیوں کی ترکیب میں ایک خاص تغیر کیا، اور بجانا شروع کیا، اب کی اہل مجلس پر راگ کے اثر سے گریہ طاری ہو گیا، اور ہر شخص بے حال ہو گیا، اس کے بعد اس نے پھر اپنی لکڑیوں میں ایک خفیف سا تغیر کیا، اور بجانے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ حضار محفل پر غنودگی طاری ہوئی، اور دربان تک خراٹے لینے لگا، فارابی نے لکڑیاں جیب میں رکھیں اور یہ جا وہ جا غائب ہو گیا[1]، فضائے آسمانی میں پرواز کا خیال بھی سب سے پہلے عربوں کو آیا، سب سے بیشتر اس معاملہ کی طرف جس کا ذہن منتقل ہوا، وہ عباس ابن فرناس تھا، نفخ الطیب میں ہے کہ

"عباس نے اپنے جسم کو فضا میں اڑانے کی کوشش کی، پہلے تو اس نے اپنے بدن پر پَر جڑے پھر دو بازو تیار کئے، جیسے چڑیوں کے ہوتے ہیں، اس کے بعد اس نے فضا میں کافی عرصہ تک پرواز کی، لیکن یہ پہلا تجربہ اس کے لئے ایک حد تک

---

[1] ابن خلکان۔ ج ۲ ۔ ص ۷۷

میں بھی داخل رہی، اور ایک مدت دراز تک یہ لوگ اس سے استفادہ
کرتے رہے، مثلثات میں بھی عربوں نے بہت جدت سے کام لیا،نسب
مثلثہ کے عداد میں، عربوں ہی نے سب سے پہلے مماس کو داخل کیا، تناسب
جیوب کا قانون بھی عربوں ہی کے انکشاف کا نتیجہ ہے، اور ان کے
فخر کو یہ کافی ہے کہ کروی مثلثات کے حل کا عام قاعدہ انہیں نے
بنایا، نظیر مماس، اور قاطع اور اس کی نظیر، ان چیزوں کے لئے جدولیں
بھی سب سے پہلے عربوں نے تیار کیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ علم المثلثات
میں عربوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی کہ پھر اس پر خاص طور
سے کوئی اضافہ کیا جاتا، چنانچہ علماء فرنگ کو بھی اس کا اعتراف ہے،

فلکیات میں بھی عربوں نے اپنی ذہانت و قابلیت، اور ایجاد و
اختراع کا ایک زمانے سے لوہا منوالیا، انہوں نے سابق فلکی علماء کی
طرح یہ نہیں کیا، کہ نظریات ہی قایم کرکے رہ گئے ہوں، بلکہ انہوں نے
اس فن کو عملیات میں داخل کر لیا، رصد وغیرہ کا قایم کرنا بعض نہایت
اہم نظریات فلکی عربوں ہی کے طبع وقاد کا نتیجہ ہیں، انہوں نے بہت
سے رصد خانے قایم کئے، اور ان میں منفعت بخش ارصاد کا انتظام کیا

لہ۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، مادہ مثلثات (Trig on ometry)

۲ نصیر الدین طوسی، شکل القطاع۔ص ۱۲۶

فن جبر و مقابلہ میں اگر یونانیوں کو کچھ درک تھا بھی تو بہت ناقص، ہم بلا خوف تردید یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ فن بھی عربوں ہی کے وضع کردہ فنون میں سے ایک ہے، کاجوری کا قول ہے کہ جب اس پر نظر جاتی ہے کہ عربوں نے جبر و مقابلہ کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا، تو عقل حیران رہ جاتی ہے، سب سے پہلے لفظ جبر کا استعمال بھی عربوں نے کیا اور ان سے انگریزوں نے لیا، اس فن پر انہوں نے مستقل نظریات بھی قائم کئے تھے، جو اس وقت تک قائم ہیں، معادلات کے لئے حلول جبری و ہندسی بھی انہیں نے ایجاد کئے، درجہ ثانیہ اور ثالثہ کے لئے معادلات سے بھی انہوں نے سب سے پہلے دنیا کو روشناس کرایا، اس فن میں عربوں نے ایسی ایسی ایجادیں کیں کہ علمار فرنگ آج تک انگشت بدنداں ہیں، کاجوری کا قول ہے کہ معادلات تعکیبی کا حل[1]. جو قطوع مخروط کے واسطے سے ہوتا تھا، عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے. درجۂ رابعہ کے معادلات کے بعض اوضاع بھی انہوں نے حل کئے[2]. مامون کے حکم سے محمد بن خوارزمی نے اس علم پر ایک کتاب شایع کی، جس نے بڑی شہرت حاصل کی جس سے ساری دنیا میں خوارزمی کا نام پھیل گیا، علمار فرنگ نے فن جبر پر جتنی کتابیں تحریر کیں وہ اسی کتاب پر مبنی تھیں، یہ کتاب فرنگیوں کے کورس

---

[1] و [2] کاجوری، تاریخ الریاضیات، ص ۱۰۷

غرض اس فن میں انہوں نے غیر معمولی اضافے کئے، سیدیؔ نے "بسائط علم الفلک" میں دیکھا ہے کہ پچاس فی صدی ستاروں کے نام وہی ہیں، جو عربوں نے رکھے تھے،[1] اور آج تک وہ فرنگی زبانوں میں برابر استعمال ہو رہے ہیں اس فن میں ان کی مہارت اور کمال کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بعض فلکی علماء نے ایسے مکانات بنائے تھے، جن میں آسمان تھا، آسمان پر تارے تھے، بادل تھے، بجلیاں تھی، سب ہی کچھ تھا اور دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ سچ مچ آسمان کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔[2] علمائے مغرب کا اس میں اختلاف ہے کہ حرکت قمر میں انواع خلا کے اکتشاف کا سہرا کس کے سر ہے؟ بعض لوگ تیخو براہی کا نام لیتے ہیں، اور بعض ابوالوفا کا،[3] لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ اس انکشاف کا سہرا ابولوفا کے علاوہ کسی اور کے سر نہیں ہے۔[4]

جب عربوں نے عیش و عشرت کے میدان میں قدم رکھا، تو اس میں بھی وہ سب سے بازی لے گئے، ایک طرف اگر علوم و فنون میں انہوں نے اپنی نظریات و خیالات کی ندرت کاریوں سے ایک عالم کو محو حیرت

---

[1] فانڈیک کتاب علم الہیئۃ ص ۱۳۷

[2] المقری، نفح الطیب ج ۲ ص ۲۳۱

[3] کاجوری، تاریخ الریاضیات ص ۱۰۵ [4] کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۵

اس فن میں انہوں نے ایسی مہارت کا ثبوت دیا، کہ علماءِ فلکیین دنگ رہ
گئے، کوئی ان کی برابری نہیں کر سکا، مغرب نے بھی عربوں کے تفوق کو
تسلیم کیا ہے، یہاں تک کہ لالاند، مشہور فرانسیسی عالم فلکی بتانی کو ان
بیس علماءِ فلکیین میں شمار کرتا ہے، جو اپنی مہارت و خصوصیات کے
اعتبار سے ساری دنیا میں فرد ہیں[۵۱]۔ زمین کی کرویت پر بھی عربوں کے
بہت سے اقوال ملتے ہیں، ان کا یہ خیال بھی تھا، کہ زمین ایک محور پر گر
کر رہی ہے، بڑی منفعت بخش زیچیں بھی انہوں نے ایجاد کیں، زمین
کے لئے نقطۂ ذنب کی حرکت [illegible] نے بیان کی، گرمائی اور سرمائی او
کی قیمت میں بھی انہوں نے اصلاحیں کیں، فلک معدل النہار پر فلک بر
کے میل کی قیمت کا اندازہ بھی عربوں نے ہی کیا، اور تعجب خیز امر یہ
کہ اس میل کا حساب نہایت دقیق ہے، اپنی رصد میں انہوں نے ایک
دقیقہ تک کا حساب رکھا تھا[۵۲]، آفتاب زمین سے کتنا بلند ہے؟ اس سوال
کا جواب جو انہوں نے دیا تھا، وہ تقریباً وہی ہے جو آج کل کے علما
فلکیات دیا کرتے ہیں[۵۳]، آلات رصد میں اسطرلاب بھی عربوں کی ایجاد ہے

---

۵۱ ملاحظہ ہو مقتطف، بابت ماہ جنوری ۱۹۲۱ء [illegible]

۵۲ اسمٰعیل مظہر تاریخ الفلک العربی ص ۴۵، ۴۶

۵۳ اسمٰعیل مظہر " " ص ۴۶

استحکام عمارت کا اعتراف و اقرار کیا ہے، فرنگیوں نے محلات اور کوٹھیوں
کے نام "حمبرا" اور "کزارا" (یعنی حمرا اور قصر) رکھنا شروع کئے حمبرا (حمرا
کے معنی ہی ان کے یہاں اس قصر کے پڑ گئے، جو خوبصورت ہو مضبوط ہو،
اس کے اندر باغیچہ ہو، طرح طرح کے پھول ہوں، غرض ہر چیز سے آراستہ
و پیراستہ ہو۔[1]

قصر حمرا عربوں کی جاہ و حشم اور عیش و تنعم کی ایک زندہ یادگار ہے
خوف طوالت کے خیال سے اشبیلیہ کے قصر کبیر اور اندلس کے قصر زہرا
اور قصر زاہرہ وغیرہ کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ قصر زہرا میں سنگ مرمر
اور دوسرے طرح طرح کے نادر پتھروں کو اس حسن و خوبی سے استعمال
کیا گیا تھا، کہ قوت بیان اس کی تشریح سے عاجز ہے، اس میں سیکڑوں
طلا سرخ کی مورتیں تھیں، مثلاً عقاب، ہرن، گھڑیال، شاہیں وغیرہ
ان میں سے ہر مورت ہیرے جواہرات سے مرصع تھی، فوارے کی طرح
اس کے منہ سے پانی نکلتا رہتا تھا۔[2]

یہ عمارتیں کیا نہیں ہمارے شعرا اور ادبا کے لئے ایک اچھا خاصا
میدان ہاتھ آگیا، مختلف شعرا نے اپنے اشعار میں اور ادبا نے اپنی

---

[1] مجلۃ الکلیۃ جلد ۱۵، ص ۳۳۰

[2] مجلۃ الکلیۃ جلد ۱۵ ص ۳۳۰

بنا رکھا تھا، تو دوسری طرف بزم وانجمن میں بھی وہ سب سے پیش پیش
تھے، ان کی بزم آرائیاں آج تک لوگوں کی زبانوں پر اور کتابوں کے
اوراق پر محفوظ ہیں، انہوں نے جب شعر وشاعری کی طرف توجہ کی تو اس
میں ایسا کمال پیدا کیا کہ میدان میں کوئی حریف نہیں رہ گیا، جب موسیقی کی
طرف ان کی نظر متوجہ ہوئی، تو ایسے راگ اور باجے ایجاد کئے کہ مرور
ایام کے باوجود آج تک وہ باقی ہیں، جب انہوں نے تعمیر پر نظر عنایت
کی تو ایسے ایسے قصور ومحلات تیار کرکے کھڑے کر دیئے، کہ دنیا میں جنت
کا نمونہ قایم کر دیا، ان کی عمارتوں کی خوبی وخوشنمائی، سنگینی واستحکام
اور تناسب وتناسق پر جب نظر پڑتی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے
ایک نظر مصر کی عمارات، دمشق کی جامع اموی، اور اندلس کے قصر
ومعبد پر ڈالو، تو عظمت اب بھی وہاں سجدہ ریز نظر آئے گی،

الحمرا کی قرار واقعی خصوصیات میں بیان کرنے کی استطاعت
نہیں رکھتا، لیکن میں نے اس کے متعدد اوصاف مقالات کتب میں
پڑھے ہیں، جو مشاہدہ پر مبنی ہے، اور ہر وصف ایک دوسرے سے
علیحدہ، یہ نتیجہ ہے الحمراء کی عجوبہ زائیوں اور حیرت فروشیوں کا، ا
کی عظمت وجلال ہندسی (انجنیرنگ) کا کون انکار کر سکتا ہے! ف
علمار نے بھی الحمراء کے گن گائے ہیں، اور اس کی نزاکت صنعت او

صحبت میں پیش کئے گئے، مغربی علمانے عربوں کے عمران و تمدن پر بہت سیر حاصل بحثیں کی ہیں، جن میں سے ہر ہر گوشہ ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے فرنگی علمانے جب کبھی عربوں کے مآثر کی جستجو کی، تو ان پر یہ حقیقت روشن ہو گئی، کہ عرب ہر چیز میں سبقت لے جا چکے ہیں، ایک بڑے مغربی دانشور کا قول ہے "بہت سی ایجادات واختراعات کو ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ ہمارے مساعی کا نتیجہ ہیں، لیکن تھوڑے ہی عرصہ کی کاوش وجستجو کے بعد ثابت ہو گیا، کہ ہمارا خیال غلط تھا، عرب ان چیزوں میں ہم سے مدت ہوئی بازی لے جا چکے ہیں"

پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ایسے قدر شناس مغربی علما ہیں جو قدم قدم پر عربوں کی رہنمائی، اور دستگیری کے قائل ہیں، اور دوسری طرف ایسے حق ناشناس بھی جو اپنے زعم علم میں اس کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کرتے کہ اپنے مآخذ ومصادر کا تذکرہ کر دیں اس لئے کہ اس میں عربوں کا ذکر آجائے گا، اور اسے وہ پسند نہیں کرتے لیکن ایسے انصاف پرور علما بہرحال موجود ہیں، جو نہایت فراخدلی سے عربوں کی علمی وعمرانی خدمات کا اعتراف خندہ جبینی کے ساتھ کرتے ہیں۔

فلوریان کا قول ہے کہ "اپنے زمانے میں عربوں نے علوم وفنون کی

نثر میں ان عمارتوں کے کمالات وخصوصیات، حسن وجمال تشریح وتعبیر اور اور اصلی تصویر کھینچنے میں اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا،

سطور بالا میں فن تعمیر کی چند نادر مثالیں پیش کی گئیں، ان کے علاوہ عراق، شام اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں حضارت و تمدن کے جو نمونے عربوں نے قایم کئے وہ ایسے ہیں کہ عصر حاضر کے بڑے بڑے علما بھی ان کا اعتراف کرتے ہیں، اسپین کے ایک بہت بڑے انجنیر کا بیان ہے کہ "جب میں مسجد قرطبہ کو دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سب سے بڑا اور اہم اور قابل ذکر تحفہ جو ہے، وہ یہی مسجد ہے، میرا خیال تو یہ ہے کہ دنیا اب تک اس مسجد کی نظیر پیش نہ کر سکی" آگے چل کے وہ کہتا ہے، کہ مختلف قسم کی صناعات میں اور پانی کو طرح طرح کاٹ کے نکالنے میں عربوں نے جو طریقہ اختیار کئے تھے، عہد حاضر کا فن اب تک وہاں نہیں پہونچ سکا[۵] فلسفہ میں عربوں نے جو کمال حاصل کیا تھا، اس سے ایک دنیا واقف ہے، کندی، ابن سینا، ابن ہیثم، اور ابن رشد وغیرہ ان اساطین میں ہیں کہ اب تک بہت سے دانشوران مغرب ان کی خوشہ چینی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔

عربی حضارت تمدن کے بحر بے پایاں کے یہ چند قطرے تھے، جو اس

۵۔ المقری۔ نفح الطیب ج ۱۔ ص ۲۳۰

ترقی میں جو کچھ کیا، ویسا کوئی نہیں کر سکا، اگر ہم یہ کہیں کہ یورپ ان کے خدمات علمی کی بنا پر ہمیشہ ان کا رہین منت رہا (اور شاید رہے گا) تو یہ مبالغہ نہیں ہے، بالخصوص تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی نہضت میں ان کی یہ خدمت ایک بہت بڑی عامل تھی۔"

بلاشبہ حضارت عرب ایک حلقۂ اتصال ہے، ایران و یونان و مصر و روما وغیرہ یعنی حضارت قدیم اور حضارت جدیدہ کے درمیان، وہ عرب ہی تھے، جنہوں نے یونان وغیرہ کے علوم کو ضائع ہونے سے بچایا، وہی تھے جنہوں نے ان علوم و فنون کو عربی میں منتقل کیا، وہی تھے، جنہوں نے ان علوم و فنون پر اضافے کئے، اور بالآخر اسپین کی راہ سے یہ سارا سرمایہ یورپ پہنچا دیا، کاجوری اور سمت اعتراف کرتے ہیں کہ ریاضیات اور فلکیات میں عرب سب کے استاد تھے، بارون وہی فو کہتا ہے،

"یونان نے جو علمی ورثہ چھوڑا، رومی اسے نہ قایم رکھ سکے، نہ اس کی قدر کر سکے۔ لیکن عربوں نے اس میراث کی حفاظت کی اور اسے درجۂ کمال تک پہونچا دیا، یعنی یہی نہیں کہ انہوں نے اس میراث کو جوں کا توں باقی رکھا ہو۔ بلکہ اسے ترقی کے سب سے بڑے درجے پر پہنچا دیا، انہوں نے اسے پروان چڑھانے میں اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں

اور بالآخر انہوں نے وہ میراث عہد حاضر کو سپرد کر دی۔"

ڈاکٹر سارطون نے جامع امریکیہ بیروت میں ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"بعض مغربی علماء خواہ مخواہ عربوں کی جلالت علمی کا اعتراف نہیں کرتے، قرون وسطیٰ میں عربوں نے علم و فن کو جو فروغ دیا اس کا اقرار کرتے ہوئے وہ ہچکچاتے ہیں، کہتے ہیں، عربوں نے یونانی علوم فنون کو نقل و ترجمہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا، یہ ایک بہت بڑی غلط بیانی ہے اگر ہم اسے فرض بھی کر لیں کہ نقل و ترجمے کے علاوہ انہوں نے کچھ اضافے نہیں کئے، تب بھی کیا یہ دنیا کی ایک عظیم الشان خدمت نہیں تھی؟ اگر ان کے "ترجمے" آج نہ ہوتے، تو ہم ترقی کی اس منزل پر نہ ہوتے بلکہ اب تک ہم قرون وسطیٰ ہی میں نظر آتے۔"

ڈاکٹر سارطون کا یہ خیال بھی ہے کہ انکشاف سے اگر فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اس کی حیثیت کچھ نہیں رہ جاتی، لیکن جو انکشاف سے فائدہ اٹھائے، اس کو برتنا سیکھے اور سکھائے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اس کا مستحق ہے کہ اسے موجد مانا جائے۔ چنانچہ

ادبُ الجاحظ

عنوان بالا سے عربی زبان کی ایک بے نظیر کتاب میری نظر سے گزری کتاب صوری ومعنوی ہر اعتبار سے نہایت دیدہ زیب و دلپذیر ہے، فاضل مؤلف کا نام "حسن السندوبی" ہے، سندوبی صاحب مصر کے اہل انشا میں ایک مرتبۂ خاص کے مالک ہیں، تلاش وجستجو، جرح وتنقید اور روایت و درایت کا نہایت خوبی سے امتزاج کیا ہے، اور پھر لطف یہ ہے، کہ رنگینیٔ عبارت اور حسن بیان بھی اس کتاب کی خصوصیت خاصہ ہے،

اصل کتاب ڈھائی سو صفحات کو محیط ہے، میں نے یہ چاہا ہے کہ اس کتاب کا عطر کشید کرلوں، یعنی کوئی اہم بات رہنے بھی نہ پائے اور صفحات اتنے نہ ہوں کہ گراں گزریں،

اصل ونسب سلسلۂ نسب، ابوعثمان عمرو بن بحر بن محبوب بن فزارۃ لیثی، کنعانی ہے، بعض ارباب سیر کا خیال ہے کہ فزارۃ ابوالقلمّس عمرو بن قلع الفقمی کا غلام تھا، قلمس کی اصابت رائے، اور نفوذ و اثر کا ہر شخص معترف ہے، یہ جس مہینہ کو چاہتا تھا، حلال کردیتا تھا، اور جس مہینہ کو چاہتا تھا حرام[له] کردیتا تھا، یہ خصوصیت واقتدار

له حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھو

فرماتے ہیں،

"قرون وسطیٰ میں عرب دنیا کے سب سے بڑے معلم تھے، عربوں کے نقل و ترجمہ کی حیثیت میکانکی نہیں تھی کہ لفظ بہ لفظ رکھ دیا، یا ہوبہو چربہ اتار دیا، بلکہ ان کی چیزوں میں روح تھی، زندگی تھی، انہوں نے یونان سے علوم وفنون حاصل کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا، اور ہندوؤں سے بھی بلا تامل انہوں نے قابل اخذ چیزیں حاصل کیں۔"

یہ ہے ایک مختصر سی داستان ایک گذری ہوئی قوم کی جو اگرچہ زندہ ہے، لیکن مرچکی ہے۔

پر اسے ترجیح دیتے تھے، لہٰذا جاحظ کے جد اعلیٰ کا سیاہ رنگ ہونا، اس کی "عجمیت" کی دلیل کیونکر ہوسکتا ہے؟

رہی غلامی تو ماہرین انساب و اخبار، و رواۃ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اس کے آبا و اجداد میں کوئی بھی غلام رہا ہو، ! اسی طرح یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ اس کے اسلاف میں سے کوئی شخص کبھی اسیر کیا گیا ہو۔

فزارہ کو آل فقیم کا "مولیٰ" کہتے ہیں تو لفظ "ولا" حریت کی نفی کب کرتا ہے؟ یہ لفظ تو محب، صدیق، نصیر، غلام، آزاد سب پر منطبق ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک صحیح النسب قبیلہ دوسرے قبیلہ کا ہمیشہ "مولیٰ" رہا کرتا تھا،

اب خود جاحظ کو لیجئے، اس کی کتابوں اور روایتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عربیت میں اسے بہت غلو تھا، کسی قوم کو عرب سے افضل و اعلیٰ وہ تسلیم نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس قدر اپنے اس خیال میں متعصب تھا کہ انسانیت کی ہر فضیلت، بزرگی، اور اولیت کا سہرا وہ عرب ہی کے سر رکھتا تھا،

اس کے باوجود محققین نے اعتراف کیا ہے کہ جاحظ خالص النسب عرب تھا، ابوالقاسم بلخی اور ابن حزم کہتے ہیں کہ وہ عرب تھا، عرب خاندان سے تھا، اور عرب کے ایسے خاندان میں پرورش پائی کہ مجد و شرف اس

اس کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ قائم رہی، عرب میں اس شان کا کوئی نہ پیدا ہوا اور نہ کسی میں یہ جرأت تھی، کہ اس کی کسی رائے کی مخالفت کر سکتا،

اس مقتدر خاندان میں جاحظ نے اپنے ایام نشو ونما پورے کئے اور نہ صرف اس نے بلکہ اس کے آباؤ اجداد نے بھی یہیں پرورش پائی، یموت بن المزرع کہتا ہے کہ فزارہ ایک سیاہ رو آدمی تھا، اور عمرو بن قلع کے اونٹ چرایا کرتا تھا،

یہاں سے جاحظ کی عربیت اور نسل کے متعلق ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاحظ عربی سامی نسل سے تھا یا قرب وجوار کی وجہ سے افریقی عناصر میں ممزوج ہو گئے؟ یا اس کے آباو اجداد میں سے کوئی غلام تھا یا اس کی نسل غلامی کی کدورتوں اور آلائشوں سے پاک تھی؟ اور وہ اچھا خاصا "حُر" پیدا ہوا تھا؟

میرا جواب تو یہ ہے کہ سیاہ رنگ ہونا تو عربی الاصل ہونے کے خلاف کوئی معقول دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ یہ رنگ عربوں میں پایا جاتا تھا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس رنگ پر فخر بھی کیا جاتا تھا، بہت سے ایسے لوگ تھے، جو اسے پسند کرتے تھے، محبوب رکھتے تھے، اور دوسرے رنگوں

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) اصطلاح میں اسے "نسی" کہتے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طرف اشارہ کرتی ہے" انما النسئ زیادۃ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاما ویحرمونہ عاما

بات کبھی یہی ہے کہ جب کوئی لقب آدمی کے کسی عیب کو ظاہر کرتا ہو، تو برا معلوم ہی ہوتا ہے، اگر جاحظ کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کا یہ لقب بڑے بڑے لوگوں کے لئے باعث شرف ومجد ہوگا، بلکہ معیارِ فضیلت قرار دیدیا جائے گا، تو شاید وہ خوش ہوتا، بلکہ بعض مرتبہ تو یہ خطاب دوسروں کے لئے خصومت کا سبب بھی بن جاتا تھا، اور ویسے ایک مستقل فضیلت تو تھی ہی ابوحیان توحیدی ابن عمید سے اس لئے برسرِ پرخاش تھے کہ "جاحظ ثانی" وہ بھی کہلاتے تھے، حالانکہ وہ صرف اپنے تئیں اس خطاب جلیل کا حقدار سمجھتے تھے، محمود بن عزیز جیسا فاضل اجل "جاحظ ثانی" کے شرف کا مالک تھا، ابو محمد الحسین بن خلاد کے متعلق ابن ندیم کہتا ہے کہ "وہ جاحظ کے مسلک کے پیرو تھے،" ابو القاسم آمدی جیسے شخص کے متعلق ابن ندیم ان کے مصنفات کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے" وہ جاحظ کے ہم مذہب تھے۔"

مولد ومنشا

جاحظ کے مولد کے بارے میں مورخین اور رواۃ میں اختلاف ہے، بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس کی ولادت سنہ ۱۵۹ ہجری میں ہوئی، بعض کچھ اور کہتے ہیں لیکن صحیح تر روایت خود جاحظ کی ہے جسے یاقوت نے اپنی معجم میں نقل کیا ہے کہ جاحظ کہتا تھا، " میں ابو نواس سے ایک سال بڑا ہوں، میں سنہ ۱۵۰ھ کے اوائل میں کتم عدم

کے رگ ریشہ میں پیوست ہو گیا،

لقب لقب جاحظ تھا، اس لئے کہ وہ بہت ہی بدشکل تھا، اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اس کے علم و فضل کے آگے یہ عیب کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اعاظم رجال میں بہت سے ایسے ہوئے ہیں، جو اس سے بھی زیادہ بدشکل و بدقوارہ تھے، مثلاً شیخ الفلاسفہ، سقراط، یہ بھی حد درجہ بدشکل تھا، ناک چپٹی چپٹی اور ہونٹ موٹے موٹے تھے، جاحظ تو بہر حال سقراط سے کم تھا، یہ عجیب بات ہے کہ اس کا اصلی نام "عمرو" کوئی نہیں لیتا، نہ اس کی کنیت "ابو عثمان" سے کوئی یاد کرتا ہے کہتا ہے تو جاحظ۔

جہاں تک جاحظ کا تعلق ہے وہ اس لقب (جاحظ) کو بہت ناپسند کرتا تھا، اور جو کوئی اسے اس لقب سے پکارتا تھا، تو وہ برا مانتا تھا اس کی خواہش تھی کہ لوگ اس کا اصلی نام لیا کریں، وہ اپنے اصلی نام "عمرو" سے اتنا خوش تھا کہ کہا کرتا تھا، کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ نام بہادروں کے لئے، بادشاہوں کے لئے سرداروں کے لئے، رئیسوں کے لئے مخصوص رہا، مثلاً عمرو بن سعید الاکبر، عمرو بن العاص، عمرو بن معدیکرب وغیرہ۔

وہ کہا کرتا تھا "لوگ مجھے 'عمرو بن بحر' کیوں نہیں کہتے؟ یہ کیا ہے جس کو دیکھئے وہ اسی جہل لقب جاحظ سے یاد کر رہا ہے"

اپنا مستقل مستقر بنالیا، بغداد جب وہ پہونچا تو مامون رشید کا عہد سعادت تھا، اس وقت تک بغداد ترقی و سرفرازی کی ساری منزلیں طے کر چکا تھا بغداد میں اس کا داخلہ ۲۰۴ھ میں ہوا، جب اس کے قیام کی شہرت ہوئی تو علمار و فضلا کی ایک جماعت کی جماعت مشتاق زیارت ہو کر آئی اور طالبان علم کا تو دریا امنڈ آیا، ہر صنف اور ہر جنس کے طلبہ موجود تھے نسل و قوم کا کوئی امتیاز ہی نہیں تھا، جاحظ کہتا ہے "فراء میرے پاس علم کلام حاصل کرنے کے لئے آیا، لیکن اس کو اس فن سے مناسبت نہیں تھی"۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ جاحظ کو علم حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ علوم حدیث میں بھی وہ کمال حاصل کر چکا تھا، اور مسند درس کی زینت بن چکا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے، جب وہ بصرہ میں تھا، اور ابھی بغداد نہیں گیا تھا، خطیب بغدادی اپنی "تاریخ بغداد" میں لکھتے ہیں، کہ جن لوگوں نے جاحظ سے حدیث کی سند لی ہے ان میں سے ایک ابو داؤد[1] بھی ہیں، ابن ابی داؤد کہتے ہیں "میں بصرہ میں تھا، تو ایک بار جاحظ سے ملنے گیا، میں نے اجازت طلب کی تو انہوں نے روشن دان سے جھانکا اور پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا اصحاب حدیث میں

---

[1] ابو داؤد کا جاحظ سے ملاقی ہونا مشتبہ ہے (مترجم)

سے عالم وجود میں آیا، اور وہ اواخر میں'....... خود جاحظ کی اس "نص" کے بعد شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

ابن خلکان کی روایت حد درجہ تعجب خیز ہے اس نے اپنی کتاب میں خطیب بغدادی کی "تاریخ بغداد" سے یہ قول نقل کیا ہے کہ "ابونواس کی پیدائش ۱۳۶ھ میں ہوئی، لیکن اس قول کی اہمیت جاحظ کے اس قول سے زائل ہو جاتی ہے، جس میں اس نے اپنی اور ابونواس کی عمر بیان کی ہے،

جاحظ بصرہ میں پیدا ہوا، اس زمانہ میں بصرہ وکوفہ یہی دو شہر تھے جو تہذیب وتمدن، علوم وفنون اور لغت وادب کے مرکز تھے، بغداد اس وقت تک عہد طفولیت میں تھا، اس کی عمرانیت وحضارت ابھی اس درجہ تک نہیں پہونچی تھی، اگرچہ عمران وتمدن کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا،

جاحظ کی نشو ونما بصرہ ہی میں ہوئی، اور وہیں سے اس کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوتا ہے، پھر ایسا بھی ہوا کہ بحث واستقرار اور علماء عصر سے استفادہ کی خاطر وہ بصرہ چھوڑ کے اس زمانے کے دوسرے اسلامی ممالک کی طرف گیا، جہاں سے وہ کامیاب وکامران واپس ہوتا تھا، جب اس کی عمر ۵۰ سے متجاوز ہوگئی، تو اس نے بغداد کا رخ کیا، اور اسی کو

غور و فکر اور بحث و استقراء کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم و تعلم کا دستور یہ تھا کہ پہلے بچہ ابتدائی طور پر لکھنا پڑھنا سیکھتا تھا، پھر کچھ صرف و نحو کی تعلیم ہوتی تھی پھر کچھ تھوڑا سا حساب سکھایا جاتا تھا پھر قرآن مجید پورے طور سے قرأت وغیرہ کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا اس کے بعد بچے کو کسی داستان گو کے سپرد کر دیتے تھے، جو بادشاہوں کی جنگ و فتح کے قصے سناتا تھا، بہادروں کے حالات بتاتا تھا، شہسواروں اور سپہ سالاروں کی کہانیاں سناتا تھا، اصحاب جنگ و جدل کی سیرت بیان کرتا تھا، اور یہ سب وہ اس طرح کرتا تھا کہ عبرت و موعظت کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا، یہ باتیں پورے طور سے بچے کے دل میں گھر کر جاتی تھیں، اسی سلسلہ میں عابدوں اور زاہدوں، خلوت نشینوں اور بزرگوں کے حالات بھی بیان کرتا جاتا تھا، ان متفرق معلومات پر عبور تام حاصل کر لینے کے بعد مساجد عامہ کے حلقہائے درس میں شریک ہوتا تھا، فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محدث کے حلقہ کا رخ کرتا تھا، پھر اہل لغۃ کی مجلس میں جاتا تھا، وہاں ماہرین انساب کے درس میں شریک ہوتا تھا، وہاں سے ماہرین اخبار و آثار کے پاس حاضر ہوتا تھا پھر منطقی کی مجلس میں، وہاں سے فلسفی کے دربار میں، پھر محفل ادب میں وہاں سے مہندس کے "معمل" میں پھر مفسر کے ہاں زانوئے شاگردی تہ

ایک شخص حاضر ہے۔ کہا تم نے مجھے "حشویہ"[۱] سے گفتگو کرتے کبھی دیکھا ہے؟ میں نے کہا میں ابوداؤد کا بیٹا ہوں، کہا، اخاہ! آؤ یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آیا اور پوچھا کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا مجھ سے کوئی حدیث بیان کیجئے، کہا لکھو عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی طنفسۃ[۲] خطیب نے سلیمان بن اشعث سے ایک روایت کی ہے کہ میں جاحظ کے ہاں گیا، اور کہا کوئی حدیث بیان کیجئے۔ کہا لکھو، عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبہ[۳]۔ یہاں ایک غلط فہمی رفع ہو جانی چاہیئے، یعنی جاحظ ہر محدث کی "حشو" سے نہیں تعریف کرتا تھا، یہ خیال اس کا انہیں لوگوں کے متعلق ہے جو لوگ کھوٹے کھرے میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

عہد جاحظ کے اسالیب تعلیم

قبل اس کے کہ ہم اس امر پہ گفتگو کریں کہ جاحظ کی تعلیم کیوں کر ہوئی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوب تعلیم کا ایک مختصر سا خاکہ بھی آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

---

[۱] مہمل بے لوگ ۱۲

[۲] قالین۔ دری ۱۲ [۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، کہ جب اقامت ہو جائے تو فرض کے علاوہ اور نماز نہ پڑھنا چاہیئے ۱۲

ابو زید انصاری، اخفش، اور ابو اسحٰق نظام سے اس نے علوم کلام و مذہب اعتزال کی تعلیم حاصل کی،

اس نے اپنے شیوخ سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ تو کیا ہی تھا، پھر کبھی وہ بصرہ کے مربد میں جایا کرتا تھا، اور تازہ وارد اعراب بادیہ سے فصاحت و بلاغت کے درس لیتا تھا،[1]

اس مربد میں عرب تجارت اور اسباب تجارت کی خرید و فروخت اور لین دین کے لئے آیا کرتے تھے، خطبا و شعرا، رواۃ و نساب، رجز خواں اور ارباب بلاغت جو مختلف قبائل سے متعلق ہوتے تھے، سب ہی آتے تھے اپنے نتائج افکار پیش کرتے تھے، اور داد فصاحت دیتے تھے، اور خراج تحسین لیتے تھے، یہ مربد گویا اسلام میں "سوق عکاظ" کا دوسرا نمونہ تھا۔

جاحظ نے علم حدیث بھی بہت سے اور قابل استاد بزرگوں سے حاصل کیا تھا مثلاً قاضی ابو یوسف شاگرد امام ابو حنیفہ (قاضی القضاۃ، چیف جسٹس) بغداد۔ یزید بن ہارون سری بن عبدویہ و حجاج بن محمد بن حماد بن سلمہ وغیرہ

---

[1] اعراب بادیہ کی فصاحت و بلاغت ہمیشہ معیار رہی، اب کہ دنیا اسقدر تہذیب و تمدن سے آشنا ہو چکی ہے اور زبان عربی بھی مختلف ادوار سے گذر چکی ہے باایں ہمہ اب تک اعراب بادیہ کی [illegible] مسلم ہے۔ (مترجم)

ہوتا تھا، وہاں سے اصولی و متکلم کی جماعت میں، پھر محفل روایت میں، اور وہاں سے "شاعر" کے مجلۂ "فکر و ذکر" میں، پھر انشا پردازوں کے دفتر میں اور وہاں سے منجمین کے رصد خانوں میں، پھر کسی اسطرلابی کے حضور میں اور وہاں سے کسی جغرافی کے سامنے، پھر بزم موسیقی کے کسی "استاذ" کے دولت خانہ پر، وہاں سے کسی ساز و چنگ کے مرشد کے پاس، پھر کسی دف و نے بجانے والے کے گھر پر یہ تھا اس عہد کے اسلوب تعلیم کا ایک مختصر خاکہ جس سے لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو بقدر استعداد حصہ ملتا تھا،

جب طالب علم اپنے علم و فن میں استحکام حاصل کر لیتا تھا، تو اسے اپنے "شیخ الجامعہ" کی طرف سے سند ملتی تھی، اس کے بعد اسے حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ مسند درس و تدریس کو سنبھال لے، لیکن بہت سے ان اسناد پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے بعد بھی بادیہ گری کرتے تھے۔ بڑے بڑے شیوخ و علماء سے ملاقات کرتے تھے، استفادہ کرتے تھے، مجلس مناظرہ منعقد کرتے تھے،

اسی نظام و دستور کے مطابق جاحظ نے بصرہ اور کوفہ کے اکابر علماء سے تعلیم حاصل کی، جن لوگوں سے اس نے تعلیم حاصل کی، ان میں سے چند کے اسماء گرامی آپ بھی سن لیجئے، مثلاً ابو عبیدۃ، معمر بن مثنی، اصمعی

بسر ہوتی ہے، ایک بار اس سے دریافت کیا "کیا بصرہ میں تمہارے پاس کوئی جاگیر ہے؟"

جاحظ مسکرایا اور کہا "ہاں، میں ہوں، میری جاریہ ہے، ایک خادمہ ہے جو اس کی خدمت کرتی ہے، ایک نوکر ہے، ایک گدھا ہے، بس یہ ہے میری کل کائنات، ایک بار میں نے اپنی کتاب "الحیوان" محمد بن الملک زیات کو ہدیۃً بھیجی تو اس نے مجھے پانچ ہزار دینار عطا کئے "البیان و التبین" احمد بن ابی داؤد کو میں نے عطیۃً بھیجی، اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینار بخشے، اسی طرح کتاب "الزرع والنخل" ابراہیم بن عباس الصولی کو میں نے بھیجی اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینا عنایت کئے، اب میں بصرہ میں ہوں، میری جاگیر میرے ساتھ ہے، جو نہ تجدید کی محتاج ہے نہ اس کی کھاد وغیرہ کی فکر کی جائے،

جب کہ جاحظ کی مالی حالت اتنی مستحکم ہو گئی تھی، تو پھر یہ امر باعث حیرت نہیں رہ جاتا کہ اس نے زمین کے چپہ چپہ کو علم سے لبریز کر دیا اور اپنے مثال واقران سے فضل وفہم میں بہ مدارج بڑھ گیا، اور ہر علم و فن پر متعدد تصانیف کا ایک ذخیرہ تیار کر دیا، اس لئے کہ نعم و عطایا آدمی کو بے فکر کر دیتے ہیں اور وہ اپنی استعداد کے مطابق اپنے ذوق سے کام لیتا ہے.

جاحظ سے بھی بہتوں نے اس فن کو حاصل کیا، مثلاً۔ مبرد۔ یموت بن مزرع اور ابوبکر بن ابی داؤد[1] سجستانی وغیرہ۔

اسباب معاش اور عزت و جاہ

جاحظ کے ابتدائی ایام بہت تنگدستی اور فقر و فاقہ میں بسر ہوئے ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ نہر سیحان پر مچھلی اور روٹی بیچا کرتا تھا، یہ روایت صحیح ہو یا نہو۔ بہر حال اس سے تو یہ ثابت ہی ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام اس کے بہت عسرت و فلاکت میں گزرے، اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے اس کی سبکی ہوتی ہو، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے فضل و کمال کا ایک زمانہ قائل ہے، اس کی تصنیفات سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہیں، جب وہ روشناس خلق ہوا تو ساری دنیا اس کی طرف امنڈ پڑی اس کے اسباب معیشت وسیع ہوگئے، اور وہ عیش و عشرت میں اپنی زندگی بسر کرنے لگا، اب تو حالت یہاں تک پہونچ گئی، کہ وزرا دولت اور عمائد سلطنت اس سے قرب رکھنے لگے، مثلاً خاندان برامکہ کے افراد، آل طاہریہ کے اشخاص، فتح بن خاقان، ابراہیم بن عباس الصولی، محمد بن عبدالملک زیات، احمد بن ابی داؤد وغیرہ۔

میمون بن ہارون نے یہ دیکھ کر کہ اب تو اس کی خوب مزے میں

---

[1] ط ۲ (مترجم)

عامہ کی سیاست اسی محور پر گردش کرتی تھی، اس منصب جلیل پر وہی معمو
کیا جاتا تھا، جو مختلف علوم و آداب میں دسترس رکھتا تھا، جس کا شمار اصحا
سیاست و تدبیر میں ہوتا تھا، اور جو اپنی دانش و بینش کی بنا پر عام طو
سے ممتاز سمجھا جاتا تھا،

مامون الرشید نے جاحظ کی فضیلت کی بنا پر اسے اس عہدہ پر مامو
کر دیا، بعض لوگوں کو اس کی یہ سرفرازی و قدر افزائی گراں گزری، وہ
لوگ طرح طرح کے حیلے سوچنے لگے، اور مامون تک اس کی چغلی بھی
پہونچنے لگی، یہ رنگ دیکھ کر تین ہی دن کے بعد جاحظ نے اپنے عہدہ
سے استعفیٰ دیدیا جو منظور ہو گیا،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاحظ ان آزاد نگاروں میں تھا
جو اپنا قلم آزاد رکھتے ہیں، اور اصحاب دولت و اقتدار، خلفا و ملوک
اور وزرا و ارباب دولت سے مرعوب نہیں ہوتے یا ان لوگوں میں تھا
جو اس قسم کے مناصب کو حصول عزت و جاہ کا ایک زینہ سمجھتے ہیں ؟
حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا میلان آزاد نویسی ہی کی طرف تھا،

علم و وسعت علم جاحظ نے بہت سے علوم میں کمال حاصل کیا تھا
فلاسفۂ یونان، حکمار ہند، علمار فارس اور
ادبار روما ن کی اکثر کتابیں، اس نے مطالعہ کی تھیں، ان کے افکار و آرا

جاحظ کے بعض احباب و اخوان اس کے پاس آئے اور پوچھا، "کہو ابو عثمان کیا حال ہے؟" جاحظ نے جواب دیا "تمہارے سوال کے دو پہلو ہیں دونوں کا الگ الگ جواب سن لو، حال تو میرا یہ ہے کہ وزیر میری رائے پر عمل کرتا ہے، جو میں کہہ دیتا ہوں اس کو نافذ کرتا ہے، خلیفہ کے انعامات و اکرامات کا ایک سلسلہ ہے کہ جاری ہے، پرندوں کا گوشت کھاتا ہوں نرم و ریشمی لباس پہنتا ہوں، اس طبرستانی گدّہ پر بیٹھتا ہوں، اور دیکھو یہ تکیہ لگاتا ہوں، اور اب چاہتا ہوں کہ خدا کسی طرح یوم عیش و مسرت لائے،" ان میں سے ایک نے کہا "اب جس حال میں ہو، یہ عیش و مسرت نہیں ہے؟" جاحظ نے جواب دیا "عیش و مسرت تو جب حاصل ہوگی، جب خلافت میرے قبضہ میں ہوگی"

ان الفاظ میں گویا خود جاحظ نے اپنی عزت و جاہ کا پورا حال بیان کر دیا ہے، رہی خلافت کی تمنا تو یا تو یہ اس کی حرص بے پایاں کا ایک ثبوت ہے، یا پھر اس نے بطور مزاح کہا ہوگا، ورنہ اگر ایسی بات وہ سنجیدگی سے کہتا تو اس کا نتیجہ بھی نہایت تلخ ہوتا، وہ سمجھدار آدمی ایسی احمقانہ بات کیوں کرتا، مزاح میں یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی ہوگی،

میر منشی میر منشی کا منصب اسلامی ممالک میں نہایت اہم عہدہ تھا جس کو مت

اس کی بہت سی مشہور کتابیں دین و مذہب کی حمایت میں ہیں، نیز آداب و اخلاق اور ظرافت و سنجیدگی سے متعلق بھی اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، لوگ ان کتابوں کو پڑھتے ہیں، اور اس کے فضل و کمال کے قائل ہوتے ہیں، جاحظ معتزلہ و غیر معتزلہ ہر جماعت میں نہایت عظمت و عزت کا مالک تھا۔ جو علما اشخاص کے قدر شناس اور معاملہ فہم ہیں وہ اسے خوب جانتے ہیں۔"

جاحظ کی کتابیں دوسروں کے نام سے

دنیا کے ہر عہد و ہر زمانہ میں ارباب قلم آفات فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے، جاحظ بھی نہ بچ سکا، قدماء کے آثار کی عظمت، گزشتہ لوگوں کا اعتبار لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا ہے، بہ نسبت اپنے زمانہ کے، چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب "التنبیہ و الاشراف" میں روایت کی ہے، کہ جاحظ باوجود اپنی جلالت قدر کے کہتا تھا،

"میں نے بہت سی کتابیں تالیف کیں، جو کثرت معانی اور حسن نظم کی بناء پر خوب تھیں، لیکن میں نے لوگوں کی توجہ اس طرف نہیں دیکھی، پھر میں نے اس سے کم درجہ کی کتابیں تالیف کیں، کسی کو میں نے عبد اللہ بن مقفع کی طرف منسوب کر دیا، کسی کو سہل

پر اس نے غور کیا تھا، کسی علم وفن کی کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو عربی میں ترجمہ ہوئی ہو اور جاحظ نے اس کا مطالعہ نہ کیا ہو،

ابوہفان کہتے ہیں "جاحظ سے زیادہ کتابوں کو محبوب رکھنے والا نہ میں نے کبھی دیکھا نہ سنا، جو کتاب بھی اس کے ہاتھ پڑ گئی بس ختم کرکے دم لیا، یہ شوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ کتب فروشوں سے رات رات بھر کے لئے ان کی دوکان کرایہ پر لے لیتا تھا، اور رات بھر کتابیں دیکھا کرتا تھا، حافظہ بھی غضب کا تھا، بہت زیادہ وسیع الروایۃ، قوی الحجۃ اور تیز زبان تھا، اسے علم وفضل کی "انسائیکلو پیڈیا" کہنا چاہیئے دنیا کی کون ایسی چیز تھی، جو اس کے احاطۂ معلومات سے خارج تھی!

اس کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی جانتا تھا اس دعوے کی کوئی ایسی مسکت دلیل نہیں ہے جو پورے طور سے اس کو ثابت کرتی ہو، لیکن اسی کی عبارت والفاظ سے ایسے قرائن ضرور ملتے ہیں جو اس رائے کے موید ہیں،

ابوبکر احمد بن علی کا یہ قول جاحظ کی وسعت علم وکمال پر ایک مزید شاہد ہے، وہ کہتا ہے،

"جاحظ اصحاب نظام میں سے تھا، علم کلام میں وہ پورے طور سے ماہر تھا، علوم دین و دنیا میں بھی وہ بہت بڑا فاضل اجل تھا

اس کی طرف منسوب ہیں "تنبیہ الملوک والمکائد" بھی اس کی طرف منسوب ہے جس کی جانب احمد ذکی پاشا نے اشارہ بھی کیا ہے۔

"المحاسن والاضداد" کتاب "التاج" "الدلائل والاعتبار علی الخلق والتدبیر" اس کی طرف غلط طور سے منسوب ہیں، جاحظ کا اسلوب نگارش تو ان میں پایا نہیں جاتا،

جاحظ نگاہ اعدا میں ارباب علم ودانش کی ایک مخالف جماعت بھی ان کے قدر دانوں اور قدر افزاؤں کے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہی ہے، جاحظ بھی اس خصوصیت سے مستثنیٰ نہیں تھا، اس کے بھی دشمن تھے، بد اندیش تھے، اور یہ سب کے سب اس کے فضل وکمال کے منکر بھی تھے، اور اسی طرح ذریعۂ اشاعت تھے جس طرح عقیدتمندوں اور دوستوں کی جماعت، اس خصوصیات وکمالات کی تبلیغ کیا کرتی تھی،

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کے خصوم و اعدا نے اس پر جو ناروا الزامات لگائے ہیں وہ آپ کے سامنے پیش کر دیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ واقعہ کیا ہے! سب سے پہلے ہم ابن قتیبہ کے مطاعن سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں وہ کہتا ہے:-

"جاحظ کا شمار آخر متکلمین میں ہے، وہ ننگ متقدمین ہے اس کا

بن ہارون کی طرف یا ان کے علاوہ متقدمین میں سے کسی اور کی طرف، بس لوگ دوڑ پڑتے تھے، اور اس کے نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے تھے، ان کتابوں میں سے سوا اس کے کوئی بات نہیں تھی کہ میں نے انہیں متقدمین کی طرف منسوب کیا تھا“

اس قول صریح سے ثابت ہوتا ہے کہ جاحظ نے اپنی بہت سی کتابوں کو ابن مقفع اور سہل بن ہارون وغیرہ کی طرف منسوب کیا،

تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس اعتراف صریح کے باوجود اتنیک دس صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن کوئی ایسا مرد باخدا نہ ہوا جو ابن مقفع کی کتابوں کا مطالعہ کر کے جاحظ اور اس کے اسلوب کا فرق مدنظر رکھ کے کوئی تحقیق کرتا،

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ابن مقفع کے اب آثار ہی کیا موجود ہیں، جس طرح جاحظ کی بہت سی کتابیں محو ہو گئیں سہل بن ہارون اور ابن مقفع کی کتابیں بھی نذر دور ایام ہو گئیں،

جس طرح جاحظ نے اپنی بہت سی کتابیں دوسروں کی طرف غلط طور سے منسوب کر دیں اسی طرح دوسروں نے بھی اس کی طرف بہت سے مصنفات (شاید جلب منفعت کے خیال سے) منسوب کر دیئے، جیسے کتاب ”الابل“ اور کتاب ”الہدایا“ حسب تحقیق یاقوت (صاحب معجم) ایک عرصے

کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے) فرماتے تھے کہ حجر اسود انہی عام پتھروں میں سے ایک پتھر ہے، جاحظ حضرت بن عباس کی طرف جو قول منسوب ہے اس کی ندرت کی بنا پر یہ کہا کرتا تھا، پھر مسلمانوں نے مسلمان ہو کر اسے سفید کیوں نہیں کر لیا؟

اب رضاعت کے مسئلہ کو لیجئے، حضرت عائشہ صدیقہ کی طرف ایک قول منسوب ہے کہ "رجم و رضاعت کے متعلق وحی آئی، وہ ایک کاغذ میں میرے بستر کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت رکھی ہوئی تھی، جب آنحضرت نے انتقال فرمایا تو ہم اس میں مشغول ہو گئے، اتنے میں کسی قبیلہ کی ایک بکری آئی اور اسے کھا گئی،......" یہ عجیب بات ہے علماء احناف اس مسئلہ میں جاحظ کے ہم آہنگ ہیں جواہر مضیئہ" میں ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تحریم رضاعت قلیل و کثیر دونوں سے ہوتی ہے اور امام شافعی کے ہاں پانچ رضعات کے بعد ہوتی ہے، ابوحنیفہ تو دلیل میں حدیث پیش کرتے ہیں، "الرضاعۃ من المجاعۃ" لیکن شوافع کی دلیل کیا ہے؟ احناف کہتے ہیں کہ دلیل تھی تو شوافع کے پاس بھی لیکن اسے بکری کھا گئی!

جاحظ بلکہ تمام معتزلہ اس قسم کے خرافات و جہلات سے انکار کرتے ہیں

ل یہ قول بھی مشتبہ ہے۔ (مترجم)

انداز عجیب و غریب ہے، وہ جب چاہتا ہے رائی کا پہاڑ بنا دیتا
ہے اور جب چاہتا ہے پہاڑ کو رائی کر دکھاتا ہے، کبھی وہ کالوں
کو گوروں پر بڑے شد و مد سے ترجیح دیتا ہے کبھی وہ حامیان عثمان
کو روافض سے بہتر ثابت کرتا ہے اور کبھی وہ یزیدیوں کو عثمانیوں
اور اہل سنت پر تفوق دیتا ہے کبھی وہ حضرت علیؓ کی فضیلت بیان
کرتا ہے، اور کبھی ان کی تنقیص کرتا ہے، کبھی وہ ایک کتاب
لکھتا ہے، جس میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں پر اعتراض
ہوتے ہیں، اور کبھی وہ احادیث رسول کے ساتھ تمسخر اور ستہزا
کرتا ہے جو "اہل علم" سے پوشیدہ نہیں مثلاً ..... حجر اسود کے
متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ وہ تو سفید تھا، مشرکین و کفار نے
اپنی سیاہ کاریوں سے سیاہ کر دیا تو چاہیئے تھا، کہ اسلام جب
پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے تو پھر وہ سفید ہو جاتا، اسی طرح
صحیفۂ رضاعت پر کبھی وہ کہا کرتا تھا .. .. .. الخ

اب آیئے ذرا ابن قتیبہ کے اس طعن کی حقیقت پر غور کریں۔ حجر اسود
کے متعلق ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ حجر اسود جنت کے پتھروں میں
سے ایک پتھر تھا، وہ اولے کی طرح سفید تھا، لیکن مشرکین و کفار کے
گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا، لیکن حضرت محمد بن الحنفیہ (حضرت علیؓ

کہ یہ اعجاز بلاغت ہے جو خدا کی طرف سے صرف جاحظ ہی کے حصہ ہیں آیا تھا یا اسے بھی چھوڑئیے۔ اس پر غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز ہے جو معائب سے بری ہو؟ یا یکسر خیر ہو یا سراسر شر؟ ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے دو پہلو نہ نکلتے ہوں، ایک حیثیت سے وہ سزاوار ستائش ہوتی ہے، تو دوسرے اعتبار سے مستحق مذمت اور یہ جاحظ کا کمال ہے کہ وہ جو چیز پیش کرتا ہے، وہ اس قدر مجلا اور مشرح طور سے کہ دوسرا نہیں کر سکتا،

ابو العباس ثعلب سے روایت کی جاتی ہے کہ ایک مجلس میں اس نے کہا "جاحظ کا ذکر چھوڑ دو، وہ تو غیر ثقہ ہے"، شاید اسی قول کی بنیاد پر ابو منصور زاہری کا یہ قول بھی ہے کہ "جاحظ کو زبان خطابت میں ملکہ حاصل تھا، علوم و فنون میں نہایت وسیع النظر تھا، لیکن اہل علم و معرفت اس کی برائی کرتے ہیں اور اس کے صدق کو مشتبہ سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے اقوال سے جاحظ کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے جن پر نہ کوئی دلیل ہو نہ برہان بات تو وہ قابل التفات ہوتی ہے جو دلائل و براہین سے محکم ہو،

بدیع الزماں ہمدانی اپنے مقالہ میں جاحظ کا ذکر بایں الفاظ کرتا ہے "جاحظ بلاغت کے دو پہلوؤں میں سے ایک میں خوشہ چینی کرتا ہے۔

اور واقعہ تو یہ ہے کہ ان کے دلائل بھی بڑے قوی ہیں، اس واقعہ کو وہ قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں۔ "وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ" تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس جیسی عزیز و مستحکم چیز کو بکری کھا لیتی، فرض باطل ہو جاتا، اور دلیل ساقط ہو جاتی ویسے تو دنیا کی ہر شخصیت اسے نہ باطل کر سکتی نہ محو کر سکتی ہے لیکن ایک بکری کے قبضۂ تصرف میں یہ کیسے ہے، اور اگر ایسا تھا بھی تو قرآن کی اس آیت کی کیا تاویل ہو گی؟ "الیوم اکملت لکم دینکم" یہ کہنے کے بعد خود خدا نے اسے بھیج دیا کہ وہ کھا لے؟ اور یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وحی کو بکری کے کھانے کے لئے چھوڑ دیا جائے، اور اس کی حفاظت وصیانت کا کوئی انتظام نہ کیا جائے؟ اور پھر وہ آیت نازل ہی کیوں کی گئی، اگر اسے معمول بہ نہیں بننا تھا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ جاحظ کے اعتزال کی بنا پر ابن قتیبہ کو اس سے پرخاش تھی، اور حقد و تعصب کا یہ نہایت عجیب نمونہ ہے کہ ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا جائے۔

رہی ابن قتیبہ کی یہ تنقیص کہ وہ ایک چیز بڑی شد و مد سے ثابت کرتا ہے اور اسی زور شور سے اس کی تردید بھی کرتا ہے، تو یہ تو گویا اس کی قوت بیان کا اعتراف ہے اسے ابن قتیبہ نے کیوں کر فراموش کر دیا کہ

وجود دلیل کیوں کر بن سکتا ہے؟ اس نے اپنی کتاب "امصار" میں لکھا ہے کہ اس نے کبھی دریا کا سفر کیا، نہ وہ کوئی بڑا بھاری سیاح تھا نہ راستوں سے واقف تھا، اس کی حالت تو اس شخص کی سی تھی، جو رات کو جنگل سے اندھیرے میں لکڑیاں چن رہا ہو، ایسے ہی وہ بھی دوسروں کی کتابوں سے نقل کر دیتا ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ مسعودی کا اعتراض بجا ہے علاوہ ازیں وہ اس فن میں مہارت تامہ بھی رکھتا تھا، لیکن اس لغزش سے جاحظ کا درجہ کم نہیں ہو جاتا اس لئے کہ علم و عمل کے میدان میں اس نے ایک جغرافی کی حیثیت سے قدم نہیں رکھا تھا۔

جاحظ نگاہ حق شناس میں

ایک وہ شخص جو اس کی فضل و منزلت سے واقف ہو، اس کے نزدیک تو جاحظ بلاشبہ عربی انشا پردازوں کا سردار، ادبا عرب کا شیخ اور ارباب علم و بیان کا امام ہے، فصاحت و بلاغت کا ستون ہے، ارباب فلسفہ و حکمت اور اہل علم و ادب میں سے کوئی شاید ہی اس جیسے کمال تک پہونچا ہو، اس کے معارف کا درجہ تو یہاں تک بلند ہے، کہ اسے ان لوگوں میں شمار کرنا چاہیے جن پر اسلام کو فخر ہے۔

ابوحیان توحیدی نے ایک مستقل کتاب "تقریظ الجاحظ" کے نام سے لکھی ہے

اور دوسرے میں ٹھہر جاتا ہے بلیغ تو وہی کہلاتا ہے جس کی نثر و نظم کا پلہ بھاری ہو اشعارے اس کا کلام داغدار نہ ہو جاتا ہو، تو جاحظ کا کوئی عمدہ شعر تم میں کسی کو معلوم ہے؟ ہم نے کہا نہیں، تو کہا، اس کا کلام لاؤ، تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کے کلام میں اشارات کم ہیں، عبارت قریب الفہوم ہے، استعارہ بھی شاذ و نادر ہیں، کلام میں پیچیدگی نہیں ہے، سیدھا سادا کلام وہ استعمال کرتا ہے، کیا تم میں سے کسی نے اس کا کوئی ایسا کلمہ سنا ہو جو سماعت پر بار ہو،؟"

بدیع الزماں کے اس قول کو میں جاحظ کی حمایت میں سمجھتا ہوں مخالفت میں نہیں اس لئے کہ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ادبا میں بہت کم پائے جاتے ہیں لیکن جاحظ میں تھے۔

لغزش جاحظ اپنی وسعت علم، گیرائی فہم اور دانش و بینش کے باوجود کبھی کبھی ٹھوکر بھی کھا جاتا ہے، اور دنیا میں کون ایسا ہے جس سے کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی غلطی نہ ہوئی ہو، وہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا، مثلاً مسعودی نے جغرافیہ میں اس کی ایک غلطی نکالی ہے کہ:-

"سندھ میں مکرون نامی جو نہر ہے جاحظ اسے دریائے نیل کا ایک حصہ سمجھتا تھا، اور دلیل اس پر یہ لاتا تھا کہ اسمیں بھی گھڑیال ہیں جس طرح نیل میں ہیں، کم سے کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ گھڑیالوں کا

عید تیس سے بھی بڑھ جاتا ہے، اور اگر ہزل و مذاق پر اتر آتا ہے تو مزبد[1] سے بھی بازی لے جاتا ہے، تو جاحظ وہ تھا جس سے دل کو سرور اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے، وہ شیخ العرب اور لسان العرب تھا، اس کی کتابیں ایک ایسا باغ ہے، جو کلیوں سے لبریز ہو اور اس کے رسائل ان کے پھل، بڑے بڑے خلفا اس کی عظمت کے قدر شناس تھے، اور امرا اس کی تعریف میں رطب اللسان، بادشاہ اسے اپنا ندیم بناتے تھے، اور علماء اس سے کسب علم کرتے تھے، بڑے بڑے مغرور متکبر اس کے فضائل کو تسلیم کرتے تھے اور عامۂ خلائق اس کی محبت میں سرشار تھی، وہ زبان و قلم دونوں کا مالک تھا، علم و ذہانت دونوں اس کے حصہ میں تھیں، رائے اور ادب پر بھی اسے قابو حاصل تھا نثر و نظم کا بھی وہ بادشاہ تھا، اور فہم و ذکا سے بھی اسے بہرۂ وافر ملا تھا، اس کی عمر اچھی خاصی ہوئی، اس کی حکمت سارے جہان میں بوئے گل کی طرح پھیلی، لوگوں نے اس کے نقش قدم پر چلنا باعث سعادت سمجھا، اس کے نام سے انتساب باعث فخر و نازش مانا گیا اور جنہوں نے اس کی پیروی کی وہ

---

[1] ابواسحٰق مزبد۔ نوادرات و فکاہات میں ید طولیٰ حاصل تھا ۱۲

ہمیں اس کتاب کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن یاقوت نے اس کتاب سے یہ عبارت نقل کی ہے:-

"ہم سے صابئین[1] کی ایک جماعت نے بیان کیا کہ ثابت بن قرہ[2] نے کہا کہ امت عربیا میں تین ہستیاں بہت زیادہ قابل رشک گزری ہیں، ان میں سے پہلی ہستی تو عمر بن الخطاب کی ہے ...... دوسری ذات حسن بصری کی ہے ......[3] اور تیسری شخصیت ابو عثمان الجاحظ کی ہے، جسے خطیب المسلمین، شیخ المتکلمین کہیے تو بجا ہے وہ جب گفتگو کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سحبان[4] کی فصاحت و بلاغت سے کان آشنا ہو رہے ہیں، وہ اگر مناظرہ کرتا ہے تو نظام کو مات کر دیتا ہے۔ اگر سنجیدگی سے کچھ کہتا ہے تو عامر[5] بن

---

[1] کافر [2] پورا نام ابوالحسن ثابت بن قرہ ہے۔ مذہبًا صابی تھا، طبیب و فیلسوف صاحب فضل و کمال تھا، حکمت و ادب میں خاص دستگاہ رکھتا تھا، ۲۲۱ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۸۸ھ میں بمقام بغداد انتقال ہوا ۱۲

[3] صاحب کتاب نے ان دونوں بزرگوں کے متعلق ثابت بن قرہ کی تفصیلی رائے نقل کر دی ہے، لیکن چونکہ اس کا اس موضوع سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، اس لئے اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ (مترجم) [4] سحبان وائل مشہور عربی خطیب، [5] فصاحت و بلاغت میں مرتبۂ خاص کا مالک تھا۔

کے ایک رکن تھے) کہا، ہم ابوسعید سیرانی کی مجلس میں سرگرم تکلم تھے، کہ ایک اختلاف آن پڑا، اور وہ اختلاف ہے جاحظ اور ابوحنیفہ صاحب "النبات"[2] کی فصاحت و بلاغت کے متعلق اور ہم سب تمھیں حَکَم بنانے پر راضی ہیں، اب کہو تمہاری کیا رائے ہے؟

محمد نے کہا، میں ان دونوں کی حمایت یا مخالفت میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا، میں نے کہا بہرحال کچھ تو کہئیے،

محمد نے جواب دیا، ابومحمد نداوۃ کے اعتبار سے زیادہ ہیں اور (ابوعثمان) جاحظ حلاوت کے لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں، ابوعثمان کے معانی دل پر اثرانداز ہوتے ہیں، کانوں کو گراں نہیں گزرتے، ابوحنیفہ کے الفاظ بہت زیادہ شیریں ہوتے ہیں، اور اسالیب عرب کے بہت زیادہ آئینہ دار ہوتے ہیں،

یاقوت کے قول کے مطابق ہنرشناسان علم کلام کی متفقہ رائے یہ ہے

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) میں اس کے سارے اسباب تنعم کے بجلئے اگر مجھے جاحظ کی کتابیں مل جائیں، تو میں اس تبادلہ پر تیار ہوں، ابوسلیمان منطقی اور ابوسعید سیرانی کی جماعت کے ایک بہت ممتاز رکن تھے،

[2] ابوحنیفہ احمد بن داؤد بن ونند الدینوری، مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے، ایک کتاب نباتات پر لکھی، اس میں بہت زیادہ مشہور ہوئے ۲۸۲ھ میں وفات پائی.

کامیاب ہوئے بلاشبہ اسے "حکمت" اور "فضل خطاب" دونو
جوہر بخشے گئے تھے"۔

ابوحیان کہتا ہے، یہ قول ایک صحابی کا ہے، جس کے دل میں اسلام کی ذرا بھی حرمت نہیں ہے، نہ مسلمانوں کا کوئی احترام ہے، اس نے یہ تنقید کی ہے اور حق کو ایسی نظروں سے دیکھا ہے کہ ہوا و ہوس کے جذبات دور کر دیئے ہیں، ایسی عقل سے کام لیا ہے، کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ تعصب فراموش کر گیا ہے، ہم اپنے دوسرے اسلاف و اخلاف کے فضائل و محاسن سے ناواقف نہیں ہیں، لیکن ہمیں اس شخص کی یہ بات پسند آئی کہ جو اگرچہ ہمارا ہمقوم و ہم زبان نہیں ہے اور جو شاید حضرت عمر بن الخطاب کے سوانح حیات پر پورا عبور بھی نہیں رکھتا، اور اسی طرح جاحظ کے علم و ادب پر پوری وسعت نظر بھی نہیں رکھتا، لیکن باایں ہمہ وہ ایسی بات کہتا ہے، اور اس طرح رشک کرتا ہے، اور جاحظ پر اپنے کلام کو ختم کرتا ہے، ایک عیب جو جاحظ میں معائب ہی معائب دیکھتا ہے، لیکن وہ اس سے قطع نظر کر کے اس کی صفائی دیتا ہے۔

ابوحیان کہتا ہے۔ میں نے ابومحمد[1] الاندلسی سے (جو سیرافی کی جماعت

---

[1] پورا نام ابومحمد بن حمود الزبیدی الاندلسی، نحو، لغت اور شعر کے امام تھے۔ جاحظ کے کلام سے بہت دلچسپی رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جنت (باقی اگلے صفحہ پر)

کہ دنیا میں بس تین متکلم گزرے ہیں، جاحظ، علی بن عبیدہ، اور ابو زید بلخی ان میں سے جاحظ تو وہ ہے جس کے الفاظ معانی سے زیادہ ہوتے ہیں اور علی بن عبیدہ وہ ہے جس کے معنی الفاظ سے زیادہ ہوتے ہیں، اور ابو زید وہ ہے، جس کے لفظ و معنی دونوں کا توازن بالکل درست ہوتا ہے، لیکن اس رائے کے باوجود خود یاقوت نے روایت کی ہے، کہ "ابو زید کو" جاحظ خراسان کہا جاتا تھا، جاحظ کی جلالت شان و عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ ابو زید بلخی جیسا فخر روزگار اس کی طرف منسوب کیا جائے۔

ابو الفضل بن عمید ان لوگوں میں سے تھے جو جاحظ کے پرستاروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں، اسی کے اسلوب و مذہب کے وہ عامل تھے اگر کوئی انہیں جاحظ ثانی کہدیتا تو بہت خوش ہوتے، ان کا سینہ جاحظ کی عظمت و بزرگی سے بھرا ہوا تھا، اگر کوئی صاحب آداب و علوم ان کے پاس آتا اور وہ اس کا امتحان لینا چاہتے کہ عقل و ذہانت میں

لے۔ علی بن عبیدہ الریحانی نہایت ذکی و ذہین شخص تھا، مامون الرشید کے صاحب الخاص لوگوں میں شمار ہوتا تھا، فصاحت و بلاغت میں بھی بڑا پایہ رکھتا تھا، حکماء کے طرز پر اس کی بہت سی کتابیں ہیں، بعض لوگوں نے اس پر زندقہ کا الزام بھی لگایا ہے لیکن یہ غلط ہے بلکہ معتزلہ کی جماعت کا ایک رقیع شخص تھا۔ ۱۲

کیا ہے، تو پہلے تو وہ بغداد کے متعلق اس کی رائے دریافت کرتے، اگر
وہ بغداد کے خصوصیات و محاسن سے واقفیت کا ثبوت دیتا تو گویا یہ اس
کے فضل وعقل کا مقدمہ ہوتا، پھر جاحظ کے متعلق پوچھتے تھے، اگر دیکھتے کہ
اس کے انداز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ
کیا ہے، اس کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے، اس کے بحر علم وکلام سے جرعہ
نوشی کی ہے تو اس کے متعلق فیصلہ کر دیتے کہ اس کی پیشانی پر علم
ادب کا نشان چمک رہا ہے اور اگر دیکھتے کہ یہ شخص بغداد کی برائی کر
رہا ہے، جاحظ کے واجبات و معارف سے ناآشنا ہے، تو پھر وہ چاہے
جتنے محاسن رکھتا ہو سب بے کار۔

ابوالقاسم سیرانی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے استاذ ابوالفضل بن
العمید وزیر کے دولت خانہ پر حاضر تھے، باتوں باتوں میں جاحظ کا
ذکر نکل آیا، حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کی برائیاں بیان
کرنا شروع کیں، لیکن وزیر صاحب خاموش رہے، جب وہ چلا
گیا تو میں نے پوچھا تعجب ہے، آپ اس آدمی کی باتوں پر خاموش
رہے، حالانکہ اور لوگوں سے آپ خوب بحث کرتے ہیں،

انہوں نے جواب دیا اس کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ صورت یہ
تھی کہ اسے اس کے جہل پر باقی رہنے دیا جاتا، اگر میں اسے روک کے

مشرق کے طلبہ ہمارے بادشاہوں کے ہاں اس لئے شرف وعزت کے مستحق سمجھے جاتے تھے کہ وہ جاحظ سے شرف ملاقات حاصل کر چکے ہیں، اتفاقاً اسی زمانہ میں اس کی ایک کتاب "التربیع والتدبیر" آئی اس کے بعد ہی اس کی دوسری کتاب "البیان والتبیین" آئی، پھر میں نکل کھڑا ہوا، اور کسی مانع کی پروا نہیں کی، جب بغداد پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ [illegible]زیں ہے، ادھر کا قصد کیا، تو معلوم ہوا، وہ بصرہ جا چکا، بصرہ جب پہونچا تو خیر اس کے سامنے حاضری کا موقع حاصل ہوا، جاحظ بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد دس بے ریش و بروت میں لڑکے بیٹھے ہوئے تھے سوا اس کے کسی اور کی اس مجلس میں داڑھی تھی ہی نہیں، اس منظر سے میں کچھ گھبرا سا گیا، میں نے پوچھا،

"تم سے ابوعثمان کون ہے"؟

اس نے میری طرف گھور کے دیکھا اور کہا،

"کہاں سے آئے ہو؟"

میں:۔ "اندلس سے"

جاحظ:۔ احمقوں کی سرزمین، اچھا نام کیا ہے؟"

میں "سلام"

جاحظ "ایک کتے کا نام، ابن"؟

دلائل پیش کرنے لگتا تو وہ جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور لے
ابوالقاسم وہ آدمی بن جاتا، جاحظ کی کتابیں پہلے عقل سکھاتی ہیں پھر
علم وادب اور یہ میں نہیں چاہتا کہ وہ آدمی بنے!

ابن عمید کہتے ہیں، تین علوم ایسے ہیں کہ تمام دنیا ان کے بارے
میں تین آدمیوں کی "عیال" ہے:۔

فقہ میں امام ابوحنیفہ،
کلام میں ابوالہذیل العلاف[1]،
فصاحت وبلاغت میں ابوعثمان جاحظ۔

ابومحمد الحسن بن عمرو النجرمی کا ایک عجیب ولچسپ واقعہ بیان کیا جاتا
ہے وہ کہتے ہیں کہ میں اندلس میں تھا، میں نے سنا کہ یہاں جاحظ کے
ایک شاگرد ہیں جنہیں سلام بن یزید کہتے ہیں، اور ابوخلف کنیت کرتے
ہیں، میں ان کے پاس گیا، وہ ایک مسن آدمی تھے، میں نے ان سے
جاحظ کی ملاقات کا حال دریافت کیا اس لئے کہ جاحظ تو کبھی اندلس
میں آیا نہیں تھا، انہوں نے کہا:۔

---

[1] ابوالہذیل العلاف بصری، ان کا شمار اکابر معتزلہ اور فاضل اہل کلام میں کیا
جاتا ہے، صاحب علم ونظر بزرگ تھے، منطق وفلسفہ میں متقدمین کی تمام کتابوں
پر نہایت وسیع نظر رکھتے تھے۔

اور اصول عمرانیت بھی لے گئے، انہوں نے وہاں مدنیت قایم کی، حضارت قایم کی، انسانیت کے شرف و بزرگی کا راستہ کھولدیا، لیکن جب وہ عہد مسعود ختم ہوگیا، ان کی قوت عزیمت ضعیف پڑتی گئی، ان کی ہمت دبتی گئی، تاآنکہ سب کچھہ ختم ہوگیا،

تصنیفات کی شہرت

عرب انشاپردازوں میں شاید کسی شخص کی کتابوں نے وہ شہرت دوام اور ہردلعزیزی نہیں حاصل کی جو جاحظ کی تصنیفات کو حاصل ہوئی، جب بھی وہ کوئی کتاب یا رسالہ لکھتا تھا، تو لوگ اسپر ٹوٹ پڑتے تھے، اس کے نسخے ہاتھوں ہاتھ جاتے تھے، کوئی زبانی یاد کرتا تھا، کوئی نقل کرتا تھا، غرض ایک دھوم مچ جاتی تھی،

عالموں کی مجلسیں اور ادیبوں کی محفلیں جاحظ اور اس کی تصنیفات کے ذکر سے بھری رہتی تھیں، جہاں کسی شہر میں کوئی کتاب پہنچی، بس اس کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوگیا،

ابوحیان توحیدی کہتے ہیں کہ ہم سے علی بن عیسیٰ نحوی[۱] بیان کرتے

---

[۱] ابوالحسن علی بن عیسیٰ بن عبداللہ الرمانی، اخشیدی اور وراق سے مشہور ہیں لیکن زیادہ تر "رمانی" ہی کہے جاتے ہیں، مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے تھے بہت متکلم تھے۔ ۲۷۹ھ میں ولادت ہوئی اور ۳۸۴ھ میں وفات۔

میں "ابن یزید"

جاحظ۔ "بہت خوب، کنیت؟"

میں:۔ "ابو غلف"

جاحظ "سگ زبیدہ کی کنیت؟ تشریف کیوں لائے؟"

میں:۔ علم حاصل کرنے"

جاحظ "تشریف لے جایئے، کامیابی مشکل ہے"

میں:۔ "آپ نے انصاف نہیں کیا، میں طرح طرح کی مصیب

برداشت کر کے یہاں تک پہونچا ہوں۔"

جاحظ:۔ تم نے میرے ارگرد بیس لڑکے دیکھے، سوا میرے کسی

داڑھی نہیں تھی، پھر مجھے پہچاننے میں دقت کیا پیش آئی"؟

"ان تمام باتوں کے باوجود میں جاحظ کے ہاں بیس سال تک مقی

میرا خیال ہے کہ جاحظ نے سرزمین اندلس کے متعلق جو کچھ کہ

بالکل بجا و درست ہے، عربوں کے دخول سے بیشتر اس میں مجد

شرف کا کوئی سامان نہیں تھا، نہ کوئی تمدن تھا، نہ تہذیب

عربوں نے جب اسے فتح کیا تو وہ اپنے ساتھ صرف فوج و سپاہ

لے گئے، بلکہ عقل وسیع، ذہن صافی، علوم صالح، حضارۃ

ہمت مرداں، کے خزانے بھی لے گئے، وہ اپنے ساتھ جرا

ایک مجلس میں ابو ہفان سے پوچھا گیا، کہ تم جاحظ کی ہجو کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ وہ تمہیں چھیڑنے سے باز نہیں آتا، اس نے جواب دیا، خدا کی قسم اگر جاحظ ایک معمولی سا رسالہ بھی لکھدے تو اس کی شہرت چین تک پہونچے گی، اور میں اگر ایک ہزار بیتیں بھی کہہ ڈالوں تو ہزار برس تک وہ یوں ہی رہیں گی،

القاضی الفاضل[۱] جیسا شخص اقرار کرتا ہے، کہ تمام انشا پردازان عہد جاحظ اس کی کتابوں سے نفع اٹھاتے تھے،

اہل بصرہ اہل کوفہ سے تفاخر کیا کرتے تھے، اور اسی طرح اہل کوفہ اہل بصرہ سے. خطیب بغدادی بیان کرتے ہیں، کہ بصرہ کے لوگ کوفہ والوں سے ان کتابوں پر تفاخر کیا کرتے تھے، کتاب الحیوان للجاحظ، کتاب سیبویہ کتاب العین للخلیل.

ابو القاسم اسکافی کہا کرتے تھے، کہ تین چیزیں ہیں جن کو میں بلاغت کا معیار سمجھتا ہوں (۱) قرآن مجید (۲) کلام جاحظ (۳) اور بحتری[۲] کے اشعار،

---

[۱] ابو علی عبد الرحیم القاضی الفاضل، صلاح الدین ایوبی کا وزیر با تدبیر، جو اپنی اصابت رائے، سیاست دانی، فصاحت، بلاغت، ذکاوت، اور بہت سے ممتاز خصائص میں مشہور نام ہے، ولادت سنہ ۵۲۹ ہجری میں بمقام عسقلان ہوئی، اور وفات سنہ ۵۹۶ھ میں بمقام قاہرہ ہوئی ۱۲

[۲] ابو عبادۃ الولید بن عبید البحتری مشہور شاعر تھے ولادت سنہ ۲۰۶ھ وفات سنہ ۲۸۴ھ

تھے کہ میں نے اپنے شیخ ابن رخشید کو کہتے ہوئے سنا کہ

"جاحظ نے اپنی کتاب "الحیوان" میں اپنی تمام کتابوں کی فہرست لکھدی ہے، اس نے "الفرق بین النبی والمتنبی" اور "دلائل النبوۃ" کا "الفرق" کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور "الفرق" کا ذکر چوتھی جلد میں پھر کیا ہے، میں نے دونوں کتابیں دیکھنا چاہیں اور ان دونوں میں سے ایک ہی پر میں کامیاب ہو سکا، یعنی "دلائل النبوۃ" پر جسے غلطی سے "الفرق" بھی کہتے ہیں، مجھے اپنی اس ناکامیابی پر افسوس ہوا، جب میں مصر سے مکہ میں داخل ہوا تو عرفات میں (جہاں دنیا بھر کے لوگ موجود تھے، اور ایسا عجیب وغریب منظر تھا، کہ بیان نہیں کیا جا سکتا تھا) میں نے پکارنا شروع کیا، خدا اس شخص پر رحم کرے جو "الفرق بین النبی والمتنبی للجاحظ" کا مجھے پتہ دیدے، لیکن یہ ندا بے اثر رہی اور کسی نے کبھی اس کا اعتراف نہ کیا، نہ پتہ بتایا، ابن رخشید کہتے ہیں اس سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے دل سے کہہ سکوں کہ میں جو کچھ کر سکتا تھا، کر چکا۔"

یاقوت کہتا ہے ابو عثمان جاحظ کی فضیلت کو یہ کافی ہے کہ ابن رخشید جیسا یگانۂ روزگار جو فلسفہ کا ایک بڑا مبصر اور معتزلہ کا ایک نہایت گراں پایہ سردار تھا، جاحظ کی کتابوں کو اس درجہ عزیز و محبوب رکھتا تھا کہ عرفات و بیت الحرام میں ندا دیتا رہا۔

جاہلیت میں عادت تھی کہ سوتیلا لڑکا اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی ماں سے نکاح کر لیا کرتا تھا) لیکن جاحظ نے اس افترا کے تار پود بکھیر کے رکھ دیئے ہیں، وہ کہتا ہے کہ ان سے کنانہ کی کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی، نہ از قبیل ذکر نہ انثیٰ، لیکن ان کی بھتیجی برہ بن مر بن اد بن طانجہ تھیں جن کی کنانہ بن خزیمہ سے شادی ہوئی تھی، اور ان سے نضر پیدا ہوئے تھے، یہ صرف دو ناموں کا ایک ہوتا ہے، اس سے اتنی غلط فہمی پھیلی ..... یہی وہ صحیح مسلک ہے جس پر اہل علم و اہل نسب کا اتفاق ہے، جاحظ کہتا ہے کہ اس کے علاوہ جو شخص عقیدہ قائم کرے کفر کا مرتکب ہوگا ..... میرا تو یہ خیال ہے کہ جاحظ اپنے اس کارنامہ کی بنا پر یوم آخرت میں ماجور ہوگا،

تحقیق علمی ہی کے خیال سے اس نے متعدد شہروں میں سفر کیا، وہ مصر بھی گیا، اور وہاں ایک عرصہ دراز تک مقیم رہا اور اپنے تجربات کی آزمائش کرتا رہا۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "حسن المحاضرہ" میں جہاں ان اہل علم کا ذکر کیا ہے جنہوں نے مصر کا سفر اختیار کیا، ان میں جاحظ کا ذکر نہیں کیا شاید اس لئے کہ وہ معتزلی تھا، میں سمجھتا ہوں یہ مختصر نمونہ اس باب میں کافی ہے،

فن ترجمہ اور جاحظ گزشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی

ابن درید کے سامنے دنیا کی مسرت افزا چیزوں کا ذکر کیا گیا، انہوں نے کہا یہ چیزیں تو زیادہ سے زیادہ "فردوس نظر" ہو سکتی ہیں، وہ چیزیں کہاں ہیں جو دل کو طراوت بخشتی ہوں، لوگوں نے پوچھا وہ کیا؟ کہا جاحظ کی کتابیں، محدثین کے اشعار اور ابو العینا کے نوادر،

ابو محمد اندلسی کہا کرتے تھے کہ جنت کے سارے سامان تنعم پر میں جاحظ کی کتابوں کو ترجیح دیتا ہوں،

پایۂ تحقیق و شوق سفر جاحظ ادب میں فرد فرید تھا، نہ صرف ادب میں بلکہ تمام علوم و فنون میں وہ یکساں مہارت رکھتا تھا، وہ ان لوگوں میں تھا، جو مسائل علمیہ سے دلچسپی لیتے ہیں، اور اہل بحث و نظر کی طرح گفتگو کرتے ہیں، اس نے نسابین کی اس بڑی غلط فہمی کو رفع کیا جسے انہوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے نہ معلوم کیا سے کیا کر دیا تھا، مثلاً زبیر بن بکار سے روایت کی جاتی ہے کہ ان کا خیال یہ تھا، کہ ام نضر بن کنانہ ابن خزیمہ کا نام برۃ بنت مر بن اد بن طابخہ تھا، اور کنانہ نے اپنے باپ خزیمہ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا، تب نضر کی پیدائش ہوئی (جیسی کہ عرب

---

[1] ابو بکر محمد الحسن بن درید الازدی فن لغت و ادب کے امام، ۳۲۱ھ ہجری میں بمقام بغداد فوت ہوئے ۱۲

دیکھا اسی کا عربی میں مترادف تلاش کیا اور اسے اس کی جگہ پر رکھدیا یہاں تک کہ ساری کتاب کا ترجمہ ہوگیا، ظاہر ہے کہ یہ طریقہ حد درجہ مہمل ہے اس لئے کہ مترجم پوری زبان عربی پر مہارت تو رکھ نہیں سکتا تھا کہ ہر غیر زبان کے لفظ کے مقابلہ میں بالکل ویسا ہی وسیع المفہوم لفظ عربی سے تلاش کر کے اس کی جگہ پر رکھدیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کتاب نہ عربی ہی ہوتی تھی اور نہ عجمی، اس طریقہ ترجمہ سے بہت نقصان پہنچا، اور یونانی، فارسی ہندی، سریانی اور لاطینی کے بہت سے کلمات اسی طرح رہ گئے، مخصوص ترکیبیں دوسری زبان کی ویسی مخصوص ترکیبیں نہ حاصل کر سکیں، مجازات واستعارات کے استعمال میں بھی یہی صورت رہی،

دوسرا طریقہ حنین[1] بن اسحٰق اور عباس بن سعید جوہری[2] کا ہے وہ یہ کہ ترجمہ کرنے والا پورا جملہ پڑھ لیتا ہے، اپنے ذہن میں اس کے معنی مقرر کر لیتا ہے پھر اسے ایسے عربی جملہ میں منتقل کرتا ہے کہ پورا پورا مفہوم ادا ہوتا ہے خواہ الفاظ ہم آہنگی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں: ظاہر ہے یہ اصول

---

[1] ابو زید حنین بن اسحاق عبادی، علوم اوائل کے ماہر تھے، طبیب تھے، بہت سی قدیم کتابوں کو عربی میں منتقل کیا ہے، یونانی، سریانی اور لاطینی خوب جانتے تھے، بعض خلفا کتاب کے برابر سونا تلوا دیا کرتے تھے، ۲۶۰ھ ہجری میں وفات ہوئی،

[2] العباس بن سعید الجوہری بہت بڑے فلکی اور منجم تھے، ارصاد (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھو)

میں کسی غیر زبان کی کوئی ایسی کتاب منتقل نہیں ہوئی، (عام اس سے کہ وہ کسی علم وفن سے تعلق رکھتی ہو) جسے جاحظ نے پورے طور سے ضبط بلکہ بقول بعض "ہضم" نہ کر لیا ہو، اگرچہ اس زمانہ میں نہ پریس کی یہ عالمگیر ترقیاں تھیں نہ ہوتیں کتابوں تک پہونچنے کا ذریعہ سفر تھا یا خود نقل کرنا تھا یا کتب فروشوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا تھا،

جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا اور وہ گرہیں جو شروح وحواشی تعلیقات وتفاسیر وتاویلات میں بعض اہل بحث ونظر مثلاً فارابی، ابن سینا ابن رشد اور غزالی نے سقراط وافلاطون، بقراط وارسطو، جالینوس وفیثاغورث وغیرہ کی کتابوں میں پیدا کر دی تھیں، اور علماء ومفکرین حیران تھے، کہ کیا صورت نکلے کہ اطمینان حاصل ہو، جاحظ نے اس دشوار گزار راہ میں بھی رہنمائی کی اور ان گرہوں کی گرہ کشائی کی،

قبل اس کے آپ کے سامنے جاحظ کی رائے پیش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوب نقل اور طریق ترجمہ کا ایک مختصر سا نقشہ پیش کر دیا جائے،

اس زمانہ میں نقل وترجمہ کی دو صورتیں تھیں:۔

ایک تو وہ طریق تھا جسے یوحنا بن لبطریق اور ابن ناعمہ الحمصی کا طریقہ سمجھنا چاہیئے، یعنی لفظ بہ لفظ رکھنا، جس لفظ کو یونانی یا کسی اور زبان میں

یہ ہیں جاحظ کے خیالات نقل و ترجمہ کے بارے میں اس طریقہ سے اس نے گویا نقل و ترجمہ کا راستہ روشن تر کر دیا ہے۔

اعتزال اسلام میں

قبل اس کے کہ جاحظ کا مسلک اعتزال پیش کیا جائے، نامناسب نہ ہوگا، اگر اعتزال کے نشو و نما وغیرہ پر بھی ذرا بسط کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے۔

معتزلہ یا قدری یا اہل عدل و اسلام جو چاہیئے کہیئے وہ جماعت ہے جو مضبوط اور صاحب فکر و عمل جماعت ہے، اس کے شیوخ طلیق اللسان اور صاحب بیان تھے،

یہ جماعت پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ظہور پر آئی، یہ زمانہ ہے کہ خوارج کا ایک فرقہ "ازارقہ"[1] زوروں پر ہے۔

بصرہ اور اہواز میں خاص طور سے اس کے اثرات و نقوش قائم تھے ان کا معاملہ بہت زیادہ نازک ہو گیا تھا، عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت اور حجاج بن یوسف کے زمانۂ ولایت (عراقین) میں یہ صورت اور زیادہ کثت ہو گئی تھی، گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کیا سمجھا جائے؟ یہ ایک سوال پیدا ہوا، ہر جماعت ہر فرقہ اور مذہب نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، جن میں سے "ازارقہ" کا خیال یہ تھا کہ گناہ خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ اس کا مرتکب مشرک ہے

---

[1] خوارج کا سب سے بڑا فرقہ نافع بن ازرق کی طرف منسوب

بہت زیادہ کامیاب ہے، اسی لئے لوگوں کا خیال ہے کہ حنین بن اسحاق کی کتابیں جو طب، منطق، طبیعیات، اور الٰہیات سے متعلق ہیں وہ کسی قسم کی تہذیب و اصلاح کی محتاج نہیں ہیں، ہاں علوم ریاضی میں ان کی جو کتابیں ہیں وہ بلاشبہ نظر ثانی کی محتاج ہیں اس لئے کہ اس فن میں انہیں پورا عبور نہیں حاصل تھا، اس زمانہ کا یہ دستور تھا نقل و ترجمہ کا۔

اب حسب وعدہ ہم جاحظ کا "قول فیصل" اس باب میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

"مترجم ان مفاہیم کو ہرگز ادا نہیں کر سکتا جن کا حکیم نے لحاظ رکھا ہے، نہ ان نکتوں اور حقائق کو سمجھ سکتا ہے، جو کتاب میں بیان کئے گئے ہیں، جب تک وہ خود اس علم یا فن میں جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے، اصل مصنف کی سی استعداد نہ رکھتا ہو، مترجم کیلئے ضروری ہے، کہ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس میں اپنی مادری زبان کی سی مہارت رکھتا ہو۔

ہمارا یہ قول تو کتب ہندسہ، تنجیم، حساب اور موسیقی کے متعلق تھا لیکن قرآن مجید وغیرہ میں ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے"

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) اور اس کے آلات میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے، ان کی زیج مشہور ہے، اکابر مہندسین و حساب میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۲۔

کوئی کبیرہ گناہ کرتا ہے تو وہ فاسق ہے لیکن ایمان اور اسلام کی اس سے نفی نہیں ہوتی،

لوگ انہی تخیلات میں تھے کہ اسی زمانہ میں ایک شخص حسن بصری کے پاس آیا، وہ بصرہ والی مسجد میں اپنی مجلس میں رونق افروز تھے، اس نے سوال کیا" یاامام الدین! ہمارے زمانہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے، جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتی۔ کبیرہ ان کے نزدیک ایسا کفر ہے کہ ملت سے خارج کردیتا ہے، یہ تو ہوئے " وعیدیہ" (خوارج) ایک دوسری جماعت ہے وہ کہتی ہے کہ ایمان کے ساتھ معصیت کچھ نقصان نہیں پہنچاتی اور کفر کے ساتھ اطاعت بے سود، یہ لوگ "مرجیۂ" کہلاتے ہیں، پھر آپ اس بارہ میں کیا فرماتے ہیں؟ حسن بصری نے جب یہ سنا تو وہ غور کرنے لگے، قبل اس کے کہ وہ کوئی رائے قائم کرکے جواب دیں، واصل بن عطا جواب دے بیٹھے کہ صاحب گناہ کبیرہ نہ تو مومن مطلق ہے نہ کافر مطلق، بلکہ وہ ان دونوں کے درمیانی راستہ میں ہے، حضرت حسن کو ان کی اس جلد بازی سے غصہ آگیا، وہ اس جرأت نازیبا پر خفا ہوئے تو واصل اپنے ساتھیوں کو لے کر اٹھ گئے، اور مسجد کے ایک ستون کے پاس بیٹھ کر اپنی رائے ظاہر کرنے لگے، اسباب و علل بیان کرنے لگے، مقدمات و نتائج ترتیب دینے لگے، حسن بصری نے ایک شاگرد عمرو بن عبید کو واصل

چونکہ اس فرقہ کے نزدیک مشرک کی اولاد بھی مشرک ہوتی تھی اس لئے عورتوں اور بچوں کا قتل واجب تھا، عام اس سے کہ وہ اہل اسلام سے ہوں یا کسی اور مذہب سے مگر ہوں "مشرک"۔ "صفریہ"[1] نے بھی ان کی موافقت کی لیکن ان کے خیال میں بچوں کا قتل ناجائز تھا "نجدات"[2] کا فتویٰ یہ تھا کہ وہ گناہ کبیرہ جس پر امت نے اجماع کر لیا ہو، اس کا مرتکب تو بلاشبہ مشرک و کافر ہے لیکن جس گناہ پر امت میں اختلاف ہو تو اسے اہل فقہ کے اجتہاد پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ "اباضیہ"[3] کا قول یہ ہے کہ جس گناہ میں خدا کی طرف سے وعید ہو اور کرنے والا اسے جانتا ہو جو خدا کی طرف سے وعید آئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو، تو وہ کفران نعمت کا مرتکب ہوگا لیکن ایسا کافر نہیں ہوگا، جس نے کفر یا شرک کیا ہو؟ حسن بصری اور ان کے ہم خیال بزرگوں کا خیال یہ ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ منافق ہے۔

لیکن جمہور امت کا فیصلہ یہ ہے کہ اس امت مومنہ کا مرتکب گناہ کبیرہ مسلمان تو ہے اپنے اس اعتقاد کی بنا پر جو اس کو اللہ سے ہے اس کی نازل کی ہوئی چیزوں پر ہے، رسول اور کتب آسمانی پر ہے، البتہ وہ اگر

---

[1] خوارج کا ایک فرقہ زیاد بن اصفر کی طرف منسوب ہے۔

[2] خوارج کا ایک فرقہ جو نجدہ بن عامر کی طرف منسوب ہے

[3] خوارج کا ایک فرقہ جو عبداللہ بن اباض کی طرف منسوب ہے

کو پیدا کیا، ایجاد کیا۔ وہ اشباہ و امثال سے قطعاً بری ہے، نہ کوئی مکان اس کا حصر کر سکتا ہے، نہ کوئی زمانہ اس کو محدود کر سکتا ہے، نہ وہ جسم ہے، نہ عرض ہے، نہ عنصر ہے، نہ جزو ہے، نہ جوہر ہے، وہ تمام چیزوں کا صورت گر ہے، وہ عالم بالذات ہے، عالم بعلم نہیں، وہ قادر لذاتہ ہے، حی بالذات ہے، اس کے صفات بھی قدیم ہیں، اور معانی اس کے ساتھ ساتھ قایم ہیں، قدم (قدامت) میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یہ اصول اقوال فرقہ "مجسمہ"[۱] کے رد میں وضع کیا گیا ہے۔

(۲) العدل ——— یعنی اس بات کا اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، فساد کو نہیں پسند کرتا ہے، اور شر کا صدور اس سے اسی وقت ہوتا ہے، جب بندوں کے لئے اس میں کوئی مصلحت ہو اور اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے، وہ بندوں کی مصلحت کے لئے ہوتا ہے، بندوں سے جو خیر و شر، صلاح و فساد کے حرکات سرزد ہوتے ہیں، ان کا انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائیگا، یعنی اچھی باتوں پر ثواب اور بری باتوں پر عذاب، اس لئے کہ ان کو جو قدرۃ تفویض کی گئی ہے، اس کی بنا پر وہ خلق افعال پر قادر ہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہتا، تو وہ قوۃ و قدرت جب چاہتا سلب کر لیتا، اور جب چاہتا باقی رہنے دیتا۔ اگر چاہتا

---

[۱] ایک قدیم فرقہ جو اعضاء انسانی کی طرح اللہ کو بھی صاحب اعضا مانتا ہے،

کے پاس مناظرہ کے لئے بھیجا۔ مناظرہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمرو بن عبید بھی واصل سے مل گئے۔

معتزلہ نام کیوں پڑا؟ اس میں کئی اقوال ہیں، مثلاً حسن بصری سے جب واصل نے مفارقت اختیار کی تو انہوں نے کہا، "واصل ہم سے جدا ہو گئے۔" قتادہ بن دعامہ حسن بصری کی وفات کے بعد جب ان کی مجلس میں بیٹھے تو انہوں نے عمرو بن عبید اور ان کے معتقدین کو "معتزلہ" کہا وہب بن منبہ کہتے ہیں، کہ عمرو بن عبید اور ان کے اصحاب جب حسن بصری سے الگ ہو گئے تو "معتزلہ" کہلانے لگے،

معتزلہ کے فقہانے پانچ اصول بتائے ہیں کہ یہی مذہب اعتزال کی اساس و بنیاد ہیں، جس نے ان کو پورے طور سے مانا وہی "معتزلی" ہے اور جس نے ان میں کچھ کم یا زیادہ کیا وہ اس "شرف" کا مستحق نہیں ہے،

(۱) **التوحید**:۔ یعنی اس بات کا اعتقاد کہ خدا ایک ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے، وہ قدیم ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے حادث ہے، حواس کا ادراک کسی طرح بھی اس دنیا میں نہیں کر سکتے ہیں، اور نہ آخرت میں وہ کسی طرح بھی دیکھا جا سکتا ہے، اسی نے تمام چیزوں

لہ۔ اعتزال کے معنی ہیں، ترک کر دینا، چھوڑ دینا، الگ ہو جانا۔

یہ اصول ان لوگوں کے خلاف وضع کیا گیا ہے جو جواز کذب باری کے قائل ہیں۔

(۴) **اسماء و احکام** . . . . یعنی اس کا اقرار کرنا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے نہ مومن بلکہ بین بین ایک چیز ہے لیکن اس کا شمار کفر و اسلام کے درمیانی راستہ یعنی "فسق" میں ہوگا، اگر وہ اسی فسق کی حالت میں مرگیا تو جہنم کا دائمی عذاب ہے اور وہ ہے۔ ہاں کافروں کا سا خلود فی النار نہیں ہوگا،

یہی وہ اصل الاصول ہے، جسے اعتزال کی جڑ کہنا چاہیئے، اس لئے کہ واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کے نزدیک عبارت ہے، عادات و خصائل خیر سے، اگر خصائل خیر کسی شخص میں جمع ہیں، تو بلاشبہ وہ مومن ہے، مومن ایک اسم مدح ہے اور فاسق چونکہ اس خبر سے خالی رہتا ہے اس لئے وہ اس کا مستحق کب ہے، کہ وہ بھی اس شرف سے مشرف ہو؟ اس لئے نہ اسے مومن کہتے ہیں نہ کافر، اس لئے کہ خصال خیر اور اس کی ماتحت چیزوں کا وہ انکار نہیں کرتا، لیکن اگر دنیا سے بغیر توبہ کئے ہوئے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے بعد رخصت ہو جائے، تو بلاشبہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اس لئے کہ "دار الجزا میں" یا جنت ملے گی یا دوزخ "(فریق فی الجنۃ و فریق فی السعیر)[1]

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھو

تو مخلوق کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا، اور معصیت سے روک سکتا تھا لیکن اس لئے نہیں کیا، اپنے بندوں کو اس نے ایسی تکلیف نہیں دی جو ان کی طاقت سے باہر ہو، اور نہ ایسی بات چاہی جو ان کی مقدرت میں نہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے حسنات کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کا نگہدار ہے ان تمام سیئات سے بری ہے، جن سے اس نے منع فرمایا ہے، کوئی شخص کسی چیز پر قادر نہیں ہے مگر اس قدرت پر جو اسے تفویض کی گئی ہے، یہ اصول "مجبرہ[1]" کے خلاف وضع کیا گیا ہے جن کے سردار جہم بن صفوان[2] تھے۔

(۳) الوعد الوعید یعنی اس بات کا اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ صادق الوعد ہے، وعید کا نافذ کرنے والا ہے، جو مسلمان طاعت و استقامت پر وفات پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے نوازتا ہے، اگر کسی شخص نے گناہ کبیرہ کیا ہو، اور بغیر توبہ کے مر گیا ہو، تو وہ دائمی طور سے جہنم کا مستحق ہے، لیکن اس کا عقاب کافر کی سزا سے کم ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ارشادات بدلتے نہیں ہیں۔

---

[1] ایک فرقہ جس کا عقیدہ یہ تھا، کہ انسان مجبور محض ہے۔ ۱۲

[2] جہم بن صفوان ترمذی، فارسی الاصل، فرقۂ جبریہ کے سردار، جہمیہ کی طرف منسوب ہے۔ ۱۳۱ھ میں وفات پائی ۱۲۔

موجود ہوتا، تو میں بلا تامل خلافت اسے سونپ دیتا، سالم ایک انصاریہ عورت کے غلام تھے، عام طور سے سالم "مولیٰ ابی حذیفہ" کے نام سے مشہور ہیں، تو حضرت عمر اگر امامت کو سارے مسلمانوں کے لئے جائز نہ سمجھتے ہوتے تو یہ بات کیسے فرماتے؛ اور سالم کی وفات پر اظہار تاسف کیوں کرتے؛ اس باب میں امام ابوحنیفہ، اکثر مرجئہ، زیدیہ میں سے بھی غالب تعداد، تمام شیعہ، اور راوندیہ کا اختلاف ہے، یہ لوگ سوا قریش کے اور کسی کو امامت کا مستحق نہیں سمجھتے ہیں، اور دلیل یہ لاتے ہیں "الامامۃ فی قریش"

فرقۂ معتزلہ کے بانی واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کی جب وفات ہوئی ہے اس وقت تک کتب فلسفۂ حکمت، منطق، طبیعیات، اور الٰہیات وغیرہ کا، یونانی، فارسی، رومی، ہندی، اور سریانی زبانوں سے ترجمہ نہیں ہوا تھا، ان دونوں نے اپنی وفات کے وقت اپنے مذہب کو بالکل سادہ حالت میں چھوڑا تھا دلائل و براہان سے محکم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی، بلاغت، عربیت، اور فصاحت بدویت، قوت بیان، اور زور بیان پر اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی۔ لیکن جب اوائل عہد عباسیہ میں یہ علوم عربی میں منتقل کئے گئے، تو لوگوں نے بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا، اسی زمانہ میں علم کلام کی ابتدا ہوئی

(۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر — یعنی اس بات کا اقرار کہ اہل ایمان حدود خداوندی کے بجالانے پر مکلف ہیں اور یہ جو تکالیف ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر لطف ہے، مقصد صرف امتحان ہے اور اس کی آزمائش کہ وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں یا نہیں؟ اور ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ ان باتوں کی طرف دعوت دے اور جو مخالفت کرے اسے خدا سے ڈرائے۔

یہ اصول اس آیۃ پاک کی تعمیل ارشاد ہے" ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر"

یہ ہیں وہ اصول پنجگانہ جنہیں فقہاء معتزلہ نے ترتیب دیا ہے لیکن امامت کے بارے میں بھی ان کا ایک خاص مسلک ہے یعنی انتخاب امام امت کا حق ہے وہ جس میں اس کی صلاحیت دیکھے کہ احکام خداوندی کا اجرا کر سکتا ہے، اور حدود و شریعت نافذ کر سکتا ہے خواہ وہ قریش سے ہو یا کسی اور قبیلہ سے اسے وہ منتخب کرلے اس لئے کہ معتزلہ کسی شخص یا قبیلہ کے لئے امامت کو مخصوص نہیں سمجھتے ہیں "نجدات" کے علاوہ تمام خوارج اور "زیدیہ" کی ایک جماعت معتزلہ سے متفق ہے۔ وہ یہ استدلال پیش کرتے ہیں، کہ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا کہ اگر سالم

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) اس سے خلود فی النار کہاں سے ثابت ہوتا ہے؟ (مترجم)

ابن راوندی[1]، بغدادی[2]، ابن حزم اور شہرستانی[3] کو اس سے خاص طور سے عداوت تھی، ان لوگوں نے جاحظ کی طرف طرح طرح کے قول منسوب کئے ہیں، جو اس کے ہرگز نہیں ہیں اور انہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہنے دیا، بعض کا اس کے انصار و احباب نے جواب بھی دیا ہے، مثلاً مقریزی نے شہرستانی سے یہ روایت نقل کی ہے، کہ جاحظ کہا کرتا تھا کہ قرآن منزّل از قبیل اجسام و اجساد ہے، یہ بھی ممکن ہے وہ آدمی ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حیوان، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر کذب صریح اور افترا محض کیا ہو سکتا ہے کون اسے یقین کر سکتا ہے کہ جاحظ ایسی گری ہوئی باتیں بھی کر سکتا ہے حیرت ہے کہ شہرستانی نے ابن راوندی سے ایسی سخیف بات روایت کیسے کر دی؟ اگرچہ ابوالحسن خیاط نے اپنی کتاب "الانتصار" میں

---

[1] ابوالحسین احمد بن یحییٰ الراوندی، انشا پرداز اور فیلسوف تھے، ان پر زندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ توبہ کے بعد ان کا انتقال ہوا سنہ وفات ۲۹۸ھ

[2] ابومنصور عبدالقاہر بن طاہر التیمی البغدادی صاحب کتاب "الفرق بین الفرق" ۴۲۹ھ بمقام بغداد فوت ہوئے۔ ۱۲

[3] ابوالفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی صاحب کتاب "الملل والنحل" عالم، فاضل فقیہ، محقق، متکلم سب ہی کچھ تھے۔ ۴۷۹ھ میں بمقام شہرستان تولد ہوئے ۵۴۸ھ میں بمقام شہرستان وفات پائی ۔ ۱۲

جس میں ابو الهذیل علاف، ابو اسحاق ابراہیم بن سیار النظام خاص طور سے معروف و ممتاز ہیں، پھر ہمارے "ہیرو" جاحظ کی باری آتی ہے جس کا سارا عالم معترف ہے۔

جاحظ اور اعتزال

تفصیل بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں اعتزال کی نشو و نما کیوں کر ہوئی، واصل بن عطا اور عمرو بن عبید نے اپنے استاذ حسن بصری سے کیوں مفارقت اختیار کی، معتزلہ نام کیوں پڑا، ان لوگوں کے عقائد کیا ہیں، اصول کیا ہیں،

یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ابتدا میں یہ مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا لیکن اس کے باوجود بعد میں اس میں بھی فرقے بنے، جماعتیں قایم ہوئیں، اجتہادی ہوئی اور جدل و بحث کا بازار گرم ہوا،

جاحظ چونکہ شیوخ معتزلہ میں سے تھا۔ وہ مخصوص رائے کا مالک تھا، اور اپنی رائے میں بہتوں سے منفرد بھی تھا، اور ایک جماعت کی جماعت اس کی پیرو بھی تھی، اس لئے ایک پورا فرقہ "جاحظیہ" کے نام سے قایم ہو گیا، اس کی کتابوں میں اعتزال کے متعلق جو کچھ ملتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو اس کے "عنایت فرماؤں" نے ازراہ عداوت و خصومت اس کے سر تھوپا ہے

خیاط کہتا ہے، جاحظ غریب پر یہ بھی بہت بڑا کذب ہے، کسی آدمی کی طرف جو قول منسوب ہے اس کی صداقت جانچنے کے دو ہی معیار ہیں ایک تو یہ کہ اس کے احباب و اصدقا اس کی روایت کرتے ہوں، دوسرا یہ کہ اس کی کتابوں اور رسالوں سے اس کا ثبوت نکلتا ہو، تو کیا جاحظ کی کتابوں میں یہ قول پایا جاتا ہے؟ اس کی کتابیں تو مشہور عالم ہیں انہیں دیکھ لو، یا اس کے احباب و اصحاب میں سے کوئی روایت کرتا ہو، یہ بھی نہیں کسی آدمی کی وفات کے بعد یہی دو صورتیں ہیں جن سے صداقت معلوم ہو سکتی ہے، اور جب ان سے پتہ نہیں چلتا تو ظاہر ہے، یہ بالکل کذب ہے بہتان ہے،

اس کی کتابیں "نظم القرآن"، "اثبات النبوۃ" وغیرہ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اسے اسلام سے کتنی محبت تھی، اور خدائے تعالیٰ اس کے اس عمل خیر کو ضائع نہیں فرمائے گا،

ابن راوندی ہمیشہ معتزلہ کو تشنیع و طعن سے بدنام کیا کرتے تھے انہوں نے جاحظ پر ایک الزام یہ بھی لگایا تھا کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض تھا، نعوذ باللہ من ذالک۔

خیاط نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ ابن راوندی کا جاحظ پر بغض رسول اللہ کا الزام لگانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دوست و دشمن میں تمیز

ان تمام مطاعن کی تردید کردی ہے، جو ابن راوندی نے معتزلہ پر عائد کئے تھے، بالخصوص جاحظ کی بہت صفائی دی ہے، جاحظ کے نقائص و معائب جو مشہور کئے تھے، ان کا ایک ایک کا چن چن کر جواب دیا ہے جوابات حد درجہ دلائل و براہین سے مستحکم ہیں، لیکن اس قول کا اشارہ بھی اس نے نہیں کیا ہے اسی طرح ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب "مقالات الاسلامئین" میں وہ تمام روایات جمع کر دیئے ہیں، عام اس سے کہ وہ اہمیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، لیکن اس قول کا ذب کا انہوں نے ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ ابن قتیبہ، ابن حزم اور بغدادی سب کے سب جاحظ کے دشمن ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ قول نہیں نقل کیا ہے، اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص ایما یا تعریض ہی کے طور پر جاحظ سے اس لغزش کا صدور پا لیتا تو ساری دنیا اس کے طعن و تشنیع اور تحقیر و اہانت سے بھر جاتی لہذا ثابت ہوا کہ یہ قول بالکل غلط ہے اور کوئی عقل مند اسیی حماقت کی بات نہیں کہہ سکتا۔

ابن راوندی کا ایک اور افترا جاحظ پر یہ ہے کہ اس کا قول ہے کہ یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام کو ان کے وجود کے بعد معدوم کر سکے، اس پر ابن راوندی کہتے ہیں، کہ اگر وجود کے بعد کسی جسم کا معدوم کر دینا محال ہے تو عدم کے بعد اس کا وجود بھی مستحیل ہے۔"

قاضی تھے، ابن زیات کو جو وزیر تھے ترجیح دی اور انہی کے ساتھ ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ حیلہ جوؤں اور چغلخوروں کی گرم بازاری ہو گئی اور وزیر اور قاضی دونوں ہی متاثر کئے جانے لگے، ابن زیات کے اتنے کان بھرے گئے کہ اس نے جاحظ کی گرفتاری کا حکم دیدیا، جاحظ بھاگ کھڑا ہوا، اس سے پوچھا گیا، تم بھاگے کیوں؟ اس نے کہا بھائی میں ڈرا کہ تنور میں نہ جھونک دیا جاؤں (ابن زیات نے ایک تنور بنوایا تھا جس سے خفا ہوتا تھا اسے اس میں ڈلوا دیتا تھا، جب تک وہ مر نہیں جاتا تھا، تنور سے گلو خلاصی ممکن نہیں تھی) آخر پھر وہ پکڑے گئے اور قاضی ابوداؤد کے حضور میں پیش کئے گئے، اس حالت میں کہ گردن زنجیر سے بندھی ہوئی تھی، پیر بھی جکڑے ہوئے تھے، اور ایک پھٹی پرانی قمیص زیب بر تھی۔ قاضی کی جب اس پر نظر پڑی تو انہوں نے کہا، خدا کی قسم تو بڑا فراموش کنندۂ نعمت ہے، لیکن شکر ہے کہ زمانے نے تجھے زیادہ مہلت نہ دی۔

جاحظ:۔ اگر آپ مجھے بخشدیں تو انتقام سے یہ کہیں اچھا ہوگا،

ابن ابی داؤد:۔ خدا تجھے غارت کرے، کمبخت، خدا کی قسم تو بہت بڑا الفاظ ہے، بتلا اس آیت کی تاویل کیا کرتا ہے، وکذٰلک اخذ ربک اذا اخذ القریٰ وھی ظالمۃ ان اخذہ الیم شدید"

جاحظ:۔ خدا قاضی صاحب کو اعلیٰ مرتبہ دے، اس کی بہترین تاویل

نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جاحظ سے زیادہ کسی متکلم نے نظم قرآن اور اح
نبوت پر ایسی کتابیں نہیں لکھیں جو ناقل و دلی ہوں، اثبات رسالت او
تصحیح احادیث و اخبار میں اس کی کتابیں مشہور ہیں اور یہ ایسی چیز ہے ک
اس سے زیادہ موکد چیز حب رسول اور تصدیق نبی پر پیش نہیں ک
جا سکتی۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ بڑے قوی دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو ک
اس پر الزام لگایا جاتا ہے وہ سراسر بہتان ہے، وہ جاحظ ہی تھا، جس
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تصحیح کی (جو غلط فہمی کی وج
سے غلط سمجھا جاتا تھا)، اور ثابت کر دیا کہ سب سے زیادہ اشرف و اطہ
نسب حضور ہی کا تھا، کسی گزشتہ باب میں جہاں ام النضر کے نسب سے بحث
کی گئی ہے اس سے حضور کا نسب ثابت ہوتا ہے اس کی تفصیل گزر چکی ہے

جاحظ اور ابن زیات و ابن[1] داؤد

امرار دولت عباسیہ میں جاحظ ایک ممتاز تہ
کا مالک تھا، وہ سب کے سب اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے
اسے پسند کرتے تھے، اور اس کے درجہ کو بلند سمجھتے تھے، ہر شخص یہ چاہتا تھا
کہ جاحظ اس کی پارٹی میں شریک ہو جائے، اس نے بجائے ابو داؤد کے جو

لہ یا ابن دواد (؟) مترجم

بھی وہ مرتبۂ کمال پر پہونچے، لیکن طبیعت کو زیادہ مناسبت تھی نہیں، اس لئے وہ اپنی اس آرزو میں ناکام ہی رہا، پھر اس کی جولانگہ نثر ہی رہی، وہ کہا کرتا تھا، اصمعی سے میں نے شعر حاصل کرنا چاہا سوا غریب ونادر اشعار کے اسے اور کچھ نہیں آتا تھا، پھر میں اخفش کے پہونچا اسے سوا اعراب کے اور کچھ نہیں معلوم تھا، پھر میں نے ابوعبیدہ کا رخ کیا، وہ اخبار، انساب، اور لڑائیوں کے علاوہ ہر چیز میں کورے تھے، جو کچھ میں چاہتا تھا، اس میں سوا انشا پردازوں کے اور کسی سے اپنا مطلب نہ حاصل کر سکا،

جس زمانہ میں اس کو اس فن کے حاصل کرنے کا جنون سوار تھا، وہ کہا کرتا تھا، عروض شعر کے لئے میزان و معیار رکھتا ہے، صحیح وسقیم اور خوب وزشت کا فرق اسی سے معلوم ہو سکتا ہے،

لیکن جب اپنی اس تمنا میں ناکام رہا اور کامیابی کی کوئی صورت بظاہر نظر نہ آئی، تو کتنی دلچسپ بات کہی، کہتا ہے:۔

"عروض ایک مردود علم ہے، ایک مجہول کلام ہے، عقول پر برا اثر ڈالتا ہے، مستفعل اور مفعول کے سوا اس میں رکھا کیا ہے
اس سے نہ حاصل نہ محصول"

شعر کے متعلق اس کی رائے کتنی نپی تلی ہے، کہتا ہے:۔

اس کی تلاوت ہے۔

ابن ابی داؤد:۔ آہنگر کو بلاؤ،

جاحظ:۔ خدا قاضی کو سربلند کرے، کس لئے؟ زنجیریں توڑنے کیلئے یا اس میں اضافہ کے لئے؟

قاضی:۔ تاکہ تجھ سے دور کردی جائیں۔

پس آہنگر لایا گیا، اہل مجلس میں سے بعض نے اشارہ کیا کہ زنجیر اتارتے وقت یہ ذرا دیر تک کام کرے، بس کیا تھا جاحظ نے ایک آفت برپا کردی، اور کہنے لگا ایک مہینہ کا کام ایک دن میں کر، بلکہ ایک دن کا ایک گھنٹہ میں، بلکہ ایک گھنٹہ کا ایک منٹ میں، کمبخت میری ٹانگ دکھتی ہے، مجھے باقی جسم اور جبہ کی پرواہ نہیں ہے، اس پر قاضی صاحب اور دوسرے اہل مجلس ہنس پڑے، قاضی صاحب نے محمد بن منصور سے کہا میں اس کے ظرف پر تو اعتماد کرتا ہوں، لیکن اس کے دین پر نہیں پھر اپنے غلام سے کہا، اسے حمام میں لے جاؤ، پھر زنجیر وغیرہ اتار دی گئی، اور وہ حمام میں داخل کیا گیا، پھر اچھے اچھے کپڑے پہنا کر مجلس میں لایا گیا، قاضی صاحب نے کہا، ابو عثمان اب کیا کہتے ہو؟ جاحظ بڑی دیر تک خوشامد اور تملق کی باتیں کرتا رہا۔

عروض شعر سے دلچسپی جاحظ کی خواہش تھی کہ فن عروض (شعر

میں نے اس کی کتابوں کی استقصا میں اس کی کتاب "الحیوان" پر اعتماد کیا ہے، یاقوت نے اپنی "معجم الادبا" میں جو ذکر کیا ہے اس سے بھی میں نے خوشہ چینی کی ہے، اس کے علاوہ دوسری کتب واسفار بھی پیش نظر رہی ہیں، میں نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ بعض نساخوں نے جاحظ کی کتابوں کے جو مختلف عنوانات دیکر لوگوں کو اس کی تکرار کی وجہ سے مغالطہ میں ڈال دیا ہے، اسے بھی رفع کر دوں، میں نے چاہا ہے کہ فہرست بہت صحیح ثابت ہو، ترتیب حروف ہجا کا لحاظ رکھا ہے ملاحظہ ہو،

(۱) کتاب آل ابراہیم بن المدبر۔ فن مکاتبت میں۔

(۲) " آی القرآن:۔ جاحظ کہتا ہے اس کتاب میں میں نے وہ تمام آیات قرآنی جمع کردی ہیں، جن سے ایجاز و حذف اور زوائد و فضول و استعارات کا فرق معلوم ہو سکے،

(۳) رسالہ فی اثم السکر:۔ بدمستی کے گناہ کے بیان میں۔

(۴) " الی ابی النجم وجوابہ

(۵) کتاب احالۃ القدر علی الظلم

(۶) " الاحتجاج لنظم القرآن

(۷) " احدوثۃ العالم

شعر کی فضیلت تو بس عرب ہی کے لئے ہے اور وہی کہہ سکتا ہے جو عربی جانتا ہو، شعر کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے کسی دوسری زبان میں نقل کیا جا سکتا ہے، اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو اس میں پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے اس کی پسندیدگی رخصت ہو جاتی ہے، اور وہ نثر کی طرح ہو کے رہ جاتا ہے، ہندوستان کی کتابوں کا ترجمہ ہوا، یونان کی حکمتیں عربی میں منتقل کی گئیں، فارسی زبان کا ادب بھی لیا گیا، اس ترجمہ کے بعد بعض کے حسن میں تو اضافہ ہوا اور بعض یونہی ناقص، الخ"

کتابوں کی تعداد اور ان کا مختصر تعارف

مسعودی کا قول ہے کہ جاحظ کی کتابوں سے ذہن میں جلا پیدا ہوتی ہے اس کی کتابیں ہر اعتبار سے بے نظیر و لاجواب ہیں، جب اسے شبہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس سنجیدہ مضمون کو پڑھتے پڑھتے اکتا گیا ہوگا، تو وہ سنجیدگی سے ظرافت کا رخ بدل دیتا ہے، اور ایسی پر مذاق باتیں کرتا ہے کہ آدمی کا سارا تکدر رفع ہو جاتا ہے، اس کی تمام کتابیں اسی خصوصیت سے مخصوص ہیں جماعت معتزلہ میں سلف و خلف کسی میں بھی ایسا فرد فرید نہیں پایا جاتا

(۱۸) کتاب الاسد والذئب

(۱۹) " اصحاب الالہام

(۲۰) " الاصنام :- یہ وہ کتاب ہے جس میں جاحظ نے جاہلیت عرب کے اصنام کا تذکرہ کیا ہے، اور اسی میں نضر بن کنانہ جد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصحیح کی ہے۔

(۲۱) کتاب اصول الفتیا والاحکام۔

(۲۲) الاعتزال وفضلہ :- شاید یہ وہی کتاب ہے جو جاحظ نے "فضیلۃ المعتزلہ" کے نام سے ابن راوندی کی "فضیحۃ المعتزلہ" کے جواب میں لکھی تھی،

(۲۳) کتاب افتخار الشتا والصیف،

(۲۴) " افعال الطبائع۔

(۲۵) " اقسام فضول الصناعات ومراتب التجارات۔

(۲۶) " الامامۃ علیٰ مذہب الشیعہ :- ہو سکتا ہے کہ یہ وہی رسالہ ہو جو اس نے "بیان مذہب الشیعہ" کے نام سے لکھا تھا،

(۲۷) کتاب امامت معاویہ بن ابی سفیان :- اس میں رجال مروانیہ کا ذکر ہے اور بنی امیہ کی تائید ہے،

(۲۸) کتاب امامت ولد العباس :- اس میں وہ مذہب پر دلیلیں لایا ہے

(۸) کتاب الاخبار:۔ دو کتابیں اور ذکر کی جاتی ہیں، ایک تو "کتاب الاخبار وکیف تصح" اور دوسری "تصحیح الاخبار" غالبًا ایک ہی کتاب ہے لیکن نام بدل دیئے گئے ہیں۔

(۹) کتاب الاخطار والمراتب والصناعات

(۱۰) " اخلاق الشطار

(۱۱) " اخلاق الفتیان وفضائل اہل البطالۃ:۔ کتاب التاج میں ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی طرف غلط طور سے منسوب کر دی گئی ہے۔

(۱۲) کتاب اخلاق الملوک

(۱۳) " الاخوان

(۱۴) " الاستبداد والمشاورۃ فی الحرب

(۱۵) " الاستطاعۃ وخلق الافعال:۔ یہ کتاب ان کتابوں میں ہے جن میں جاحظ نے مذہب اعتزال کو ثابت کیا ہے۔

(۱۶) کتاب استطالۃ الفہم:۔ قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب "طراز المجالس" میں لکھا ہے، کہ جاحظ نے اس میں حکماء شعرا کا ذکر کیا ہے۔

(۱۷) رسالۃ فی استنجاز الوعد۔

(۴۷) کتاب بصیرۃ غنام الرُشد۔

(۳۸) کتاب البلدان :۔ جیسا کہ گزر چکا ہے کیا عجب کہ "کتاب الامصار" یہی ہو، ہم نے احتمال مغائرت کے سبب یہاں بھی لکھ دیا۔

(۳۹) کتاب البیان و التبیین :۔ جاحظ نے یہ بے نظیر کتاب لکھی اور قاضی احمد بن ابی داؤد کے حضور میں پیش کی جس کا صلہ پانچ ہزار دینار کی صورت میں ملا، متقدمین میں سے اکابر علما اور اعاظم ادبا کا اس پر اجتماع ہے کہ ادب میں سب سے بہتر کتاب ہے مسعودی کا قول ہے کہ جاحظ کی بہت بے نظیر کتابیں ہیں، لیکن "البیان والتبیین" سب میں فائق ہے اس لئے کہ اس میں نثر و نظم، منتخب و جیدہ اشعار، بلیغ سے بلیغ خطبے بہتر خوبی کے ساتھ جمع ہیں، ابن خلدون کا قول ہے کہ مکتب درس میں ہم نے اپنے اساتذہ سے سنا ہے کہ فن ادب کے اصول وارکان میں چار چیزیں سب سے زیادہ خصوصیت رکھتی ہیں، ایک تو "کامل للمبرد" دوسری "کتاب البیان والتبیین للجاحظ" تیسرے کتاب النوادر لابی علی القالی" چوتھے "ادب الکاتب لابن قتیبہ" ان چار کے علاوہ جو کچھ ہے اس کو انہیں کا "فروع" سمجھنا چاہیئے، مطبع جوائب نے ۱۳۰۱ھ میں بمقام قسطنطنیہ اسے

اور قصہ فدک کا بھی ذکر کیا ہے، حضرت فاطمہ اور حضرت ابوبکر کی گفتگو بھی نقل کی ہے، یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتی ہیں بیان کی ہیں۔

(۲۹) رسالہ فی امتحان عقول الاولیاء۔

(۳۰) کتاب الامثال۔

(۳۱) ″ الامصار:۔ شاید یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر مسعودی نے "البلدون" کے نام سے کیا ہے، ہم نے احتمال مغائرت کے سبب یہاں ذکر کر دیا،

(۳۲) رسالہ فی الامل والمامول

(۳۳) کتاب امہات الاولاد

(۳۴) کتاب الانس والسلوۃ

(۳۵) ″ الاوفاق والریاضیات

(۳۶) ″ البخلاء:۔ جاحظ کی نہایت بدیع کتابوں میں سے ایک ہے اور اس لائق ہے کہ تدبیر منزل کے اصول اس سے استخراج کئے جائیں، معمولی معمولی اشیاء سے کس طرح نفع اٹھایا جائے یہ اور بہت سی قابل ذکر باتیں اس میں موجود ہیں، ۱۳۲۳ھ بمقام مصر طبع ہو چکی ہے۔

(۴۶) رسالہ فی تفضیل النطق علی الصمت: ۱۳۲۴ھ میں بمقام مصر طبع ہو چکا ہے۔

(۴۷) کتاب التفکر والاعتبار۔

(۴۸) " التمثیل

(۴۹) " جمہرۃ الملوک

(۵۰) " الجوابات

(۵۱) " جوابات کتاب المعرفہ

(۵۲) " الجواری

(۵۳) رسالۃ الحاسد والمحسود، ۱۳۲۴ھ میں بمقام مصر طبع ہو چکا ہے

(۵۴) کتاب حانوت عطار

(۵۵) " الحجات: قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب "طراز المجلس" میں اس کا ذکر کیا ہے،

(۵۶) کتاب الحجۃ فی تثبیت النبوۃ

(۵۷) " الحجر والنبوۃ

(۵۸) " الحزم والعزم

(۵۹) " حکایۃ قول اصناف الزیدیہ

(۶۰) رسالۃ الحلیہ

شائع کیا، پھر سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء میرے اہتمام سے مصر سے شائع ہوئی۔

(۴۰) رسالہ فی بیان مذاہب الشیعہ:۔ دیکھو نمبر ۲۶

(۴۱) کتاب تحصین الاموال

(۴۲) " التربیع والتدویر:۔ یہ بھی نہایت عجیب وغریب کتاب ہے اپنے ایک کرمفرما احمد بن عبدالوہاب کی بدصورتی کا جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے، وہ نہایت حسین وجمیل تھے، اسی طرح کے اور بھی بہت سے خرافات واساطیر ہیں، لیکن عبارت کی شگفتگی اور معانی ومفاہیم وقت نظر بہت زیادہ داد طلب ہے سنہ ۱۹۰۳ء میں بمقام لندن رسالہ "مناقب الترک" ورسالہ "فخر السودان علی البیضان" کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

(۴۳) کتاب تصویب علیؓ فی تحکیم الحاکمین:۔ یہ کتاب اب ناپید ہے، صرف ایک ٹکڑا ہمارے ہاتھ لگا ہے، جس میں حضرت علی کے قبول تحکیم کا ذکر ہے،

(۴۴) کتاب التفاح

(۴۵) " تفضیل صناعۃ الکلام:۔ مسعودی کہتا ہے کہ "ہاشمیہ" کے نام سے بھی یہ رسالہ مشہور ہے۔

میں بہ مقام مصر ے جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس سے تو جاحظ کے مفاخر و محاسن کا پایہ بلند ہی ثابت ہوتا ہے۔

(۶۴) رسالۃ فی الخراج

(۶۵) کتاب خصومۃ الطول والعور

(۶۶) " خلق القرآن

(۶۷) " الدلالۃ علی ان الامامۃ فرض

(۶۸) " ذکر ما بین الزیدیۃ والرافضۃ

(۶۹) رسالۃ فی ذم اخلاق الکتاب، مطبع سلفیہ نے ۱۳۴۴ھ میں اسے شائع کیا ہے۔

(۷۰) کتاب ذم الزنا

(۷۱) " فی ذم النبیذ

(۷۲) رسالہ فی ذم الوراقۃ

(۷۳) " فی الرد علی الجہمیہ

(۷۴) " فی الرد علی القولیہ

(۷۵) کتاب الرد علی النصاری ۱۳۴۲ھ میں مطبع سلفیہ اسے شائع کر چکا ہے

(۷۶) " امر سائل الہاشمیات

(۷۷) " الرد علی من الحد فی کتاب اللہ۔

(۶۱) کتاب حیل اللصوص :- ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جاحظ نے اپنی اس جہل کتاب کے ذریعہ سے چوری کی تعلیم دی ہے، ظاہر ہے یہ اس کے، ایک دشمن کا قول ہے، اگر کتاب ہمارے پاس موجود ہوتی، تو صدق و کذب کا پتہ چلانا آسان تھا،

(۶۲) کتاب حیل المکدین :- ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۶۳) کتاب الحیوان :- جاحظ نے یہ کتاب محمد بن عبداللہ الزیات کو بھیجی، تو اس نے اس پہ پانچ ہزار دینار مرحمت فرمائے جاحظ کی نہایت بہترین کتابوں میں سے ہے، ابو منصور بغدادی جن کو جاحظ پر تہمت تراشیوں اور معتزلہ کی عیب جوئیوں میں کمال حاصل ہے، یہاں بھی باز نہیں آئے ہیں، اور کہا ہے کہ یہ بھی "خوشہ چینیوں" کا نتیجہ ہے، کچھ ارسطو سے لے لیا، کچھ شیعہ سے اور کتاب "الحیوان" تیار کر دی، لیکن یہ دروغ محض ہے، عبداللطیف بغدادی کی تلخیص "اختصار کتاب الحیوان" کے نام سے اور ابن سینا کی تلخیص "ارروح الحیوان" کے نام سے موجود ہے، اور خود کتاب الحیوان بھی

۱۳۵ھ
۱۹۰۷ء

(۹۱) کتاب العباسیہ، شاید یہ کتاب وہی ہے جس کا ذکر "امامة ولد العباس" کے سلسلہ میں ہو چکا ہے،

(۹۲) کتاب العثمانیہ:۔ میرے پاس یہ کتاب اور اس کا نقض "نقض العثمانیہ للاسکافی" موجود ہے عنقریب میں دونوں کو شائع کرنے والا ہوں،

(۹۳) کتاب العرب والعجم

(۹۴) " العرب والموالی

(۹۵) " العرجان والبرصان

(۹۶) رسالہ فی العشق والنساء ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

(۹۷) رسالۃ فی العضو والصفح

(۹۸) کتاب عناصر الآداب

(۹۹) " غش الصناعات، ابومنصور بغدادی کا خیال ہے کہ جاحظ نے اس کتاب سے تاجروں کی تجارت کو بہت نقصان پہنچایا،

(۱۰۰) رسالۃ فی فخر السودان علی البیضان ۱۳۲۴ھ میں شایع ہو چکا ہے

(۱۰۱) کتاب فخر عبد شمس مخزوم

(۱۰۲) " فخر ہاشم وعبد شمس، میرے پاس یہ کتاب موجود ہے عنقریب میں اسے شایع کرنے والا ہوں۔

(۷۸) کتاب الرد علی من زعم ان الانسان جزء لا یتجزی۔

(۷۹) 〃 الرد علی العثمانیہ

(۸۰) 〃 الرد علی المشبہہ

(۸۱) 〃 الرد علی الیہود

(۸۲) 〃 الزرع والنخل والزیتون والاعناب۔ جاحظ نے یہ کتاب ابراہیم بن عباس الصولی کو (جو میر منشی تھا) بھیجی اس نے پانچ ہزار دینار عنایت کئے۔

(۸۳) کتاب السلطان واخلاق اہلہ

(۸۴) رسالۃ الشارب والمشروب

(۸۵) کتاب الفرجاء والبخار

(۸۶) 〃 لصناعۃ الکلام۔ شاید یہ وہی کتاب ہو جس کا ذکر "تفضیل صناعۃ الکلام" کے سلسلہ میں ہو چکا ہے،

(۸۷) کتاب الصوالجۃ

(۸۸) رسالہ فی طبقات المغنئین جس کا ایک ٹکڑا ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے،

(۸۹) کتاب الطفیلیین

(۹۰) 〃 العالم والجاہل

نام سے لکھا تھا،

(۱۱۲) کتاب تفضیلۃ الکلام، یہ ان کتابوں میں ہے جو کئی ناموں سے مشہور رہے،

(۱۱۳) کتاب القحاب۔ ابومنصور بغدادی نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں ذکر کیا ہے،

(۱۱۴) کتاب القحطانیہ والعدنانیہ۔

(۱۱۵) " القضاۃ والولاۃ

(۱۱۶) رسالۃ فی القلم

(۱۱۷) کتاب القواد۔ قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب طراز المجلس میں جس کتاب کا ذکر "القواد واسباب الصناعات" کے نام سے کیا ہے کیا عجب کہ یہ وہی ہو،

(۱۱۸) رسالۃ فی القیان ۱۳۴۴ھ میں مطبع سلفیہ اسے شایع کرچکا ہے۔

(۱۱۹) کتاب الکبر المتحن والمستقبح

(۱۲۰) رسالہ فی کتمان السر

(۱۲۱) رسالہ فی الکرم

(۱۲۲) کتاب الکلاب، ابومنصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے

(۱۲۳) رسالۃ فی الکیمیاء،

(۱۰۳) رسالہ فی فرط جہل الکندی[1]

(۱۰۴) کتاب فرق، بین الجن والانس

(۱۰۵) 〃 〃 بین الملائکتہ والجن

(۱۰۶) 〃 〃 ما بین النبی والمتبنی

(۱۰۷) رسالہ فی فضل اتخاذ الکتب

(۱۰۸) کتاب فضل ما بین الرّجال والنساء

(۱۰۹) 〃 فضل العلم

(۱۱۰) 〃 فضل الفرس علی الہملاج

(۱۱۱) 〃 فضیلۃ المعتزلۃ، ابوالحسین خیاط نے اپنی کتاب "الانتصار" میں اس کا ذکر کیا ہے،

کیا عجب کہ یہ وہی کتاب ہو جس کا ذکر الاعتزال و فضلہ کے نام سے ہو چکا ہے، ابن راوندی نے اس کا رد "فضیحۃ المعتزلۃ" کے

---

[1] ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی، اسلام کا مشہور فیلسوف سلسلۂ نسب ملوک کندہ تک پہنچتا ہے وہ پہلا شخص ہے جس نے مسلمانوں میں علوم فلسفہ میں بہت شہرت حاصل کی ہے حدوث عالم کے بارے میں مذہب افلاطون کا پیرو تھا، مختلف علوم و فنون میں اس کی متعدد تصانیف موجود ہیں، اپنی وسعت علم کے باوجود بخیل حد درجہ کا تھا، اور جاحظ کے نزدیک تو وہ کنجوسوں کا امام تھا، ۲۵۲ھ میں وفات پائی،

نام سے لکھا تھا،

(۱۱۲) کتاب فضیلة الکلام، یہ ان کتابوں میں ہے جو کئی ناموں سے مشہور ہے،

(۱۱۳) کتاب القحاب، ابومنصور بغدادی نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں ذکر کیا ہے،

(۱۱۴) کتاب القحطانیہ والعدنانیہ۔

(۱۱۵) " القضاۃ والولاۃ

(۱۱۶) رسالة فی القلم

(۱۱۷) کتاب القواد۔ قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب طراز المجلس میں جس کتاب کا ذکر "القواد واسباب الصناعات" کے نام سے کیا ہے کیا عجب کہ یہ وہی ہو،

(۱۱۸) رسالة فی القیان سنہ ۱۳۴۴ھ میں مطبع سلفیہ اسے شایع کر چکا ہے۔

(۱۱۹) کتاب الکبر المتحن والمستقبح

(۱۲۰) رسالہ فی کتمان السر

(۱۲۱) رسالہ فی الکرم

(۱۲۲) کتاب الکلاب، ابومنصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے

(۱۲۳) رسالة فی الکیمیاء

(۱۰۳) رسالہ فی فرط جہل الکندی[1]

(۱۰۴) کتاب فرق، بین الجن والانس

(۱۰۵) 〃 〃 بین الملائکۃ والجن

(۱۰۶) 〃 〃 ما بین النبیّ والمتنبی

(۱۰۷) رسالۃ فی فضل اتخاذ الکتب

(۱۰۸) کتاب فضل ما بین الرّجال والنساء

(۱۰۹) 〃 فضل العلم

(۱۱۰) 〃 فضل الفرس علی الہملاج

(۱۱۱) 〃 فضیلۃ المعتزلۃ، ابوالحسین خیاط نے اپنی کتاب "الانتصار" میں اس کا ذکر کیا ہے،

کیا عجب کہ یہ وہی کتاب ہو جس کا ذکر الاعتزال و فضلہ کے نام سے ہو چکا ہے، ابن راوندی نے اس کا رد "فضیحۃ المعتزلۃ" کے

---

[1] ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی، اسلام کا مشہور فیلسوف سلسلۂ نسب ملوک کندہ تک پہنچتا ہے وہ پہلا شخص ہے جس نے مسلمانوں میں علوم فلسفہ میں بہت شہرت حاصل کی ہے حدوث عالم کے بارے میں مذہب افلاطون کا پیرو تھا، مختلف علوم و فنون میں اس کی متعدد تصانیف موجود ہیں، اپنی وسعت علم کے باوجود بخیل حد درجہ کا تھا، اور جاحظ کے نزدیک تو وہ کنجوسوں کا امام تھا، ۲۵۲ھ میں وفات پائی،

(۱۴۰) کتاب المغنین والغناد والصنعۃ۔

(۱۴۱) ″ مفاخرۃ السودان والحمران۔

(۱۴۲) ″ رسالہ فی مفاخرۃ المسک والرماد، صلاح الصفدی کا قول ہے کہ یہ نہایت بدیع رسالہ ہے۔

(۱۴۳) کتاب الملح والطرف۔

(۱۴۴) ″ الملوک والامم السالفہ والباقیہ۔

(۱۴۵) رسالہ فی مناقب الترک وعامۃ جنذ الخلافۃ۔ جاحظ نے یہ رسالہ فتح بن خاقان وزیر اعظم المتوکل باللہ کے حضور میں گزرانا تھا، لندن سے ۱۹۰۳ء میں شایع ہو چکا ہے، پھر ابراہیم بک مویلحی نے اپنے اخبار "مصباح الشرق" میں اسے شایع کیا، ۱۳۴۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے،

(۱۴۶) رسالۃ فی من یسمیٰ من الشعراء عمراً۔

(۱۴۷) ″ فی موت ابی حرب الصفار البصری۔

(۱۴۸) رسالہ فی المیراث

(۱۴۹) کتاب النائشی والمتلاشی

(۱۵۰) کتاب النرد والشطرنج

ان تینوں چیزوں کے ذم میں بھی ایک ایک رسالہ جاحظ کے قلم سے نکل چکا ہے (مترجم)

(۱۲۴) کتاب المخاطبات فی التوحید،

(۱۲۵) رسالۃ فی مدح التجار و ذم عمل السلطان ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے،

(۱۲۶) رسالہ فی مدح الکتابؔ[1]

(۱۲۷) رسالہ فی مدح النبیذ } ۱

(۱۲۸) 〃 فی مدح الوراقہ }

(۱۲۹) کتاب المزاح والجد

(۱۳۰) 〃 المسائل

(۱۳۱) 〃 مسائل العثمانیہ

(۱۳۲) 〃 〃 کتاب المعرفتہ

(۱۳۳) 〃 القرآن

(۱۳۴) 〃 المضاحک :۔ ابو منصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے

(۱۳۵) 〃 المعاد والمعاش

(۱۳۶) 〃 المعاون

(۱۳۷) 〃 معارضۃ الزیدیہ

(۱۳۸) 〃 المعرفتہ

(۱۳۹) 〃 المعلمین

[1] اگلے صفحہ پر دیکھو

میں ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی ہی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاحظ اس سے بری ہے اس کے قلم سے یہ کتاب ہرگز نہیں نکلی، (اس کے بعد مؤلف کتاب حسن السندوبی صاحب نے دونوں کتابوں کے مقدمے لکھے ہیں، اور ہر دو کتابوں کے اسلوب بیان اور طرز ادا کے تخالف اور تباین سے ثابت کیا ہے کہ جاحظ کا رنگ اس کتاب سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا، مثالیں چونکہ عربی کی ہیں۔ اس لئے ان کا ترجمہ یہاں بیکار نظر آیا۔ بہرحال ثابت انہوں نے بھی کیا ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں ہے) اس طویل موازنہ کے بعد فاضل مولّف فرماتے ہیں، کون ایسا شخص ہوگا، جسے عقل سلیم یا وجدان صحیح سے ذرا بھی مناسبت ہو، وہ اسے باور کرے گا، کہ یہ کتاب جاحظ کی ہے! ان دونوں کا فرق اسلوب اسی طرح نمایاں ہے جس طرح صدق و کذب، نور و ظلمت اور حق و باطل کا فرق محتاج بیان نہیں ہوا کرتا، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں اور جو شخص اس پر اصرار کرے، وہ جاحظ کو منزلہ رفیع سے گرانا چاہتا ہے یا پھر وہ جاحظ کا قدر شناس نہیں ہے، ہماری مستقل رائے تو یہی ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے کسی آدمی نے اس

(۱۵۱) کتاب النصرانی والیہودی

(۱۵۲) " النعل

(۱۵۳) " نقض الطب :- ابوبکر رازی نے اس کے رد میں ایک پورا رسالہ لکھا ہے، اسی طرح ابن مندویہ نے بھی ایک مستقل رسالہ اس کے جواب میں لکھا۔

(۱۵۴) کتاب نوادر الحسن

(۱۵۵) " النوامیس - ابومنصور اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ حیلہ گروں کے جلب زر کا ایک عمدہ راہنما ہے۔

(۱۵۶) کتاب وجوب الامامۃ

(۱۵۷) " الوعد والوعید، ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شایع ہوئی۔

(۱۵۸) " الوکلاء

(۱۵۹) رسالۃ الیتیمیہ۔

دوسروں کی کتابیں جاحظ کے نام سے

(۱) کتاب الابل۔ یاقوت کا قول ہے کہ یہ کتاب بہت زمانہ سے جاحظ کے نام سے منسوب چلی آرہی ہے۔

(۲) کتاب التاج یا اخلاق الملوک احمد ذکی پاشا نے ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۳

نے جو آستانہ کا ایک ممتاز مطبع تھا، اسے شایع کیا تھا، استنبول کے کسی کتب خانہ عامہ میں اس پر نظر پڑی بغیر یہ تحقیق کئے کہ اس نسخہ کا کاتب کون ہے؟ آیا یہ نسبت صحیح بھی ہے یا نہیں؟ صرف یہ دیکھ کر کہ اس میں جاحظ کا نام ہے شائع کر دی گئی، میرا یہ دعویٰ کہ جاحظ کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس کی زندگی میں اس کے نام سے یہ پہچانی گئی، مثلاً مقدمہ کے بعد دیباچہ میں اپنے ممدوح کو "قوام الملک" اور "نظام الدین" وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے، اور "قوام الملک" "نظام الدین" "حجۃ الاسلام" "نور الملک" "جمال السلطنۃ" اور "بہاؤ الدولہ" وغیرہ جیسے القاب وخطابات عہد سلاجقہ کی پیداوار ہیں، اس کے علاوہ بہت سے ایسے شعرا اور انشاپردازوں کا ذکر ہے، جو چوتھی صدی ہجری کے تھے، پھر جاحظ نے ان چیزوں کو کہاں اور کیسے پایا؟ لہٰذا ثابت ہوا، کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں ہے،

(۷) کتاب المحاسن والاضداد، اس کے متعلق تو بہت سے لوگ فریب میں مبتلا ہیں، اور غلطی سے جاحظ ہی کی کتاب سمجھ رہے ہیں، قدما میں شیخ محی الدین عربی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاحظ بیچارہ اس الزام سے "قطعاً" بری ہے معلوم ایسا

کسی کتاب میں یہ نام دیکھ لیا اور جھٹ ایک مصنوعی مقدمہ تیار کرکے شائع بھی کر دیا تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں (سندوبی صاحب مؤلف کتاب نے جس شدومد اور جوش خطابت سے اس دعوی کو پیش فرمایا ہے کم از کم اس طرح تو ان کا دعوے ثابت نہیں ہوتا، واللہ اعلم بالصواب،

(۳) کتاب تنبیہ الملوک والمکائد۔ یہ کتاب بھی جہل و حماقت سے اس کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔

(۴) کتاب الحنین الی الاوطان، جس شخص کو جاحظ کے طرز سے ذرا بھی مس ہے اور جو اس کے طریقہ تالیف وتصنیف سے واقف ہے وہ بلا تامل سمجھ سکتا ہے کہ وراقوں نے ادھر ادھر کے چند اوراق جمع کرکے اس کے نام سے مشتہر کر دیئے ہیں تاکہ رواج عام حاصل ہو جائے، تعجب ہے کہ شیخ طاہر جزائری رحمۃ اللہ نے بھی دہوکا کھایا، وہ یہ کتاب جاحظ ہی کی سمجھتے رہے، حالانکہ یہ بالکل کذب وافترا ہے، مطبع المنار نے ۱۳۳۲ھ میں شایع کی ہے،

(۵) کتاب الدلائل والاعتبار علی الخلق والآثار۔ یہ کتاب بھی جاحظ کے نام سے غلط طور پر منسوب ہے۔

(۶) کتاب سلواۃ الحریف بمناظرۃ الربیع والخریف:۔ مطبع لیوٹ

(۸) کتاب الھدایا، یاقوت کا قول ہے کہ ایک زمانۂ دراز سے یہ کتاب جاحظ سے منسوب چلی آ رہی ہے۔

نوادرات جاحظ

جاحظ اپنے جلالت شان اور عظمت عام کے باوجود بالکل ایک خشک سا انشا پرداز نہیں تھا، بلکہ وہ ایک زندہ دل شوخ طبع، اور دلچسپ دل آویز خصائل کا مالک تھا، اس کے ہاں متانت بیان، قوت زبان اور دوسرے خصائل علمی کے ساتھ لطائف و ظرائف، نوادرات و ظرائف اور طنز لطیف کے بہت سے نمونے ملتے ہیں چند درج ذیل ہیں۔

(۱)

محمد بن ابراہیم بغداد جا رہے تھے، میں ان کا ہمرکاب ہوگیا، ہم لوگ ایک بجرے میں سوار ہوئے اور اس نے مغنیہ کو گانے کا حکم دیا، اس نے ستار سنبھالا اور گانا شروع کیا،

کل یوم قطیقه عتاب ... ینقضی دھرنا ونحن غضاب

لیت شعری انا خصصت بھذا ... دون ذا الخلق ام کذا الاحباب

ہوتا ہے کہ چوتھی صدی کے وراقین میں سے کسی نے یہ کتاب تیار کی ہو گی اور دیکھا ہو گا کہ یوں تو اس کی اشاعت ہوتی نہیں، جاحظ ہی کی طرف منسوب کردوں، اس طرح یہ جاحظ کے نام سے مشہور ہو گئی،

سب سے بڑی دلیل ہے کہ میں یوں ہی اس کتاب کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا، کہ میری نظر صفحہ ۳۸ پر پڑی، تو اس میں بھی ابن المعتز کے چند شعر دکھائی دیئے، مجھے حیرت ہوئی کہ جاحظ ابن المعتز کے اشعار کیسے روایت کر رہا ہے، حالانکہ ابن المعتز ابھی سات برس کا نہ ہوا تھا، کہ جاحظ کی وفات ہو چکی تھی، شعبان ۲۴۹ھ میں ابن معتز کی ولادت ہوئی اور محرم ۲۵۵ھ جاحظ کی وفات تو اب عرفاً، عقلاً، عادتاً کسی طرح بھی یہ ممکن ہے کہ ایک سات برس کا بچہ اتنا بڑا شاعر بے بدل ہو جائے کہ جاحظ جیسا شخص اس سے روایت کرے[1]، ہاں صفحہ ۱۴۴ پر ایک شعر میں قرامطہ اور حجاج کی جنگ سے تلمیح کی گئی ہے، حالانکہ یہ واقعہ جنگ جاحظ کی وفات سے پورے چالیس برس بعد پیش آیا، لہذا یہ کتاب قطعاً جاحظ پر افترا ہے، اور ابو عثمان اس سے قطعاً ناواقف ہے،

---

۱ ـ ایک طرح اس کتاب کے ایک حصہ کو الحاقی، یا مصنوعی سمجھا جا سکتا ہے، لیکن پوری کتاب کا انکار کر دینا بہت بڑی جرأت ہے۔ (مترجم)

یہ تھا کہ امیرالمومنین اپنی فلاں لونڈی کو حکم دیں کہ وہ مجھے تین مختلف راگ سناوے، اور بس یزید بہت برہم ہوا، اسی وقت اس نے حکم دیا، جس نے یہ عرضی دی ہو اس کا سر اڑا دو، حکم کی تعمیل ہونے ہی والی تھی کہ ایک دوسرا قاصد پہونچا، کہ امیرالمومنین اس مغضوب بارگاہ کو یاد فرما رہے ہیں، وہ آدمی اس کے سامنے کھڑا کیا گیا، امیرالمومنین نے دریافت فرمایا، ایسی گستاخی کی جرأت تجھے کیسے ہوئی، اس نے جواب دیا، امیر المومنین کے حلم وعفو سے، یزید بن عبدالملک نے اسے بیٹھنے کا حکم دیا یہاں تک کہ مجلس برخاست ہوگئی، پھر اسی لونڈی کو بلوایا، وہ عود لے کر حاضر ہوئی، اس نوجوان نے اس سے کہا، یہ شعر گاؤ،

افاطم مهلا بعض هذا التدلل ‏ ‏ ‏ ‏ وان كنت قد أزمعت صرمي فاجملي

اس نے اسے گایا، یزید نے نوجوان سے کہا اور؟ اس نے کہا، یہ شعر گاؤ۔

تالق البرق نجديا فقلت له ‏ ‏ ‏ ‏ يا ايها البرق اني عنك مشغول

اس نے اسے بھی گایا، خلیفہ نے کہا ابھی اور بھی باقی ہے؟ نوجوان نے کہا، جہاں پناہ! مجھے ایک رطل شراب منگوا دیجئے، وہ حاضر کی گئی ابھی پورے طور سے وہ پی بھی نہیں چکا تھا، کہ دفعۃً وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور ایک بلند جگہ پر چڑھ گیا، اور وہاں سے کود پڑا، اور ختم ہوگیا

پھر وہ خاموش ہو گئی، اب کے حکم پاکر طنبوریہ نے گانا شروع کیا،

وارحمتا للعاشقینا	ما ان اری لھم معینا
کم یھجرون ویصرمون	ویقطعون فیصبرونا

عود بجانے والی نے پوچھا، پھر عاشق کرتے کیا ہیں، اس نے جواب دیا یہ کرتے ہیں، یہ کہہ کے اس نے ستار پھینک دیا، اسوقت معلوم ہوتا تھا، وہ چودھویں رات کا چاند ہے، اور فوراً اپنے تئیں سپرد دریا کر دیا، محمد کے پاس ایک غلام ہاتھ میں مورچھل لئے کھڑا تھا، وہ اس کے حسن وجمال کو دیکھ کر مبہوت ہو رہا تھا، وہ بھی اس جگہ پر آیا، دیکھا وہ پانی میں ہچکولے کھا رہی ہے اس لئے یہ شعر پڑھا،

انت التی غرقتنی	بعد القضا لو تعلمینا

یہ کہہ کے خود بھی دریا میں پھاند پڑا، دونوں ایک دوسرے چمٹ گئے پھر ایسے ڈوبے کہ ابھر نہ سکے، محمد نے جو یہ اندوہ ناک منظر دیکھا تو بہت موثر ہوا، اس نے کہا، جاحظ کوئی ایسی بات کر جو میری تسکین وتسلی کا سبب ہو، ورنہ تجھے بھی ان دونوں کے پاس پہنچائے دیتا ہوں،

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا، کہ یزید بن عبد الملک عدالت میں بیٹھا ہوا عرضیاں دیکھ دیکھ کر فیصلے لکھ رہا تھا، ایک درخواست کا مضمون

لیکن غور کرتا ہوں، تو ہر چیز خدا نے آپ کو دے رکھی ہے، میرے پاس ایک نہایت بلند مرتبہ چیز کتاب سیبویہ ہے، کسائی نے اسے لکھا ہے اور فرائی کی میراث سے میں نے خریدا ہے۔

ابن زیات۔ خدا کی قسم اس سے زیادہ پسندیدہ ہدیہ تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

۳

جاحظ کہتا ہے مجکو عمر بھر کسی سے شرمندگی نہیں اٹھانا پڑی، ہاں دو عورتوں نے بیشک مجھے بہت خجل کیا، جن میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروازہ پر ٹہل رہا تھا، کہ ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی، مجھے ایک بڑی سخت ضرورت درپیش ہے، ذرا تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلئے، میں اس کے ساتھ ہولیا، ایک یہودی سنار کی دکان پر جاکر کھڑی ہوگئی، اور اس سے مخاطب ہوکر کہا، "ایسا ہی" اور یہ کہہ کے چلتی بنی، میں نے سنار سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے اس نے کہا اس عورت نے ایک انگوٹھی مجھ سے بنوائی، اور فرمائش کی کہ میں اس پر شیطان کی صورت نقش کردوں، میں نے کہا، میں کیا جانوں شیطان کیسا ہوتا ہے، یہ سنکر وہ چلی گئی، اور اب یہاں آکر دیکھا اس نے کہا وہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے،

خلیفہ نے کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، دیکھا اس احمق کو وہ بیوقوف یہ سمجھا کہ میں اس جاریہ کو اس سے لے لوں گا، اس لونڈی کو اس کے اہل واقربا تک پہنچا دو، اور اگر کوئی نہ ہو تو اسے بیچکر اس کی قیمت اس نوجوان پر صدقہ کردو،

لوگ اسے پکڑ کر لے چلے، جب وہ گھر کے وسط میں پہونچے، تو اس نے ایک تالاب دیکھا، جس میں بارش کا پانی جمع ہوا کرتا تھا، وہاں پہنچ کر اس نے لوگوں سے اپنے آپ کو چھڑا کر، اور یہ شعر پڑھ کر،

من مات عشقا فلیمت ھکذا　　لا خیر فی عشق بلا موت

اپنے آپ کو اس میں ڈالدیا، اور ختم ہوگئی،

محمد نے یہ قطعہ سنکر خوشنودی کا اظہار کیا، اور مجھے گراں بہا انعام مرحمت فرمایا۔

۲

محمد بن زیات نے فصد لی، تو جاحظ عیادت کو حاضر ہوا، اور کہا:۔

" خدا آپ کو صحت عطا فرمائے، آپ کی نعمتیں اسی طرح برقرار رہیں

ابن زیات ۔ اچھا تو بتاؤ، تم نذر کرنے کو کیا لائے ہو۔

جاحظ:۔ میں نے سوچا کہ آپ کی خدمت میں کچھ ہدیہ پیش کروں

اس نے جواب دیا:۔ یہ میری علامت ہے جب میں کسی شخص کا شکریہ ادا کرتا ہوں، تو ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا ہوں۔

۵

میں اپنے ایک دوست کے ہاں گیا، دروازہ کھٹکھٹایا، تو ایک سندھی لونڈی نکلی،

میں:۔ اپنے آقا سے کہدو، جاحظ دروازہ پر کھڑا ہے۔

لونڈی:۔ کہدوں جاحد (جھگڑنے والا) دروازہ پر کھڑا ہے۔

میں:۔ نہیں، اس سے کہو حدقی دروازہ پر حاضر ہے۔

لونڈی:۔ کہدوں حلقی دروازہ پر ہے۔

میں:۔ بس بھر پایا، کچھ نہ کہو۔۔۔ ۔۔۔ یہ کہہ کے میں واپس ہوگیا،

۶

میرے پاس بعض لوگ آئے، اور کہا، کہ تمہارے پاس ایک ہزار ایسے جوابات ہیں جو دوسروں کو خاموش کر دیتے ہیں، کچھ ہمیں بھی سکھا دیجئے میں نے کہا، "ضرور" ایک نے کہا، اگر کوئی شخص کسی ناملائم اور مکروہ الفاظ میں مخاطب کرے تو کیا جواب دیا جائے؟ میں نے کہا جو کچھ وہ برا بھلا کہے تم صرف یہ کہو، "بجا ارشاد"

۴

ایک آدمی میرے پاس آیا اور فرمائش کی کہ اپنے دوستوں کو ایک سفارشی خط لکھ دیجئے مجھے ضرورت ہے میں نے ایک خط لکھا اور اس پر مہر لگا کے اس کے حوالہ کیا،

رقعہ لے کے جب وہ باہر پہونچا، تو اس نے رقعہ کا لفافہ پھاڑا اور خط پڑھ لیا، اس میں میں نے لکھا تھا۔

"یہ خط لکھ کے میں اس شخص کو دے رہا ہوں جسے میں ذرا بھی نہیں پہچانتا، اگر آپ اس کی حاجت پوری کر دیں تو آپ کی تعریف نہیں کروں گا، اور اگر اسے ناکام واپس کر دیجئے، تو مجھے آپ سے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی،"

وہ آدمی فوراً میرے پاس آیا، میں نے کہا شاید تم نے میرا خط پڑھ لیا؟ اس نے کہا ہاں!

میں :۔ میں نے کہا جو کچھ لکھا ہے اس سے تمہیں گزند نہیں پہنچ سکتا میں نے اپنی یہ علامت مقرر کر لی ہے۔ کہ جب میں کسی کی سفارش کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ لکھتا ہوں،

اس نے کہا:۔ خدا تجھ پر لعنت کرے، تیرے ہاتھ پاؤں بیکار کرے

میں :۔ یہ کیا؟

غضب نہ ہو، شجاع ہو، لیکن بزدل نہ ہو، گفتگو خوب کرتا ہو، لیکن عامیانہ باتوں سے پرہیز کرتا ہو، خاموش ہو لیکن گونگا نہ ہو، حلیم اور بردبار ہو، لیکن ذلت قبول کرتا ہو، لوگوں کی مدد سے دریغ نہ کرتا ہو، لیکن ظلم بھی نہ کرتا ہو، باوقار ہو، لیکن احمقانہ طور سے نہیں، حاکم ہو لیکن غصے میں نہ آجاتا ہو،

۲

ہر عشق کو محبت کہہ سکتے ہیں، لیکن ہر محبت کو عشق نہیں کہہ سکتے اس لئے عشق محبت سے الگ ایک مستقل چیز ہے، جس طرح فضول خرچی اور سخاوت ایک نہیں، یا بخل و میانہ روی میں جو فرق ہے، یا بزدل اور حوصلہ مند میں جو تفریق ہے، جلد غصہ آجانے والے آدمی، اور شجاع میں جس طرح تفریق ہے اسی طرح یہ بھی الگ چیز ہے،

۳

یہ چیزیں ان آدمیوں میں ضرور پائی جاتی ہیں، گونگے میں ہلکا پن، لانبے آدمی میں غصہ کی سرعت، پستہ قد میں غرور، میانہ قد آدمی میں شرافت، ... میں روشنیٔ علم، افرس میں ذکاوت، اندھوں میں قوت حافظہ ... میں ثقالت، زبان، لنگڑے میں مسرت،

۴

جاحظ کا قول ہے، جس نے اپنے مال کی حفاظت کر لی، اس نے دو

۷

علی بن عبیدہ ریحانی بیمار پڑے تو میں ان کی عیادت کو گیا۔ میں نے ان سے پوچھا، "کس چیز کو جی چاہتا ہے، ابوالحسن"!

انہوں نے کہا:۔ رقیبوں کی آنکھیں، چغلخور کی زبان، اور حسد کرنے والوں کا جگر چاہتا ہوں۔"

۸

تین مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا، کہ میں کنیت بھول گیا، تو میں نے اپنے گھروالوں سے پوچھا، کہ بھائی میری کنیت کیا ہے! انہوں نے کہا، ابوعثمان،

اقوال جاحظ

جاحظ کے جن اقوال بدیع نے شہرت عام اور ضرب المثال کی حیثیت اختیار کر لی ہے، وہ لوگوں کی زبانوں پر ہیں، ہم آج اس صحبت میں اس کے بعض اقوال سے آپ کو روشناس کرانا چاہتے ہیں، جو کسی نہ کسی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں،

۱

آدمی کو لازم ہے کہ سخی ہو، فضول خرچ نہ ہو، بہادر ہو، لیکن مرہ

۲

علم اور علماء کے فضائل ومناقب میں کہتا ہے،

یطیب العیش ان تلقی حکیماً　　غذاء العلم والفهم المصیب

فیکشف عنك حیرة کل جهل　　وفضل العلم یعرفه اللبیب

شفاء الحرص لیس له شفاء　　وداء الجهل لیس له طبیب

ہجو

بعض شعراء نے جاحظ کی ہجو بھی کی ہے، لیکن یہ شعراء پست درجہ کے ہیں شعراء میں جو لوگ صاحب ثروت اقتدار تھے وہ جاحظ کی منزلت سے واقف تھے، ان کی تو یہ تمنا رہتی تھی کہ جاحظ اپنی کسی کتاب میں ان کا ذکر کر دے خواہ وہ بر سبیل تنقید یا بصورت ظرافت ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے، کہ جاحظ کا ذکر کر دینا شہرت دو عالم کا ضامن ہے،

۱

ایک ہجو گو جو معتزلہ کا بہت بڑا دشمن ہے کہتا ہے۔

لو یمسخ الخنزیر مسخا ثانیا　　ما کان الا دون قبح الجاحظ

یعنی اگر سور کی صورت موجودہ صورت سے بھی زیادہ مسخ کر دی جائے تب بھی جاحظ کا مقابلہ کیا کر سکے گی۔

بزرگ چیزوں کو بچا لیا، ایک تو مذہب کو دوسرے آبرو کو،

جاحظ کی شاعری

نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت، نوادرات زمانہ ہیں، اور اگر یہ دونوں وصف کسی شخص میں جمع بھی ہوتے ہیں، تو پلہ برابر نہیں ر... نظم دلکش ہوگی، تو نثر روکھی سوکھی، اور اگر نثر کا پلہ بھاری رہا، ... نظم بس یونہی رہتی ہے، ظاہر ہے جاحظ نے نثر میں بالخصوص کمال حا... کیا تھا، اپنے اسلوب جاحظ سے، وہ ماہر تھا، اور کوئی اس تک نہیں پہو... سکا، لیکن بایں‌ہمہ وہ شعر و شاعری کے میدان میں، بالکل مبتدی نہیں... بلکہ اچھا خاصا ہے

۱

راویوں کا بیان ہے کہ اس نے ایک قصیدہ ابوالفرج نجاح بن... کی تعریف میں لکھا اور اس میں اپنے ماہانہ کھول دینے کی درخواست ک... یہ قصیدہ تو اب نایاب ہے، ہاں چند اشعار باقی ہیں جن کا نمونہ یہ...

اقام بجراء الخفض اض بخفضہ وذوا الحزم یسری حیث لا احد...

یضن الرضا شیئاً بیسیرا محوتا ودون الرضا کاس امر من الص...

سواء علی الایام صاحب حنکہ واٰخر کلب لا یریش و لا یبری

ہیں، اگر ایسا ہے تو علاج بالضد تو خوب ہوتا ہی ہے، اور اگر مغائرت نہیں ہے ایک ہیں، تو گویا ایک ہی چیز کھائی ہرج کیا ہوا؟ یوحنا نے کہا میں بحث و مباحثہ کا تو عادی نہیں ہوں، کل دیکھ لینا کیا ہوتا ہے؟ جاحظ نے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے خوب ہی خوب کھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ رات کو فالج کا جب حملہ ہوا تو کہنے لگا خدا کی قسم یہ قیاس محال کا نتیجہ ہے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا،؟

۲

ابو معاذ عبدان النحوی کہتے ہیں کہ ہم جاحظ کی عیادت کو گئے، وہ فالج میں مبتلا تھا، ہم مجلس میں بیٹھے ہی تھے کہ متوکل باللہ کا ایک قاصد آیا، پھر جاحظ ہماری طرف متوجہ ہوا اور کہا "اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جس کے دو پہلو ہیں ایک کی یہ حالت ہے کہ اگر آرہ سے چیر ڈالا جائے تو بھی ذرا احساس نہ ہو، اور دوسرے کا یہ حال ہے کہ اگر مکھی بھی بیٹھ جاتی ہے تو درد و الم کی انتہا نہیں رہتی،

۳

داہنے نصف حصہ بدن کا یہ حال تھا کہ شدت حرارت کی وجہ سے اس پر صندل اور کافور کی مالش کی جاتی تھی، اور دوسرے نصف حصہ کی یہ کیفیت تھی، کہ اگر قینچی سے کاٹ دیا جائے جب بھی کچھ اثر نہ ہو،

(اس ناخوشگوار عنوان کی زیادہ مثالیں غیر ضروری سمجھ کر حذف کردی گئیں۔ مترجم)

بیماری اور وفات

متوکل علی اللہ کے عہد میں جاحظ کی بیماری کا آغاز ہوتا ہے، اپنی علالت کے سارے زمانہ میں تصنیف و کتابت کا کام اس نے برابر جاری رکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کس قدر تنومند اور مضبوط جسم کا مالک تھا، ۲۴۷ھ سے ۲۵۵ھ تک پورے آٹھ سال وہ فالج جیسے نامراد مرض میں مبتلا رہا، لیکن اپنے کسی کام سے غافل نہ ہوا، اب حالات سنئے۔

۱

ابن بطلان طبیب کے خط سے ابن ابی اصیبعہ نقل کرتے ہیں کہ جاحظ اور یوحنا بن ماسویہ ابن بطلان کے قول کے مطابق اسمٰعیل بن بلبل کے ہاں ایک دسترخوان پر بیٹھے (میرے نزدیک صحیح تر واقعہ یہ ہے کہ دعوت ابن ابی داؤد کے ہاں تھی، نہ کہ اسمٰعیل بن بلبل کے ہاں۔ بہرحال) تو دسترخوان پر جہاں اور لذیذ لذیذ کھانے لائے گئے، دودھ دہی بھی آیا، لیکن مچھلی کے ساتھ یوحنا نے دونوں کے استعمال سے منع کیا اس لئے کہ نقصان کا اندیشہ تھا، جاحظ نے کہا "خوب" یا تو مچھلی اور دودھ طبعًا، ایک دوسرے کے مغایر

نے بہت دردناک مرثیہ لکھا، اور اس طرح بالآخر تاریخ اسلام کا وہ زبردست رکن ختم ہوگیا،

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

جاحظ کے خصائص و ممیزات !

ظہور جاحظ سے بیشتر بالعموم لوگوں کا فضل و کمال کسی ایک فن تک محدود رہا تھا، لیکن جاحظ کا رنگ سب سے الگ ہے، وہ ادیب بھی ہے، شاعر بھی ہے، متکلم بھی ہے، فلسفی بھی ہے، منطقی بھی ہے، غرض کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے، جس میں جاحظ پایۂ اجتہاد نہ رکھتا ہو، تحقیق علم تجارب نظریات کے لئے اس نے دور دراز کی مسافتیں کیں، تکلیفیں اٹھائیں، اور ہر قسم کے آفات و مصائب سے دوچار ہوا، وہ پہلا شخص ہے جس نے تقلید اعمیٰ سے گلوخلاصی حاصل کی، اور رائے عامہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اپنے معتقدات و خیالات علی الاعلان ظاہر کئے، سب سے بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس کی جو کتاب بھی اٹھا کر دیکھئے ہر ہر سطر سے اس کی شخصیت اپنی غیر معمولی حلاوت اور شیریں بیانی، وقت نظر و وسعت علم کا پتہ تو آپ پہ ڈالے گی، اسے خود بھی اپنی عظمت و بزرگی کا احساس تھا، اس لئے اس میں "انانیت" بھی کافی تھی، وہ

۴

ابوالعباس مبرد کہتے ہیں، کہ میں جاحظ کی عیادت کو گیا، میں نے سنا وہ کہتا تھا، میں داہنی طرف سے مفلوج ہوں، اگر قینچی سے تراش دو تو مجھ پر اثر نہو، اور بائیں طرف سے متقرس کہ اگر مکھی بھی اڑ کر بیٹھ جائے تو درد و کرب کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے،

۵

ابوطاہر کہتے ہیں میں جاحظ کے ہاں گیا، میرے ساتھ رفیقوں کی ایک جماعت بھی، جاحظ اپنی آخری عمر کو پہونچ چکا تھا، ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا، مگر کوئی جواب نہیں ملا، سامنے روشن دان سے اس نے جھانکا اور کہا میں بہت زیادہ بوڑھا ہوگیا، ضعف و نقاہت کا دور دورہ ہے، تم لوگ اب مجھ سے کیا کروگے؟ میرا وداعی سلام قبول کرو، ہمنے بھی سلام کیا، اور واپس چلے آئے،

۶

جاحظ کا جب انتقال ہوا، اور خبر وفات قصر خلافت میں پہونچی تو خلیفہ معتز باللہ نے حد درجہ رنج و تاسف کا اظہار کیا، اور یزید بن مہلبی سے پوچھا اے ابو یزید کیا جاحظ کی خبر وفات آئی ہے؟ اس نے کہا، ہاں امیر المومنین کو خدا ہمیشہ سلامت رکھے، ابو شراعۃ القیسی

تلافی!

منصور، ایک سرمست شباب نوجوان تھا، رگوں میں جوانی کا خون موجزن سر میں عشق و ہوس کا سودا، اور دل میں کسی کے چاہنے کی آرزو، پھر طرہ یہ کہ عہدۂ قضا پر مامور، فکر امروز، نہ غم فردا، مزید اتفاق یہ کہ مکان ہی کے پاس ایک خاندان نے اقامت اختیار کی، جس کا ہر فرد "دشمن ایمان و آگہی" اور رہزن تمکین و ہوش" نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پیکر رعنائی سے آنکھ لڑ گئی، جس نے پیام وسلام کی صورت اختیار کی، پیام وسلام، اختلاط و ارتباط میں بدلا، اور اختلاط و ارتباط نے اپنے "نتائج" ظاہر کئے، اور بالآخر عشق و محبت کا یہ المیہ بھی اسی طرح ختم ہو گیا، جس طرح آدم و حوا کے فرزند، ہوا و ہوس کے اسٹیج پر اپنے کمالات فن کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں،

نوشابہ کامرانی وصل کے بعد اپنے عزلت کدہ میں جب واپس آئی، تو ایک آتش سوزاں تھی، جو اس کے دل و جگر کو سیاہ کئے دیتی تھی، اور ایک غم تھا، جو اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا، آتش سوزاں تو بہر حال "غم پنہاں" کی صورت اختیار کر سکتی تھی، لیکن اس لذت وصل کی یادگار کو، جو عنقریب پردۂ ظہور پر رونما ہونے والی تھی، کیونکر چھپایا جا سکتا تھا؟ آج اس

اپنا جیسا بجا طور پر کسی کو نہیں سمجھتا تھا، اور اپنا ہم پایہ اور مستحق عزت و تعظیم بھی اس کی نظروں میں کوئی نہیں تھا، یہ تو اس کے خصائص و ممیزات پر ایک سرسری اظہار خیال ہے، ورنہ

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

Mohd Zubair.

اس کا باپ تھا جس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی نوشابہ کو کامیاب و کامراں اور بامراد و شادکام دیکھے، لیکن وہ تو اس کے ہاں سے ہجرت کر چکی تھی، اس کے نوکر چاکر تھے، کوئی اس کے سرہانے بیٹھ کر کہانی کہتا، کوئی پاؤں داتبا، لیکن اب تو وحشت و تنہائی اس کے جلو میں حاضر تھی،

وہ اعزاز و اکرام کی مالک تھی، جو اس کے لئے سرمایہ تسکین و تسلی تھا، اس کا دل فخر و سرور سے لبریز رہتا اور اس کی گردن رشک و افتخار سے سربلند، لیکن اب تو وہ اس سے بھی محروم ہو چکی تھی،

اسے آرزو تھی کہ اس کی حیات ازدواجی ایک کامیاب نمونہ ہو لیکن آہ! کہ دست برد زمانہ سے یہ آرزو بھی ناکامی میں تبدیل ہو چکی تھی،

یہ تھے وہ خیالات و افکار جو صبح و شام، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتے، ایک روز جب وہ اپنے مصائب و نوائب کی علت پر غور کر رہی تھی، تو اس نے محسوس کیا کہ یہ منصور ہی ہے جس نے میری زندگی تباہ کی اس نے پیمان محبت باندھا ہمیشہ کے لئے تھا لیکن توڑ فوراً دیا، اور آج میں ہوں، اور تنگنائے حیات کے یہ روح فرسا شدائد،

وہ انہیں خیالات میں مستغرق تھی کہ غم و غصہ سے اس نے اپنے پہلو میں ایک آگ سی سلگتی محسوس کی، اسے غصہ آ رہا تھا کہ منصور جو حقیقۃً اس کا قاتل ہے، کس مزے سے زندگی بسر کر رہا ہے، اسے انسانی سوسائٹی پر غصہ

یادگار" کے اثرات ونقوش کو چشم عالم سے پوشیدہ رکھا جا سکتا تھا، لیکن "کل" جب وہ یادگار عہد ہوس اس عالم خاکی میں آنے پر مچل رہی ہوگی تو دنیا والوں کی آنکھ کون بند کریگا؟"

یہ تھے وہ خیالات وتاثرات جنہوں نے نوشابہ کی نیند حرام کردی تھی، افکار وہموم کی اس تراوش مسلسل نے اس کا سر سنج بالیں اور اس کا تن بار بستر بنا رکھا تھا، ہوش وحواس جواب دے چکے تھے، اب فرار کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہ آتا تھا،

آخر ایک تیرہ وتار رات میں اس کے ارادے نے عزم کی صورت اختیار کرلی، اس نے چادر اوڑھی، اور اپنے تئیں اس شب بلا کے سپرد کردیا، اس قطع مسافت کے بعد وہ ایک ویران وسنسان مقام پر پہنچی، جہاں سے ایک کھنڈر مل گیا، جس میں وہ ٹھہر گئی، اس کھنڈر میں وہ تن تنہا تھی، نہ کوئی رفیق تھا نہ ہمدم، اگر رفیق تھا تو وہ غم جس نے دل کی دنیا تاراج کردی تھی اگر ہمدم تھا تو وہ یادگار عہد نشاط جو عنقریب عالم وجود میں آنیوالی تھی،

.... اب کون تھا جو اس کی غمخواری کرتا؟

ہاں نوشابہ کی ماں تھی، جو اس کی ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہو جاتی تھی اس کی پریشانی پر پریشان ہوتی تھی، اس کے رونے پر اس کے آنسو بھی اختیار سے باہر ہو جاتے تھے، لیکن اب تو وہ اس نعمت سے جدائی اختیار کر چکی تھی،

خودکشی کرلوں؟ لیکن اس بچی کا کیا ہوگا؟ کیا میرے لئے یہ مناسب ہوگا کہ اس معصوم بچی کے لئے میں اپنی ناشاد زندگی گزارتی ہوں، لیکن میں اگر زندہ رہنا بھی چاہوں تو موت میری تاک میں ہے، وہ مجھے کیوں چھوڑنے لگی؟ وہ تو مجھے قبر تک پہنچا کے رہے گی، لیکن میرے بعد اس بچی کا کیا حال ہوگا؟ میرے بعد کس جرم کی پاداش میں وہ یہ مصیبتیں جھیلے گی؟ کس گناہ کی اسے یہ سزا دی جائے گی؟ اس کی خطا سوا اس کے اور کیا ہے کہ میں اس کی ماں ہوں؟

اب وہ اپنی بچی کی طرف مخاطب ہوئی اور کہنے لگی،

"میری بچی! کیا تو اس لئے زندہ رہے گی کہ جب میری داستان حسرت سنے تو میرے لئے مغفرت کی دعا کرے؟ اب تو میرے پاس زیور بھی کچھ نہیں رہے۔ جو دو ایک ٹوٹی پھوٹی چیزیں ہیں انہیں بھی آج کل میں بیچ دونگی پھر اس کے بعد تیرا کیا حال ہوگا؟ تیری کون خبر لے گا۔؟

یہ تو ناممکن ہے کہ میں اپنے والد کے پاس جاؤں اور انہیں اپنا قصہ درد سناؤں، وہ تو مجھے رو چکے ہیں، جس طرح مردوں کو روتے ہیں، میں اسے اچھا سمجھتی ہوں کہ میری موت پر رویا جائے نہ اسے کہ میری ناپاک زندگی پر آنسو بہائے جائیں،

نوشابہ اسی طرح اپنے دل سے اور اپنی بچی سے باتیں کرتی رہی تھوڑی دیر کے بعد اس کا یہ سیلاب غم کم ہوا تو سیل گریہ نے اس کی جگہ لے لی، گرم

آرہا تھا کہ وہ "قاتل" کا تعاقب کیوں نہیں کرتی، سراغ کیوں نہیں لگاتی اور اسے بستۂ زنجیر و رسن کیوں نہیں کرتی؟

دن گزرتے رہے اور ایک دن وہ وقت آن پہنچا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، یعنی نوشابہ کو دردِ زہ شروع ہوا، اور تھوڑی دیر کے بعد ایک بچی عالمِ وجود میں آ ہی گئی، اس طرح کہ نوشابہ کے حبیبِ راست کوئی نہ تھا، جو اس کی خبر گیری کرتا جو اس انتہائی کرب و پریشانی کے عالم میں اس کا یار و مددگار بنتا، ہاں ایک بڑھیا تھی، جو حقِ ہمسائگی ادا کرنے کے لئے تھوڑی دیر کو آگئی تھی، اور اس بیچاری سے جو کچھ بن پڑا کیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی چلی گئی،

نوشابہ اپنے اس جدید مہمان سے جو اس کارگاہِ عالم میں اسے سب سے زیادہ محبوب تھا، بہت دل تنگ تھی، ایک رات بچی اس کی گود میں پڑی سو رہی تھی، اور نوشابہ اپنا سر ہتھیلی پر ٹیکے ہوئے بیٹھی تھی، دفعتہً اس قفلِ خاموشی کو اس نے خود توڑا، اور خود بخود کہنے لگی "کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا کاش میں عالمِ وجود میں نہ آئی ہوتی! اگر میں پیدا نہ ہوئی ہوتی تو یہ دکھ کیوں سہتی؟ اس دنیا میں اگر کوئی ایسی ہستی ہے کہ جس کے وجود سے عدم بہتر ہے تو بلاشبہ وہ میری ہستی ہے، آج سے قبل تک تو میں اپنے ننگِ حیات وجود سے دنیا کو پاک کر سکتی تھی، لیکن اب؟ اب میرے لئے کیا چارہ کار ہے! کیا میں

گئی کہ اچھا شکار ہاتھ آیا ایک تو یہ لڑکی یوں ہی حسن و جمال، رعنائی و زیبائی میں بے نظیر ہے، پھر اگر میں نے اس کی غور و پرداخت کی، کھلایا پلایا، اور اچھی طرح سے رکھا تو سونے پر سہاگا ہو جائیگا، اور پھر میں اپنی ساری زندگی بڑے مزے میں اس کے ذریعے بسر کر دوں گی، آخر باتیں بنا بنا کے اسے بہلا پھسلا کے وہ اپنے گھر لے گئی، یہاں شروع شروع تو نوشابہ کی خوب آؤ بھگت ہوئی، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کر لیا کہ وہ اس کٹنی کے دام حرص و ہوس میں بے طرح اسیر ہو گئی ہے اور اس بلا سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے،

یہاں وہ اپنی پہلی زندگی سے بھی زیادہ نامراد و تباہ حال زندگی بسر کر رہی تھی، کوئی وقت ایسا نہیں تھا، جب وہ خون جگر نہ پیتی ہو، ان حالات نے اس کی نیند اڑا دی تھی، راتوں کے جاگنے سے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا، اور وہ بیچاری ان درندہ صفت انسانوں کے اختلاف طبائع اور تنوع اخلاق کو بھی برداشت کرتی تھی، جو اس کٹنی کے بلانے سے آتے تھے، اور اسے پریشان کیا کرتے تھے، اور جب کوئی چارہ کار نہ دیکھا، تو مایوس ہو کر بیٹھ رہی،

کچھ دن اگر یہ حالت بھی قایم رہتی، تو نوشابہ اس پر بھی قانع ہو جاتی لیکن اس پر تو مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، ایک شخص جو اس سے

گرم آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے اور یہی وہ چیز ہے جس سے کمزور اور ناتواں لوگوں کے دل کی بھڑاس نکلتی ہے،

دن گزرتے رہے نوشابہ نے اپنی تمام پونجی بیچ ڈالی، اب نہ اس کے تن پر کپڑا تھا، نہ ہاتھ میں پیسہ، ایک پھٹی پرانی قمیص، ایک چادر، ایک برقعہ بس یہ تھی وہ کل کائنات جو نوشابہ اور اس کی کمسن بچی کے دست قدرت میں تھی،

رات اور زیادہ ایذا رسانیوں کے ساتھ آئی، نوشابہ نے برقعہ اوڑھا اور چل کھڑی ہوئی سڑکوں کو طے کرتے کرتے گلیوں میں پہونچی لیکن برابر چلتی رہی، اس قطع مسافت سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ غم و آلام سے نجات پائے، لیکن غم تھا کہ اس کا پیچھا کر رہا تھا، اس کے نقش قدم پر چل رہا تھا،

اتفاقاً ایک کٹنی کی نظر اس پر پڑ گئی، وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لی اور نوشابہ کے ساتھ ساتھ اس کے کھنڈر میں داخل ہو گئی، دلدہی اور دلداری کے لہجے میں نوشابہ سے اس کا حال پوچھنے لگی، وہ بیچاری غم کی ماری کسی ہمدرد کو ترس گئی تھی، اس نے کٹنی کے لہجے میں رفق و ملائمت کے آثار جو دیکھے تو ابل پڑی اور دل میں جو کچھ تھا، سب ہی کچھ کہہ ڈالا، اپنے عہد نشاط کے قصے بھی سنائے، اور اپنی داستان غم بھی، کٹنی بھا

دستخط کرے، ایک چور کب اس کا مستحق ہے کہ وہ دوسرے چوروں کو سزا دے،

نوشابہ کی بیباکانہ گفتگو سے قاضی عدالت اور حاضرین مجلس، سب دنگ رہ گئے، قاضی صاحب اس گستاخی پر بہت برہم ہوئے اور فوراً چپراسی کو حکم دیا کہ وہ اسے کٹہرے سے باہر کر دے، لیکن قبل اس کے کہ ایسا ہو نوشابہ نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا، اب جو قاضی صاحب کی نظر پڑی، تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے، ایک نظر میں انہوں نے سب کچھ بھانپ لیا، گزشتہ عہد کی ہوسناکیوں کا ایک ایک مرقع آنکھوں کے سامنے آگیا، اس صورت حال نے سارے بدن پر لرزش طاری کر دی، اور وہ کرسی پر اس طرح ساکت وصامت ہو گئے، جس طرح مردہ بستر مرگ پر، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نوشابہ نے اپنا سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"میں نے مال چرایا ہے اور تم نے آبرو پر ڈاکہ ڈالا ہے، آبرو مال سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے، لہذا تم مجھ سے کہیں زیادہ مجرم ہو، جو مال چرائے وہ اپنے جرم کی تلافی مال واپس کر کے یا کسی اور دوسرے طریقے سے کر سکتا ہے، لیکن جس عورت کی آبرو پر ڈاکہ ڈالا گیا ہو بتاؤ اس کی تلافی کیونکر ممکن ہے؟ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ آبرو جا کے واپس نہیں آتی؟ اگر تم نے میری متاع آبرو تاراج نہ کی ہوتی، تو آج میں ان

ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اپنی ناکامی کے بعد اسے پریشان کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا، اس نے تہمت لگائی کہ نوشابہ نے میرے درہموں کی تھیلی چرائی ہے، اور صرف تہمت ہی نہیں لگائی، قاضی کے ہاں مقدمہ بھی پیش کر دیا اور ان عورتوں کو جو اس کے حسن و جمال اور دیگر محامد و محاسن کی بنا پر خار کھائے بیٹھی تھیں گواہی کے لئے بھی آمادہ کر لیا،

پیشی کا دن آیا اور نوشابہ عدالت کے کٹہرے میں لاکر کھڑی کر دی گئی، اس کی گود میں اس کی بچی تھی، جو اپنی عمر کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی قاضی آیا اور اس نے مثلیں دیکھ دیکھ کر اپنی رائے اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ نوشابہ کی باری آئی، وہ کرسیٔ عدالت کے پاس لاکر کھڑی کی گئی، اس نے جو قاضی صاحب کو دیکھا تو شدت تحیر سے نقش بہ دیوار بن گئی، اس لئے کہ اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی ہوا و ہوس کی وہ شکار ہوئی تھی، جو اس کی ان مصیبتوں کا اصل سبب ہے، آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا، اور وہ یک بیک چیخ اٹھی جس سے عدالت کا کمرہ گونج گیا، اس نے کہا،

"جناب قاضی صاحب! یہ آپ کے شایان شان نہیں کہ آپ میرے مقدمے میں حکم بنیں، اس لئے کہ ہم دونوں میں سے ہر ایک چور بھی ہے اور خائن بھی، خائن کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ خائن کے مختصر سزا دے

وہ لوگ کیسے ہیں جو تمہارے علم وفضل پر شہادت دیتے ہیں؟ تمہارے اخلاق و آداب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں؟ وہ لوگ کتنے احمق ہیں جنہوں نے تمہیں اس منصب بلند پر سرفراز کیا ہے تمہارے ہاتھ میں قانون دے رکھا ہے اور تمہارے سامنے سپاہیوں کا یہ دستہ متعین کر دیا ہے کہ جو تمہارے احکام بجا لائیں، تمہارے فرامین نافذ کریں، اور تمہاری خواہشات پوری کریں؟

تمہارے اور تمہارے ہم مشرب لوگوں کے لباس فاخرہ کے اندر بھی ویسا ہی خبیث دل ہے، جیسا میرا ان چیتھڑوں کے اندر ہے، ہم میں جو جرائم پیشہ کہلاتے ہیں اور تم میں جو بلند سے بلند مناصب پر فائز ہو، کوئی فرق نہیں، سوا القاب وخطابات کے، وضع ولباس کے، اس کے باوجود یہ ستم ظریفی دیکھو کہ تم قاضی ہو، اور میں مجرم،

میں یہاں اس لئے لائی گئی ہوں تاکہ حضور قاضی صاحب مجھے سزائے زندان کا حکم دیں، لیکن میں حضور قاضی صاحب سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اس سے قبل جو جور وستم مجھ پر ہو چکے ہیں کیا وہ ابھی تشنۂ تکمیل ہیں، جو مزید الطاف وعنایت کی بھرمار ہے،

تمہاری بزم نشاط پر میری بیکسی کی یاد سے کبھی اداسی نہیں چھاتی؟ کیا تمہارے سینے میں پتھر کا دل ہے جو کسی طرح میرے لئے پسیجتا ہی نہیں؟

ان حالوں کو نہ پہنچتی، اٹھو، اپنی کرسی کسی دوسرے کیلئے چھوڑ دو، اور آؤ، میرے پاس کھڑے ہو جاؤ، تاکہ کوئی قاضی عادل ہم دونوں کا محاکمہ کرے،

ہاں شریعت جانتی ہے کہ ہم دونوں کا جرم مشترک ہے، پھر بھی اس کٹہرے میں پابجولاں کھڑی کی گئی ہوں اور تم عدالت کی کرسی پر متمکن ہو کیا شریعت (نعوذ باللہ) ظالم ہے، کیا وہ عدل و انصاف کے صفات سے معرٰی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میں "یہاں "کیوں؟ اور تم" وہاں" کیوں ہو؟"

جب میں یہاں داخل ہوئی ہوں، تو میں نے تمہیں اس حال میں دیکھا کہ حاجب تمہارے آگے آگے منادی کر رہا ہے کہ قاضی صاحب بجمیع القابہ نہضت فرمائے عدالت ہوا چاہتے ہیں، لوگ تمہارے خیر مقدم کیلئے اٹھ رہے ہیں، غرض ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے، کہ قاضی صاحب آرہے ہیں، قاضی صاحب آرہے ہیں، اور اپنے کو اس حال میں پایا کہ آنکھیں آنسوؤں کے قطرے گرا رہی ہوں، دل ہے کہ سوز غم سے جلا جارہا ہے تو میں نے اپنے دل میں کہا، یا للعجب، القاب و خطابات کا کتنا غلط استعمال ہو رہا ہے، ؟ اور یہ عالم کتنی بڑی گمراہی میں مبتلا ہے؟ کتنی بڑی جہالت اس پر طاری ہے؟

کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، منصور جب پریم کی بانسری بجاتا، تو
سارا سنسار مست ہو جاتا، کوئل جب پکارتی "پی کہاں" تو نوشابہ مسکرا کے
بول اٹھتی "پی یہاں"

منصور کے طرز عمل نے پچھلی تمام باتوں کا کفارہ کر دیا تھا، وہ گزرا
ہوا زمانہ انہیں بھولے سے کبھی نہ یاد آتا،

(ترجمہ از، النظرات، للمنفلوطی)

اگر تمہارے تعلقات کا نتیجہ نہ برآمد ہو چکا ہوتا تو میں کب کی اپنی جان، جان آفریں کو سپرد کر چکی ہوتی، لیکن اس بچی کو دیکھو یہ میرے تمہارے درمیان ایک وسیلہ ہے جو ابھی تک باقی ہے،

منصور نے یہ سب سنکر اپنا سر اٹھایا، اپنی بچی کی طرف پیار و محبت کی نظر سے دیکھا اور اپنے دل میں طے کر لیا، کہ وہ اپنے مظلوم نوشابہ کے ساتھ انصاف کرے گا، لیکن اس وقت اس نے اپنا فیصلہ یہ سنایا کہ یہ عورت پاگل ہو گئی ہے، پہلے اس کا مداوا ہونا چاہیئے، پھر مقدمہ دیکھا جائے گا، لوگوں نے بھی اس کی تائید کی،

عدالت برخاست ہوئی وہ اپنی کرسی سے اٹھا، لیکن اس حال میں کہ نہ وہ دل کا مالک تھا، نہ دماغ تھا، چند دنوں تک وہ اپنے فرائض منصبی انجام دیتا رہا، پھر اس نے بہ عذر علالت اپنے منصب سے استعفےٰ دیدیا، استعفےٰ دینے کے بعد اسے اپنی نوشابہ کی جستجو ہوئی، آخر اس نے اسے پالیا اور اسے لیکر ایک دوسرے شہر میں چلا گیا، جہاں کوئی بھی ان دونوں سے واقف نہ تھا، وہاں اس نے باقاعدہ نوشابہ سے نکاح کر لیا،

منصور، اب "پاپ کی بستی" سے پریم کی نگری میں آگیا تھا، یہاں اس کی اور نوشابہ کی زندگی بڑے سکھ سے بسر ہو رہی تھی، نوشابہ کو اس کا "ہیتم" بڑے دکھ سہنے کے بعد ملا تھا، اب دونوں ایک دوسرے

نہ فرماتے کہ "اوتیت جوامع الکلم" آنحضرت جو لفظ استعمال فرماتے تھے، وہ مختصر ہوتے تھے، لیکن معانی کثیرہ کے حامل ہوتے تھے،

ابو عبداللہ، مہدی کے وزیر کا قول ہے کہ بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ عوام اسے اچھی طرح سمجھ لیں، خواص اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہوں، اور بحتری کا قول ہے، بلاغت اس کلام کو کہتے ہیں، جو مختصر ہو، جامع ہو، دلکش ہو، گنجلک سے بری ہو!

(ترجمہ از، "المستطرف" مطبوعہ مصر)۔

بلاغت و فصاحت

بیان کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے، " الرّحمٰن علم القران خلق الانسان علمہ البیان" سرکارِ دوعالم کا ارشاد ہے" ان من البیان لسحرا" ابن المعتز کا قول ہے ـــــ "بیان دل کا ترجمان اور عقل کی صیقل ہے!" جاحظ کا قول ہے ـــــ "بیان کی تعریف یہ ہے کہ مافی الضمیر کو کھول کر بیان کر دے، الفاظ اور معنی، ساتھ ساتھ چلیں!"

بلاغت کے لغوی معنی پہونچنے کے ہیں، یعنی مقصد اور مفہوم کی انتہا تک پہونچنا، علمائے یونان کہتے ہیں کہ بلاغت سے مراد ہے، خیال اور دلیل کی وضاحت کلی، کم سے کم وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ خیالات کا اظہار کر دینا، حسنِ اشارہ، علمائے ہنود کے نزدیک، بلاغت کے معنی ہیں، کلام کی، اور خیالات کی خوبی کے ساتھ گرہ کشائی، کندی کا قول ہے، "بلاغت کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کم ہوں، اور معنی زیادہ"

روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ امیر معاویہ نے سوال کیا، بلیغ کس آدمی کو کہیں گے،؟ کہا گیا، بلیغ وہ شخص کہا جائے گا، جس کے الفاظ کم ہوں، معنی زیادہ، اور رواں ہوں، بے ساختگی کی شان موجود ہو اگر بلیغ ہونا، مایۂ فخر و ناز ہوتا تو سیدالعرب و العجم صلی اللہ علیہ وسلم

کر دیں تو بہتر ہے، اور اگر آپ نے جبر کیا تو خدا کی قسم میرے لب لعنت پر نہیں کھل سکتے،

امیر معاویہ نے کہا، اے احنف اٹھ کھڑا ہو، وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، اور منبر پر چڑھ کر انہوں نے حمد و ثنا کے بعد کہا،

"اے لوگو! امیر المومنین معاویہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں علیؓ پر لعنت بھیجوں، لوگو سن لو، میں کہتا ہوں، علیؓ اور معاویہ نے اختلاف کیا، مقابلہ کیا، دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے برسر اقتدار ہونے کا دعوٰے کیا، اور ایک دوسرے کو باغی کہہ کر، جنگ آزمائی کی، میں کہتا ہوں، اے اللہ، تیری، تیرے ملائکہ مقربین، انبیاء مرسلین اور جمیع مخلوق کی اس پر لعنت ہو، جو ان دونوں میں واقعی باغی تھا، اسی طرح ان دونوں میں سے اس جماعت کو بھی راندۂ درگاہ بنا جو بغاوت کی ساتھی تھی، یا اللہ، جماعت باغیہ اور شخص باغی پر اپنی زیادہ سے زیادہ لعنت بھیج، اے معاویہ، میں نے جو کچھ کہا ہے، اس میں نہ اب ایک حرف گھٹاؤں گا، نہ بڑھاؤں گا، اگرچہ مجھے قتل کیوں نہ کر ڈالا جائے،"

امیر معاویہ نے کہا، اے ابو بحر، ہم تمہیں معاف کرتے ہیں.

پھر امیر معاویہ نے، عقیل بن ابی طالب سے کہا، علیؓ نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اور میں حسن سلوک سے پیش آ رہا ہوں، تم

حکایت

امیر معاویہ اپنے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے، ان کی خدمت میں، اشراف واعیان حاضر تھے، حاضرین میں احنف بن قیس بھی تھے، اتنے میں ایک شامی آیا، اور اس نے کھڑے کھڑے باتیں شروع کر دیں، آخر میں اس نے حضرت علیؑ پر لعنت شروع کر دی،

احنف نے کہا" اے امیر المومنین، اس شخص کو اگر یہ اندازہ ہوتا کہ آپ کی خوشنودی، انبیاء و مرسلین پر لعنت بھیجنے سے حاصل ہو سکتی ہے، تو یہ بے دھڑک ان پر بھی لعنت بھیجنے لگتا، لیکن میں کہتا ہوں، اے امیر المومنین خدا سے ڈریئے، حضرت علیؑ کا ذکر چھوڑ دیجے، وہ اپنے رب سے جا ملے، اپنی لحد میں پہونچ گئے، اب وہ ہیں اور ان کے اعمال اور خدا کی قسم میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی تلوار کھری تھی، ان کے کپڑے پاک تھے، اور یہ باتیں بڑی ناسزا ہیں،"

"امیر معاویہ نے کہا، اے احنف تجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا، اور خدا کی قسم میں تجھے منبر پر کھڑا کر کے رہوں گا، اور تجھے خواہ برضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ علیؑ پر لعنت بھیجنا ہی پڑے گی!"

احنف نے جواب دیا، اے امیر المومنین اگر آپ مجھے معاف

حکایت

خلیفہ ہاروں رشید، اپنے ندیموں اور مصاحبوں کے مجمع میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت حاضر خدمت ہوئی، اس نے کہا ——— اے امیرالمومنین خدا تیری آنکھوں کو سکون مرحمت کرے، اور خدا نے جو کچھ تجھے دیا ہے تو اس کا سکھ لوٹے، اور تیری خوش بختی کو انتہا تک پہونچا دے، تو بڑا اچھا حکمراں ہے، اور بڑا اچھا انصاف کرتا ہے،"

ہارون نے پوچھا، "اے عورت تو کون ہے؟" اس نے جواب دیا میں آل برمک میں سے ہوں جس کے مردوں کو تو نے قتل کر دیا، جس کا مال و اسباب تو نے چھین لیا، جن کی دولت و ثروت پر تو نے قبضہ کر لیا!"

یہ سن کر ہاروں نے کہا، "برمک کے مردوں کا جہاں تک تعلق ہے ان پر خدا کا حکم نافذ ہو چکا، جو کچھ ان کے مقدر میں لکھا تھا، وہ پورا ہوا، لیکن مال موجود ہے، اور وہ تجھے واپس کیا جاتا ہے!"

پھر وہ حاضرین کی طرف متوجہ ہوا، اور کہا، "کچھ سمجھے بھی یہ عورت کیا کہہ گئی"؟ لوگوں نے جواب دیا، "ہم اس کے سوا کچھ نہیں سمجھے، کہ اس نے آپ کو دعا دی!" ہارون نے کہا، "تم بالکل نہیں سمجھے ——— اس نے یہ دعا دی کہ خدا تیری آنکھوں کو سکون عطا کرے تو

منبر پر جاؤ، اور علیؑ پر لعنت بھیجو، عقیل نے کہا، بہتر، میں جاتا ہوں، یہ کہہ کر وہ منبر پر چڑھ گئے، پھر انہوں نے حمد و ثنا کے بعد کہا،

" اے لوگو، معاویہ ابن ابی سفیان نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں علی ابن ابی طالب پر لعنت بھیجوں، "خدا کی اس پر لعنت ہو!"

یہ کہہ کر وہ منبر سے اتر آئے، امیر معاویہ نے کہا، لیکن آپ نے یہ وضاحت تو کی نہیں کہ ہم دونوں میں سے کس پر آپنے لعنت بھیجی ہے، عقیل نے جواب دیا، "خدا کی قسم جو کچھ میں کہہ چکا اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں کروں گا، متکلم کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے، وہی زبان پر آتا ہے۔

" ترجمہ از المستظرف، مطبوعہ مصر"

انجمن ترقی اردو پاکستان
کتب خانہ اردو کالج
اسپتال روڈ کراچی

M. Zubair

کلام میرؔ

میرؔ کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا،
سورج کو چراغ ہے دکھانا!

میرؔ کا دیوان بہت طویل و ضخیم ہے، اس کے کئی خلاصے بھی شایع ہو چکے ہیں۔ میرؔ کو ہر شخص اپنی نظر سے دیکھتا ہے، میں نے بھی یہ جرأت کی ہے، اور، سمندر کی چند موجوں کو، شبنم کے قطروں کی طرح پھول کی پنکھڑیوں پر رکھکر بازار ادب میں لایا ہوں،

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول!
پھول میں نے کچھ چنے ہیں ان کے دامن کیلئے

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز رکھے ہے   قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرؔ دیواں میں

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا   مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا   دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
سلیقے سے میری نبھی محبت میں   تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

تو مطلب یہ تھا کہ ان کی حرکت بند ہو جائے، اور جب آنکھ حرکت کرنے سے
رک جاتی ہے، تو وہ اندھی ہو جاتی ہے، اور جب اس نے کہا، خدا نے
جو کچھ تجھے دیا ہے تو اس کا سکھ لوٹے، تو وہ دراصل اس آیت قرآنی کی
طرف اشارہ کر رہی تھی "حتیٰ اذا فرحوا بما اوتوا اخذنا ھم بغتۃ"
یعنی جب کفار اور طاغوت، اپنے مال و دولت میں رنگ رلیاں کر
رہے تھے، تو خدا کا قہر دفعتہً ان پر ٹوٹ پڑا، اور جب اس نے یہ
کہا کہ خدا تیری خوش بختی کو انتہا تک پہونچا دے تو وہ درحقیقت شاعر
کا یہ شعر مجھے سنا رہی تھی،

اذا تم امر بدا نقصہ
ترقب زوالاً اذا قیل تم!

یعنی عروج کی انتہا، زوال کا آغاز ہوتی ہے، اور جب اس نے
میری حکومت اور انصاف کی طنزیہ تعریف کی، تو اس کے پیش نظر
یہ آیت قرآنی تھی، "واما القاسطون فکانوا لجھنم حطبا، فتعجبوا
من ذالك!" یعنی میں ایسا انصاف کرتا ہوں کہ مجھے جہنم کا ایندھن
بننا پڑے گا!"

(ترجمہ از المستطرف، مطبوعہ مصر)

اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　دامن کے چاک اور گریباں کے تار میں

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا　　حیف بندے ہوئے خدا نہوئے

حالت تو یہ کہ مجکو غموں سے نہیں فراغ　　دل سوزش دُرونی سے جلتا ہی جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہی سارا جگر ہی داغ　　ہے نام مجلسوں میں مرا میر بیدماغ
ازبکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی　　تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا　　انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اسکا　　منہ تکیئے غزل پڑھتے، عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا　　ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک　　آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا
غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے　　وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا　　ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — ناداں پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل — اک مشت پر پڑا تھا گلشن میں جائے بلبل

کیوں کر گلی سے اسکی اٹھ میں چلا جاتا — یاں خاک میں ملنا تھا، لوہو میں نہانا تھا
کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ — کل میرؔ کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دِوانا تھا

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں — بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ پہ عاشق — وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے میں رو دیا تو لگے کہنے نہ کہہ میرؔ — سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

متصل روتے ہی رہئے تو بجھے آتشِ دل — ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

موجیں کرے ہی بحر جہاں میں ابھی تو تو   جانیگا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں   میر کو تم عبث اداس کیا !

داغ فراق و حسرت وصل، آرزوئے شوق
میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تونے کہ یاں جی نکل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑھی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

تمہیں تو زہد وورع پر بہت ہے اپنے غرور
خدا ہے شیخ جی ہم سے بھی گناہ گاروں کا

یک قطرہ، خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا   قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک   سر سے سودائے جستجو نہ گیا

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا　　آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا
شب کو فتے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا تھا　　جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انہوں کا　　جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا
مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے　　کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترکِ اسلام کیا

تھے برے بیچوں کے تیور لیک　　شیخ میخانے سے بھلا کس کا
تاب کس کو جو حال میرؔ سنے　　حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھا　　ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

پوچھو تو میرؔ سے کیا، کوئی نظر پڑا ہے　　چہرہ اتر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا

کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں　　رنگ اڑ جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا — وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا — رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا
گلی میں اس کے گیا سو گیا نہ بولا پھر — میں میرؔ میرؔ کر اسکو بہت پکار رہا

گلیوں میں اب تلک بھی مذکور ہے ہمارا — افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا
مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم — بالفعل اب ارادہ تاگور ہے ہمارا
ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

جبدم کہ تیغ عشق کھنچی بوالہوس کہاں — سن لیجئے کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا
وہ دشتِ خوفناک رہا ہے مرا وطن — سنکر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

سحر گہ عید میں دور سبو تھا — پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا!

کبھو جائے گی جو اُدھر صبا، تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا، ترے باغ تازہ میں خار تھا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

مربوط ہیں تجھ سے یہی سب ناکس و نااہل اس باغ میں ہم نے گُلِ بے خار نہ پایا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ مذہب عشق اختیار کیا

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سو کھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پرچشم وہ میر   میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ   یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

کس کو مرے حال سے تھی آگہی   نالۂ شب، سب کو خبر کر گیا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم   یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

بے زری کا نہ کر گلہ غافل   رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گذرے   وقت رحلت کسی کنے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال   یک ازاں جملہ ایک سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیر نگیں   ساتھ مور و ملخ کا لشکر تھا
لعل و یاقوت، دہم، زر و گوہر   چاہیئے جسقدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے گیا   ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا   میر معلوم ہے قلندر تھا

گو توجہ سے زمانہ کی جہاں میں مجکو   جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہوا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا　　پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا
نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن　　غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

دل مجھے اس گلی میں لیجا کر　　اور بھی خاک میں ملا لایا

اک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں　　آتے ہو اب تو آؤ، پھر ہم میں کیا رہیگا

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوان زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا
کہیں ہیں میرؔ کو مارا گیا شب اس کے کوچہ میں
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر　　سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

کھلے گا اس قصۂ مجنوں　　یعنی پردے میں غم سنائیگا

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر　　مسجد میں ہے کیا شیخ ؟ پیالہ نہ نوالا

تھا ناز بہت ہمکو دانست پر اپنی بھی — آخر وہ برا نکلا ہم جسکو بھلا جانا
اے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہجائیں — اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

جس شعر پہ سماع تھا کل خانقاہ میں — وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے — میکدہ اک جہاں ہے گویا ! !
وہی شور و مزاج شب میں ہے — میر اب تک جوان ہے گویا

بارے مستوں نے ہوشیاری کی — دے کے کچھہ محتسب کا منہ جھلسا

کام میں قدرت کے کچھہ بولا نہیں جاتا ہے ہائے
خوبرو اسکو کیا، لیکن بہت بدخو کیا

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات — اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہوگئے مجبور — اس میں کیا اختیار ہے اپنا
کچھہ نہیں مثال عنقا لیک — شہر شہر اشتہار ہے اپنا

شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح تو کبتک مرے منہ کو دھوتا رہیگا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤنکو تو کبتک یہ موتی پروتا رہے گا

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا اب جس جگہ کے داغ ہے یاں آگے درد تھا

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
عشق خوباں کو میر، میں اپنا قبلہ و کعبہ و امام کیا

بسان خاک ہو پامال راہ خلق اے میر رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

بزم عشرت میں ملامت ہم نگوں بختوں کے تئیں
جوں حباب بادہ ساغر سرنگوں ہو جائے گا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزہ جانا

جس کو تم آسمان کہتے ہو　　سو دلوں کا غبار ہے اپنا

تحمل نہ تھا جس کو ٹک سو وہ ہیں　　ستم! کیسے کیسے اٹھانے لگا

کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر　　کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا
کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر　　دل ہو نہ گیا گداز تیرا

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے　　لگے ہے ہمیں تو وہ عیار سا

وائے احوال اس جفاکش کا　　عاشق اپنا جسے وہ جان گیا
کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے　　آج سو سو طرف گمان گیا
کون جی سے نہ جائے گا اے میر　　حیف یہ ہے کہ نوجوان گیا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا　　دل نے جگر کی اور اشارت کی یاں گرا
کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے　　پتھر بھی واں کے جل گئے جا کر جہاں گرا

تڑپے ہے جبکہ سینے میں اچھلے ہے دو دو ہاتھ　　گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

میر بھی دیر کے لوگوں ہی سی کہنے لگا   کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلمان ہوتا

کچھ زرد زرد چہرہ، کچھ لاغری بدن میں   کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

پریشاں ہو ادوستی کر کے میں   بہت مجکو ارمان تھا چاہ کا
اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے   مرا زمزمہ گاہ و بیگاہ کا

صاحب ہو مار ڈالو مجھے تم و گر نہ کچھ   جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا

ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے   اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانہ تھا
کیا مورتیں بگڑی ہیں مشتاقوں کی ہجراں میں   اس چہرے کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا

دن جی کے الجھنے ہی کے جھگڑے میں کٹے ہیں   رات اس کے خیالات سے رہتے ہیں قضایا

دل نے کیا کیا نہ درد رات دیئے   جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا!!

واعظ کہے سو سچ ہے و لیکن فروش ہے   ہم ذکر کبھی سنا نہیں صوم و صلوت کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھیر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہیئے، شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا، وہ موسم وہ ہنگام گیا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہوئے گا
درد انگیز انداز کی باتیں پڑھ کر اکثر روئیگا

جب نے مزمہ کرتی ہے صدا چبھتی ہی دلمیں   بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

قریب دیر خضر آیا تھا، لیکن   ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا

نہ ملیو چاہنے والوں سے اپنے   نہ جانے تجھ سے یہ کن نے کہا تھا
ملے برسوں وہی بیگانگی تھی   ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا
صنم خانے سے اٹھ کعبے گئے ہم   کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا

رہے تو کھڑے گھڑی مر گھر آگے پھر گئے   میں بے دیار و بے دل و بے خانماں ہوا

نہیں تاب لاتا دل زار اب　　بہت ہم نے صبر و تحمل کیا
زمین غزل ملک سی ہوگئی　　یہ قلعہ تصرف میں بالکل کیا
حقیقت نہ میرا اپنی سمجھی گئی　　شب و روز ہم نے تامل کیا

لوگ جب ذکر یار کرتے ہیں　　دیکھ رہتا ہوں دیر منہ سب کا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا　　میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا

دیکھا نہ ادہر ورنہ آتا نہ نظر پھیر ہیں　　جی مفت مرا جاتا اس شوخ کا کیا جاتا

مکے گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا　　جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

خوب کیا جو اہل کرم کے جور کا کچھ نہ خیال کیا　　ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ترک سوال کیا

منہ اپنا کبھو وہ ادھر کر رہے گا　　ہمیں عشق ہے تو اثر کر رہے گا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا　　غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
رکھے رہتے ہیں دل پہ ہاتھ اے میر　　یہیں شاید کہ سب غم ہے ہمارا

کہتے تھے اس سے ملیئے تو کیا کیا نہ کہیئے لیک　　وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات
اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو　　جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اٹھائی بات

ملامت گر نہ مجکو کر ملامت　　جلے کو اور تو اتنا جلا مت !
تری نا آشنائی کے ہیں بندے　　نہ وہ ابربط نے صاحب سلامت
بہت رونے نے رسوا کر دکھایا　　نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت

پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے　　پر تمہیں ان میں ہمیں بھائے بہت
میرے پوچھا جو میں عاشق ہو تم　　ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

اب تو وفا و مہر کا مذکور رہی نہیں　　تم کس سمے کی کہتے ہو، ہے یہ کہانی کی بات

اس غصیلے سے کیا کسو کی نبھے　　مہربانی ہے کم عتاب بہت

رہا رابطہ غارت دل تلک بس　　نہیں اب تو بندے سے صاحب سلامت
کوئی فصل گل میں بھی توبہ کرے ہے　　رہیگی ہمیں دیر اس کی ندامت
گئے سو گئے، بیشتر تھی جوانی　　رہ عشق میں میر آئندہ جامت

اچٹتی ملاقات کب تک رہیگی   کبھو تو تہ دل سے بھی یار ہوگا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے   رہیگا دیر تک ماتم ہمارا

یک جرعہ شراب ہی میں واعظ   ہر سخرگی کا باب نکلا

برسوں ہوے، گئے اسے پر بھولتا نہیں   یادش بخیر، میر، رہی خوش جہاں ہی لب

نے چاہ وہ اسے ہے نہ مجکو ہے وہ دماغ   جانا مرا ادھر کو بشرط طلب ہے اب

میر اس خرابے میں کیا آباد رہوے کوئی   دیوار و در گرے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

ہر جنس کے خواہاں ملے بازار جہاں میں   لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت
اس راز کو رکھ جی ہی میں تا جی بچے تیرا   زنہار جو کرتا ہو تو اظہار محبت

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم   ہے خدا جانیئے یہ کب کی بات
گو کہ آتش زباں تھے آگے میر   اب کی، کہیئے، گئی وہ تب کی بات

ے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے   پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

حال کہہ چپ رہا تو میں بولا   کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا میر

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

رنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگان عشق   ہے میر راہ و رسم دیار وفا کچھ اور

مبارک تمہیں میر ہو عشق کرنا   بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

پڑتے نگہ اس شوخ کی ہوتا ہے یہ احوال   رہ جائے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر

نگ پناہ خدا سے بندے، دل لگنا اک آفت ہے
عشق نہ کر زنہار نہ کر واللہ نہ کر باللہ نہ کر

بزم میں منہ ادھر کریں کیونکر   اور نیچی نظر کریں کیوں کر

یاد ایام کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات   شور و شر سے میر اک فتنہ رہا کرتا تھا رات

میرے سنگ مزار پر فرہاد   رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد
سنتے ہو ٹک سنو کہ پھر مجھ بعد   نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

ثبات قصر و در و بام و خشت و گل کتنا   عمارت دل درویش کی رکھو بنیاد

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے !   اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میرؔ   کہ سر جاتا ہے گام اولیں پر !

جی میں آوے سو کیجیو پیارے   ایک ہو جو نہ درپئے آزار

شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ   ہے پیارے ہنوز دلی دور

اول کار محبت تو بہت سہل ہے میرؔ   جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخر کار

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر جی زرد ہوتے جاتے ہو   کیا کہیں تم نے بھی کیا ہی عشق

…کیا اپنی آنکھ میں آیا نہ یاں کا   خزف سے لیکے دیکھا در تر تک
…ں نے شب آگ سا دیکھا سلگتے   اسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

…ہے ہے عشق و درد، ڈو ڈو پہر تک   سر زخم پہنچا ہے شاید جگر تک
…بہار آئی پر ایک پتی بھی گل کی   نہ آئی اسیران بے بال و پر تک

…بندوں سے کام کب نکلا   مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

…وں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے   آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال

…ہے تو ہم بھی اس زندگی سے گزرے   سوگند ہے تمہیں اب جو در گزر کرو تم
…سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر   ہم بھی تو آدمی ہیں ٹک منہ ادھر کرو تم

…ہم کیا آتے ہیں گے معلومات   یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
…بتاں اسقدر جفا ہم پر   عاقبت بندہ خدا ہیں ہم

یوں بھی مشکل ہے ووں بھی مشکل ہے　　سر جھکائے گزر کریں کیونکر
دل نہیں درد مند اپنا میر　　آہ و نالے اثر کریں کیونکر

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی　　ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر
کنج قفس میں جوں توں کاٹیں گے ہم اسیراں
سیر چمن کے شایاں اپنے نہیں رہے پر
غصے میں عالم اس کا کیا کیا نظر پڑا ہے
تلواریں کھنچتیاں تھیں اس کی جبیں کی چیں پر

دردمندوں سے تمہیں دور پھرا کرتے ہو
پوچھنے ورنہ سبھی آتے ہیں بیمار کے پاس

رہا بے خبر گرچہ ہجراں میں میر　　رہے گوش اس کی خبر کی طرف

اسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے　　کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

اے تجھ بغیر لالہ و باغ و بہار حیف　　گل سے چمن بھرے ہیں نہ ہو تو ہزار حیف

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو برا اپنا، بھلا کرتے ہیں
کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی، غرض
غم کو کھایا کرے ہیں، لوہو پیا کرتے ہیں

جفائیں دیکھ لیاں بیوفائیاں دیکھیں   بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر   میں ورنہ وہی خلوتی رازِ نہاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا   میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی   میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیرِ زباں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم   اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

نے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنا غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلہ نہیں!

کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک   یاد رہتی ترے حضور نہیں

کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر　　گویا جنس ناروا ہیں ہم!

کس طور کوئی تجھ سے مقصود کرے حاصل　　نے رحم ترے جی میں، نے دلمیں ترس ظالم

ہر ہر سخن پہ اُتّو کرتے ہو گفتگو تم　　ان بدمزاجیوں کو چھوڑو گے بھی کبھو
چاہیں تو تم کو چاہیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں　　خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو

کم پائی اسقدر رہی منزل ہے دور اتنی　　طے کس طرح کرو گے یارو یہ مرحلہ

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں　　ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن　　مرضِ عشق کا علاج نہیں
شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میر　　جنس دل کا کہیں رواج نہیں

امڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں　　جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں!

بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے
نیک و بد کوئی کہے، بیٹھے سنا کرتے ہیں

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور　　اب مرے عہد میں فسانے ہیں
مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں　　شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں
عشق کرتے ہیں اس پری رو سے　　میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہوئے ہو ورنہ　　دوستی ننگ نہیں، عیب نہیں، عار نہیں
صورت آئینے میں ٹک دیکھ تو کیا صورت ہے　　بدزبانی تجھے اس منہ پہ سزاوار نہیں

بیخودی پر نہ میر کی جاؤ　　تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

تم کہو میر کو چاہو سو، کہ چاہیں ہیں تمہیں
اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

میں آپ چھیڑ چھیڑ کے کھاتا ہوں گالیاں　　خوش آ گئی ہیں اسکی مجھے بدزبانیاں

محفلِ یار میں تو بار نہیں پاتا میں　　در و دیوار کو احوال سنا جاتا ہوں

غیرت سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر　　آ گئے خدا کے جب ہم محو دعا ہوئے

ہم تو ہوئے تھے میر سے اسدن ہی نا امید   جسدن سنا کہ اُس نے دیا دل بتاں کے تئیں

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں   کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر   یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا   مری آہ نے برچھیاں ماریاں
گیا جان سے یک جہاں لیک شوخ   نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز   ہوئیں دام رہ صد گرفتاریاں
کیا درد و غم نے مجھے نا امید   کہ محبتوں کو یہ بھی تھیں بیماریاں
تری آشنائی سے حد ہوئی   بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں   کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میر   اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

طائران خوش نوا اس باغ کے تھے ہم کبھو   اب ترستے ہیں قفس میں اک پرافشانی کے تئیں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں   پر مجھے بھی یہ خوب جانتے ہیں

اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن   وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں

اس کی طرز نگاہ مت پوچھو! جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

ہوئے ہم پیر سو ساکت ہیں اب میرؔ تمہاری بات کیا ہے تم جواں ہو

مت تربت میرؔ کو مٹاؤ رہنے دو غریب کا نشاں تو

کھلتا ہوں وہاں صحبت رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اسی شہر سے میخانہ جہاں ہو
رہنے سے مرے پاس کے بدنام ہوئے تم
اب جاکے رہو واں کوئی رسوا نہ جہاں ہو

اپنے حسن رفتنی پر آج مت مغرور ہو پاس تو ہی جن کے وے ہی کل کہیں گے دور ہو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے ان نے اک حرف بھی لکھا نہ کبھو
گو شگفتہ چمن چمن تھے گل! غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو

موسم ابر ہو سبو بھی ہو گل ہو گلشن ہو اور تو بھی ہو

عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے　　　چھاتی پتھر کی ان کی جو وفا کرتے ہیں

گو کہ بت خانے جا رہا ہوں میں　　　بخدا باخدا رہا ہوں میں!

کون وہ ایسا ظالم تھا استاد فن عیاری کا
اتنے سن میں جن نے تجھ کو ایسے فریب سکھائے ہیں
میر مقدس آدمی ہیں، تھے سبحہ بکف میخانے میں
صبح جو ہم بھی جا نکلے دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

صبح سے اور کبھی پاتا ہوں اسے شام کو تند
کام کرتی ہے جو کچھ میری دعا مت پوچھو
ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اس کے اک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
وقت قتل آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ
میں اشارت کی اُدھر، اُن نے کہا مت پوچھو
خواہ مارا انہیں نے میر کو یا آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا — تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کرینگے
اپنے بھی جی ہے آخر انصاف کر کہ کب تک — تو یہ ستم کریگا ہم درگزر کرینگے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن — ان بوالہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے
ہر اشک مرا ہے دُرِ شہوار سے بہتر — ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

جبکہ پہلو سے یار اٹھتا ہے — درد بے اختیار اٹھتا ہے

اس سخن ناشنو کو کیا کہیئے! — غیر کی بات مان جاتا ہے!

دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج — گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے
بہت سعی کریئے تو مر رہیئے میر — بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے — یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گذر جائے

کب تک آئینے کا یہ حسن قبول
منہ ترا اس طرف کبھو بھی ہو

دل تمنا کدہ تو ہے پہ میرؔ
ہو تو اس کی ہو آرزو بھی ہو

شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا!
دل سے اپنے ہمیں گلہ ہے یہہ

میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانے
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

ہر مشت خاک یاں کی چاہے ہے اک تامل
بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

ضعف پیری میں زندگانی بھی
دوش پر اپنے بار سا ہے کچھ

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا
اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلا گئے

پہونچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

اُن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں   تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح   اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے   نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر   جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہوگئی

جس جگہ دورِ جام ہوتا ہے   واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے
ہم تو اک حرف کے نہیں ممنون   کیسا خط و پیام ہوتا ہے
میر صاحب بھی اس کے ہاں تھے پر   جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

میرؔ جب سے گیا ہے دل تب سے — میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

اے شبِ ہجر راست کہہ تجھکو — بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

اداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر — صنم کدے میں تو ٹک آکے دل لگا بھی ہے
گزار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں — کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

صید افگنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے — اس دل کے تئیں پیشِ کشِ تیر کریں گے

تا دمِ مرگ غم خوشی کا نہیں — دل آزردہ گر سلامت ہے
تجکو مسجد ہے مجکو مے خانہ — واعظا اپنی اپنی قسمت ہے
تربتِ میرؔ پر ہیں اہلِ سخن — ہر طرف حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریب فاتحہ سے چل — بخدا واجب الزیارت ہے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی — میں نے مر مر کے زندگانی کی
حالِ بد، گفتنی نہیں میرا — تو نے پوچھا تو مہربانی کی
بیت بحثی سمجھ کے کر بلبل — دھوم ہے میری خوش زبانی کی

عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں ؟
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہوتی ہمیں جی سے مارا اثر سی آرزو نے
نہ بھائیں تجھے میری باتیں وگرنہ رکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے

رُلا دیتی ہے خاک میں آدمی کو محبت ہے کوئی بلا آسمانی !
گرامی گہر میر جی تھا ہمارا ولے عشق میں قدر ہمنے نہ جانی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ افسوس تمکو میر سے صحبت نہیں رہی

میں اس کی جدائی میں تصدیع بہت پائی
دردکشی و کم پائی بے صبری و تنہائی
تھا صبر و سکوں جب تک رہتا تھا مجھے غش سا

گرداب وار یار ترے صدقے جائیے　　دریا کا ہیر پایئے تیرانہ پایئے

جو کفر جانتے تھے عشق بتاں کو وہ ہی　　مسجد کے آگے آخر قشقہ لگا کر بیٹھے
گیا اپنی اور اس کی اب نقل کریے صحبت　　مجلس سے اٹھ گیا وہ ٹک ہم جو آ کر بیٹھے

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجکو تو ہنسی سے　　پر مجھپہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے　　مدعا ہم کو انتقام سے ہے!
شعر میرے ہیں سب خواص پسند　　گفتگو پر مجھے عوام سے ہے!
سہل ہے میر کا سمجھنا کیا　　ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

یاران دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھنا میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے　　نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی

باولے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار

مسجد میں تو شیخ کو فروشاں دیکھا　　میخانے میں جوش بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشۂ عافیت جہاں میں ہمنے　　دیکھا تو محلۂ خموشاں دیکھا

جس وقت شروع یہ حکایت ہوگی　　رنجیدگی یک دگر نہایت ہوگی
احوال وفا کا اپنی ہرگز مجھ سے　　مت پوچھ کہ کہنے میں شکایت ہوگی

بے تابیٔ دل سر پہ اک دور بلا لائی !

مجکو مارا بھلا کیا تونے　　پر وفا کا برا کیا تونے

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے　　خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے
نہیں عشق کا درد لذت سے خالی　　جسے ذوق ہے وہ مزا جانتا ہے
گہے زیر برقع گہے گیسوؤں میں　　غرض خوب وہ منہ چھپا جانتا ہے
مجھے جانے ہے آپ سا ہی فریبی　　دعا کو بھی میری دغا جانتا ہے
جہاں میر عاشق ہوا خوار ہی تھا
یہ سودائی کب دل لگا جانتا ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ　　اب توقع نہیں رہائی کی
میر کی بندگی میں جان بازی　　سیر سی ہوگئی خدائی کی

جب سامنے گئے ہم، ہم نے اسے دعا دی
شکل ان نے دیکھتے ہی غصہ کیا زباں کی

دیکھا مجھے کوچے میں جو اپنے تو وہ بولا   لاؤ اسے کل بھی پس دیوار یہی تھا
نوری کو چڑھائے وہ کبھی آگئے سر مرے   جاتا ہے تو کہتا ہوں مرا یار یہی تھا
کیوں قتل کیا مصحفیؔ خستہ کو تونے   کیا چاہنے والوں میں گنہ گار یہی تھا

تجھ سے گر وہ دلا نہیں ملتا   زہر بھی تجھ کو کیا نہیں ملتا
اور سب کچھہ جہاں میں ملتا ہے   لیکن اک آشنا نہیں ملتا
بے نمک چھڑکے زخم پر اپنے   ہمکو کچھہ بھی مزا نہیں ملتا
ہم اگر ہو مجھے غنیمت جان   عاشق باوفا نہیں ملتا
جب یہ پوچھا کہ مصحفیؔ سے کھلا   ق کیوں تو اے بے وفا نہیں ملتا
ہنس کے بولا کہ او میاں ان سے   کیا کروں دل مرا نہیں ملتا

جی جائیگا رائگاں کسی کا   یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا
بن آہ وہاں کوئی کرے کیا   کچھہ بس نہ چلے جہاں کسی کا

قصہ کہوں کیا دل بیمار کا   عشق کی تپ تھی نہ بچا مر گیا

جانا ہمیں خاک بھی کچھہ بے بصری سے   یہاں نہ ہر ایک ذرہ میں خورشید عیاں تھا

مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی، اپنے وقت کے مانے ہوئے استاد تھے، مصحفی کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ فقر و فاقے سے مجبور ہو کر وہ اپنے اشعار مشاعرہ بازوں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتے تھے،

اگر یہ روایت، قصۂ جام جمشید، اور آئینۂ سکندر کی طرح محض خیال آرائی نہیں ہے بلکہ حقیقت اور واقعہ ہے، تو بھی ماننا پڑے گا مصحفی نے جو کچھ بیچنے کے قابل تھا، بیچ دیا لیکن،

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

مصحفی کے دیوان کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، تو اس میں خزف ریزوں کے ساتھ، ہیرے اور جواہر بھی ملیں گے، میں نے اپنی نظر کے مطابق، خزف ریزے الگ رکھ دیئے ہیں، اور ہیرے جواہرات کا یہ چھوٹا سا بازار سجایا ہے۔

بہار آئی خدا جانے کہ کیا گزری اسیروں پہ　　نہیں معلوم کچھ اب کی برس احوال زنداں کا

دے داد مری ورنہ میں کہہ بیٹھوں گا قاتل　　کل حشر کے دن بھی مرا خونخوار یہی تھا

جی رات لبوں پہ آ رہا تھا   مرنے میں ہمارے گیا رہا تھا
کیا وقت تھا وہ بھی جبکہ ہم تم   مے پیتے تھے ابر چھا رہا تھا

جو ملا اس نے بے وفائی کی   کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا

ہم نام ہی سنتے ہیں فقط مہر و وفا کا   آنکھوں سے کہیں مہر و وفا کو نہیں دیکھا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا   ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

یار ہوتا ہے جو اک دم بھی نظر سے پنہاں   چین پڑتا ہی نہیں مجکو یہ اسرار ہی کیا

گلی سے یار کی قاصد مرا شتاب آیا   جواب صاف ملا خط کا یہ جواب ملا
رہا کرا تو اسیر قفس کو اے صیاد   کلی چٹکنے لگی رنگ پر گلاب آیا

کیا غیر کا کھٹکا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا   یہ منہ مجھے تیرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اے مصحفی بعضے مرے کہنے کے ہیں قائل   بعضوں کا مقولہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اک طرف میکدہ میں یہ صحبت ہوئی [illegible]

کوئی پٹکتا ہے سر کوئی جان کھوتا ہے   ترے خرام نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا

لاشے پہ مصحفی کے کہتے ہیں لوگ افسوس   گیا مفت میں گیا ہے یہ نوجوان مارا

میرے اس کے حجاب کس دن تھا   درمیاں میں نقاب کس دن تھا
لطف کرتے تھے مجھ پہ ہر دم تم   جانِ من یہ عتاب کس دن تھا
حادثے ہوتے ہیں زمانے میں   اسقدر انقلاب کس دن تھا
موجد اس کام کا ہے تو ورنہ   قتلِ عاشق ثواب کس دن تھا

کیوں تیر لگاتا ہے مرے سنگ لحد پر   اس شوخ کو کیا شوق ہی پیمان شکنی کا

کل یار کی گلی میں ڈھونڈھا جو مصحفی کو   اک لاش تو پڑی تھی پر اس کا سر نہ دیکھا

قوت بازوئے قاتل نے کمی کی ورنہ   کام اپنا تو تمام ایک ہی شمشیر میں تھا

وائے وہ بسمل کہ سنبھلا اور سنبھل کر رہ گیا   مرغِ بسمل کی طرح دو گام چل کر رہ گیا

ہم نے تو یہی قول فلاطون سے سنا ہے   بیمار تپ عشق کا اچھا نہیں ہوتا

پچھے نہ کبھی تونے مرے دیدۂ گریاں   رکھا نہ کبھی تونے مرے زخم پہ پھاہا

ے نور ہے ویراں ہے اب کلبۂ احزاں   کیا کہیئے کبھی جلوہ گہ طور یہی تھا

ل جس کے حوالے کریں ایسا نہیں کوئی   یوں یار اگر پوچھو تو عالم ہے ہمارا

نداز محبت کے کوئی سیکھ لے ہم سے   کہتے ہیں جسے عشق وہی فن ہے ہمارا

بہ و دیر میں ڈھونڈھے جو کوئی لیکے چراغ
تجھ سا کافر نہ ملے اور نہ مسلمان مجھ سا

نفس عشق سے شاید وہ ہوا تھا پیدا
شعلۂ برق جو باراں سے بجھایا نہ گیا

رے اب تم بھی لگے خون غریباں کرنے
ہاتھ میں تم نے بھی تلوار سنبھالی کیا خوب

تھا یہ کہ دل نہ کسی سے لگائیے   اک قصہ خواں کی رات مجھے کیا خوش آئی بات

اے مصحفی گریبان سارا لہو سے تر ہے   یہ رنگ اپنا ظالم تونے کہاں بنایا

مصحفی اب تو میری جانب سے   اوس کے دل بیں غبار رہنے لگا

اول تو ترے کوچے میں آنا نہیں ملتا   آؤں تو کہیں تیرا ٹھکانا نہیں ملتا

میں نے تو تیرے عشق میں کیا کیا نہیں کیا   سب کچھ کیا ہے پر تجھے رسوا نہیں کیا

ظالم نے کیا سمجھ کے کیا مصحفی کو قتل   بیچارہ اسقدر تو گنہ گار کچھ نہ تھا

بے نصیبی کا گلہ ہے کہ ہم اسدم پہونچے   گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا

تھی فکر اہل جرم میں کسکو کروں میں قتل   اتنے میں یاد اس کو مرا نام آگیا

دلمیں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں   مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے نکلا

تیغ کئے ہوئے علم اب کہو کیوں کھڑے ہو تم   کام تو ہو چکا تمام مصحفی نزار کا

کہاں گئے تھے میاں مصحفی بتا دو تو لگا ئی رات بہت تمنے انجمن میں دیر

رکھتا تھا نہ جو بت کبھی زنار کمر پہ اب اس کی سجی رہتی ہے تلوار کمر پہ

سر غیر ہو زیب فتراک ہی آکر پھر کر لوٹتا سر ہمارا زمیں پر

تیر دل پہ تیر کھا کر، زخموں پہ زخم اٹھا کر آئے گلی سے اسکی ہم خون میں نہا کر

پھرتا ہے اس کے کوچے میں سرگشتہ مصحفی آتا ہے رحم مجکو بہت اس جوان پر

وہ دن گئے کہ تھا تو شیریں مقالیوں پر تیری زبان کھلی ہے ان روزوں گالیوں پر

جب تک کہ دم میں دم ہے رہیگا ترا خیال نادان ترک عشق کا مجھ پہ گمان کر

قاتل سے یہ کہو کہ تماشے کا وقت ہے جاتا ہے کوئی چھوڑ کے بسمل کو بیقرار
ملنے کی اس کے کیا کہوں کل اس نے مصحفی دو باتیں کر کے اور کیا دل کو بیقرار

تیار کا مصحفی خستہ کی انکار نہ کر شاید خوں سے ترا دامن فتراک ہنوز

نہ کر اے دل تو اظہارِ محبت　　غضب ڈھائیگا اقرارِ محبت
ہیں عاشق اور بھی لیکن نہ ہوگا　　کوئی مجھ سا گنہ گارِ محبت
نہ دیکھو چشمِ کم مصحفی کو !　　ہے دولت خواہ سرکارِ محبت

داحسرتا کہ قافلہ یاروں کا چل چکا　　ہم سے نہیں ہوا ابھی سازِ سفر درست

ہر آبلے میں نشترِ پر خار ہے نہاں　　پاؤں سے مرے پوچھئے منزل کی حقیقت

ہجر میں گل ہے خار کی مانند　　نکہتِ گل غبار کی مانند
ہے خوش آئند یار کا آنا　　موسمِ نو بہار کی مانند
خون میں تڑپا ہے کون سا بسمل　　اس دلِ بیقرار کی مانند
پھر گئیں ہم سے یار کی آنکھیں　　گردشِ روزگار کی مانند

اس ترکِ تیغ زن کو مرے دل کی کیا خبر　　قاتل کو بیقراری بسمل کی کیا خبر
منہ اٹھ گیا جدہر کو ادہر ہی چلے گئے　　آوارگانِ عشق کو منزل کی کیا خبر
شمعِ شبِ فراق بنے ہم تو مصحفی　　ہم دل جلوں کو عیش کی محفل کی کیا خبر

مصحفی عشق کر کے آخر کار خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

اے مصحفی مرغانِ چمن رہ گئے خاموش گلشن میں اگر زمزمہ پرواز ہوئے تم

کیوں تیوری چڑھی رہتی ہے اب کچھ نہیں معلوم
اس رنجش بے جا کا سبب کچھ نہیں معلوم

اے شب ہجر کہیں تیری سحر ہی کہ نہیں نالۂ نیم شبی تجھ میں اثر ہے کہ نہیں
جان پر اپنی جو کھیلا ہے جدائی میں تری بے خبر تجکو بھی کچھ اس کی خبر ہی کہ نہیں

اب ملاقات کی وہ شکل نہیں دیکھ لیتے ہیں گاہ گاہ کہیں

مقصود ہے آنکھوں سے ترے رخ کا نظارہ جب تو ہی نہ ہو پاس تو کس کام کی آنکھیں

پرواہ نہیں جو تمکو تو پرواہ نہیں ہمیں سچ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہیں تالیاں

کچ تا رات تو کہاں جاگا اب تلک ہے خمار آنکھوں میں

قصۂ عشق ہے وہ طول و طویل! جس کا انجام ہے نہ کچھ آغاز

مصحفی تیغِ نازِ خوباں سے ہو گیا قتل بے گناہ افسوس

کس سے کہیے آہ کیا ہوتا ہے عشق کچھ نہ پوچھو بد بلا ہوتا ہے عشق
کام بیگانے سے کچھ اس کو نہیں آشنا سے آشنا ہوتا ہے عشق
ماجرائے عشق تو مجھ سے نہ پوچھ سخت کافر ماجرا ہوتا ہے عشق
آنکھیں کس پرہیز سے کرتی ہیں دید جب تلک باہم چھپا ہوتا ہے عشق
چاہیئے پرہیز اس سے مصحفی دیکھ اے ناداں برا ہوتا ہے عشق

کسی سے میں نے از خود کب کیا عشق کچھ آپی آپ پیدا ہو گیا عشق
عبث رسوا کیا یاروں نے مجکو مجھے تو دیکھنے کا اس کے تھا عشق

ہمکو چمن میں جانے سے کیا کام مصحفی نے آشنائے بلبل و نے آشنائے گل

مصحفی اسکو میں سرگرم وفا پاتا ہوں ان دنوں کچھ تو ہوا ہے اثر زاریٔ دل

جانتے آپ سے جدا تجھ کو کرتے گر فرق جسم و جاں میں ہم

بن جن کو بات کرنا اے مصحفی سکھایا   ہر بات میں وہ میری اب بات کاٹتے ہیں

گلی سی شورشیں نہیں ہجراں کی مصحفی   اب اس گلی میں اپنا گزر ہی کبھی ہو نہیں

بزم نشاط سے ہمیں کیا کام مصحفی   ہم غمکدہ میں رہتے ہیں غمناک لوگ ہیں

شہباز سے نہیں کم کچھ ان تیوں کی آنکھیں   یہ لوگ جسکو چاہیں دم میں شکار کر لیں

یار ہیں چین بر جبیں سب، مہرباں کوئی نہیں
ہم سے ہنس کر بولنے والا یہاں کوئی نہیں

گو میں نے تو جھک جھک کے کئے سیکڑوں مجرے
پر خم نہ ہوئی اس بت مغرور کی گردن
ٹوٹے ہوئے پنجے کی طرح سے مرے آگے
جاتی ہے لچک شاعر مغرور کی گردن

غربت میں کبھی تصور ٹلتا نہیں ہے اس کا   شب ہائے ہجر میں یا کبھی ہم اس کے روبرو ہیں

تارے گن گن کے مصحفی کاٹی　　سب شبِ انتظار آنکھوں میں!

فلک جب ہمکو ہنساتا ہے مجھ پر　　میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

وہی فرقت میں اس کی زاریاں ہیں　　وہی راتیں وہی بیداریاں ہیں

روز کوچے میں اس کے جاتا ہے　　کہیں اے دل تو ہی قضا تو نہیں
پوچھتے کیا ہو حالِ دل میرا　　ہے عیاں تم سے کچھ چھپا تو نہیں
مصحفی کیوں خفا سے بیٹھے ہو　　کچھ کسی نے تمہیں کہا تو نہیں

ملنے کی تیری ہمکو بہت آرزو ہی یار　　پر کیا کریں کہ مرضی اللہ ہی نہیں

بہلائیں دل کو کس سے کبھی ہو کے ہم سخن　　اس بزم میں کسی سے ہمیں راہ ہی نہیں
اے مصحفی ہر ایک کو سخن کا غرور ہے　　طرزِ سخن سے پر کوئی آگاہ ہی نہیں

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی　　چھیڑ ہمکو نہ، بھرے بیٹھے ہیں!
قتل کا کس کے ارادہ ہے کہ آپ　　ہاتھ قبضہ پہ دھرے بیٹھے ہیں

ہر گام پہ پامال ہے، ہو کبک کہ طاؤس   انداز خرام بت طناز تو دیکھو!

قصۂ دردِ غریبی اس سے پوچھا چاہیے   موسم گل میں جو اپنے آشیاں سے دور ہو

گلے پر اپنے خنجر رکھ دیا خود   مرے دل کو مری ہمت کو دیکھو

اپنے عاشق کی چشم تر کو دیکھ   صدقے میں اک ذرا ادھر کو دیکھ
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ   مری حسرت بھری نظر کو دیکھ

بے زری کہتے ہیں جسکو مصحفی   کوئی بیماری سی بیماری ہے یہ

جتنی الفت زیادہ ہوتی ہے   دل کی حسرت زیادہ ہوتی ہے
دیکھتا ہوں جو تیری صورت کو   مجکو حیرت زیادہ ہوتی ہے
ہر گھڑی بے مروتی تیری   بے مروت زیادہ ہوتی ہے

ملنا ترا اغیار سے منظور کسے ہے   پر منع کرے تجکو یہ مقدور کسے ہے

ترا شوق دیدار پیدا ہوا ہے   پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

زبسکہ کرتے رہے بیکسوں پہ تم بیداد　　تمہارے کوچہ میں اکثر دہائیاں ہی رہیں
ہمارے اُن کے کسی دن موافقت نہوئی　　اُدھر سے عجز اِدھر کج ادائیاں ہی رہیں
دریغ بارے بچھڑے تو ایسے بچھڑے ہم　　کہ تا بروز قیامت جدائیاں ہی رہیں
اب اس کے ملنے کا کیا لطف مصحفی باہم　　نہ وہ سلوک نہ وہ آشنائیاں ہی رہیں

درِ جنت پہ بھی نہ ہمارا نہ رکھوں میں قدم　　گر ذرا چین بجبیں صورتِ رضواں دیکھوں

اے مصحفی وہاں سے ہم خوب رُوتے آئے　　سوئے چمن گئے تھے کیوں موسم خزاں میں

منہ پھیر کر چلے ہو اجی پھر کے دیکھ لو　　اک ناتواں کا جاتا ہے جی پھر کے دیکھ لو

شک ہے تمکو جو میری چاہت میں　　تم بھی دو روز عشق کر دیکھو!

مرتا ہے کوئی ایک نظر دیکھتے جاؤ　　جاتے ہو کدھر پھر کے اِدھر دیکھتے جاؤ

یہ وہ نہیں ناسور جو ہو بند کسی سے　　بہنے دو مرے دیدۂ گریاں کو نہ چھیڑو

گہ دَیر میں جاتا ہوں گہ آتا ہوں حرم میں　　پر دل کی تسلی نہ یہیں ہو نہ وہیں ہو

سنا ہے آگ لگی ہے چمن میں ہمنفسو! خبر تو لے کوئی بلبل کے آشیانے کی
گلہ نہ کیجئے یاروں کی بیوفائی کا کہ ان دنوں یہی تاثیر ہے زمانے کی

جھپکی ہے مصحفی کی ابھی آنکھ ہمدمو تم اس کو اس گھڑی نہ جگاؤ تو خوب ہے

یار کی آواز خوش نے مار کھا ہی ہمیں سچ تو یہ ہے کیا گلا ہے واہ کیا آواز ہے

راہ میں مجکو سب مرے ساتھی جان کر ناتواں چھوڑ گئے!

ہائے جن آنکھوں سے قطرہ اشک کا گرتا نہ تھا
کیا غضب ٹوٹا کہ یوں لخت جگر آنے لگے

بلبل نے آشیانہ جب اپنا اٹھا لیا پھر اس چمن میں بوم بسے یا ہما بسے

فرط الفت سے مری بات بگڑتی ہی گئی جو منایا انہیں وہ اور بھی مغرور ہوئے

لخت دل یوں ہوا میں بکھرے ہیں جیسے ابر بہار کے ٹکڑے

دیر و حرم بچشم حقیقت نہیں جدا   یعنی مآل سبحہ و زنار ایک ہے

مصحفی عشق کا اب نام نہ لے   جان رکھ لی ہے خدا نے تیری

مجکو پامال کر گیا ہے یہی ✓ یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے

آتا ہے اب یہ دل میں کہ ایجاد کیجئے   ماتم میں دل کے نالۂ و شیون نئے نئے

ذبح کے وقت بھی قاتل سے کہدیتا ہوں   آستیں دیکھ تری خون سے تر ہوتی ہے

رونے پہ مرے جو ہنس رہے ہو   یہ کون سی بات ہے ہنسی کی
شاہد رہیو تو اے شب ہجر   جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

کب اس طرف وہ بت کجکلاہ آتا ہے   گدا کے گھر میں کہیں پادشاہ آتا ہے

کیا جانئے کہ اکسیر کہ عنقا ہے یہ کیا ہے   ملتی نہیں جو چیز زمانے میں وفا ہے

جس سے امید وفا تھی بیوفائی اس نے کی   آشنائی کر کے پھر نا آشنائی اس نے کی

وہ نہیں ہم کہ سپر سینے یہ اپنے رکھیں بلکہ رکھ لیتے ہیں سینے کو سپر کے آگے

کیا تجکو فائدہ ہے بھلا اس سے اے فلک تو اسقدر جو درپے آزار خلق ہے
میں ہوں وہ خاک راہ کہ کوچے میں یار کے میرا سر شکستہ ہے اور پائے خلق ہے

حیراں ہیں سارے مفتی و قاضی و کوتوال آگے ترے کسی کی حکومت کہاں رہی

اے مصحفی سمجھے ہیں ہم اس شوخ کو غافل . آگاہ ہے وہ خوب وفاداری دل سے

اس نے دیکھا مجھے جو در پہ کہا کہدو اس کو یہاں سے اُٹھ جائے

افسانۂ عشق کس سے کہیئے! اس بات میں دردسر بہت ہے
کیا بگڑی ہے آج مصحفی سے اس کوچے میں شور و شر بہت ہے

گر ایک غضب ہو تو کرے کوئی گوارا رفتار غضب ہے تو گفتار غضب ہے

جب وہ قاتل خرام کرتا ہے! ل ہر قدم قتل عام کرتا ہے!

تیغ ہاتھ آئے گر مجھے تو کروں ! اس شب انتظار کے ٹکڑے !

دیکھا اسے آہ ہمنے کر لی ، حسرت کی نگاہ ہمنے کر لی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا ، کج اپنی کلاہ ہمنے کر لی

کدھر جایئے اور کہاں بیٹھیے بہلتا نہیں دل جہاں بیٹھیے

کب درد جگر مجکو بیتاب نہیں کرتا کب ہوک کلیجہ سے ہر بار نہیں اٹھتا

میں ہوں وہ قدح کش کہ جسے پیر مغاں نے ہر حلقۂ رندان سے آشام کیا ہے
صاحب نظراں ہر وہ کہ خورشید کی مانند اس شوخ نے دیدار کو یکسر عام کیا ہے
اے مصحفی کل قافلہ یاروں کا ہے راہی کچھ تو نے بھی چلنے کا سر انجام کیا ہے

تم شب مجھے دیتے ہوئے گالی آگئے ہو میں بھی کسی دن تم سے سمجھ لونگا بھلا جی

کس ناز کا آنا ہے کس مہر کا جانا ہے ، صدقے ترے آنے کے قربان ترے جانے کے

کوئی اے مصحفی اس سے یہ کہدے دعا دیتا تجھے اٹھ گیا ہے

تل سے آرزو تھی کئی زخم کی ہمیں   پر ہم تو کھا کے ایک ہی تلوار رہ گئے

یار کا تمہارے کل دم الٹ گیا تھا   کہتے ہیں آج اسپر پھر شب ہی کڑی ہے

گ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے   کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

بولو کی چھڑی جسکے ہاتھوں سے نہ اٹھتی تھی   اب نام خدا اس نے تلوار سنبھالی ہے

فہم کے ساتھ اگر ہو زاہد   بت پرستی بھی مزا رکھتی ہے

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے   دیکھو تو تہِ نقاب کیا ہے
سینے میں جو دل نہیں ٹھہرتا   یارب اسے اضطراب کیا ہے

لوں نے خون تھوکا، غنچوں کے پھٹ گئے دل
کیسا ستم کیا ہے بلبل صدا نے تیری

رے درد سے آگاہ یوں نہ ہوگا کبھی   الٰہی چوٹ کسی دن ترے بھی دلکو لگے

روک لو ہاتھ آپ یہ بسمل کام اپنا تمام کرتا ہے!
ابھی اک زخم اور بھی قاتل تیغ کو کیوں نیام کرتا ہے

ہم جانتے ہیں کوچۂ جاناں کا مرتبہ مسجود خلق ہے یہ عجب سرزمین ہے

جاؤں بے تقریب کیونکر اس کے پاس کچھ تو ملنے کا بہانا چاہیئے

جھپکی نہ جھپکی ذرا آنکھ میری یہ شب مجکو اختر شماری میں گزری

عاشق سے اپنے قطع مروت نہ کیجئے یہ بھی نہ کیجئے، جو محبت نہ کیجئے

کچھ خوب نہیں یہ خودنمائی ہاں اے بت شوخ ڈر خدا سے

مدت سے دل اضطراب میں ہے! جی ہے سو جدا عذاب میں ہے

جبکہ پہلو سے یار اٹھتا ہے! درد بے اختیار اٹھتا ہے

کرتا ہے وضو شیخ لب حوض پہ بیٹھا ایسے میں تماشا ہو اگر پاؤں پھسل جائے

انتخاب کلام ذوق

ذوق نے، اپنی زندگی میں، غالب کو ابھرنے اور چمکنے نہیں دیا اب غالب ذوق کو دبائے بیٹھے ہیں، یہ بات طے شدہ سمجھ لی گئی ہے۔ کہ ذوق کی شاعری یکسر بدذوقی تھی،

لیکن امر واقعہ یہ نہیں ہے، ذوق کے کلام کا اگر نگاہ غور سے مطالعہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ استادانہ پختگی کے ساتھ ساتھ، ذوق کے ہاں جذبات، و خیالات بھی ملتے ہیں، اور وہ ایسے ہیں کہ پڑھنے والا بغیر لطف لئے، بغیر غور کئے، آگے نہیں بڑھ سکتا،

زمانہ ذوق کو مار رہا ہے، لیکن وہ ابتک مرنے سے انکار کر رہے ہیں، ذیل میں کلام ذوق کا منتخب حصہ درج کیا جاتا ہے۔

آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ　　　صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

ہائے پچھتاتا ہوں کیوں اس سے کیا میں نے بگاڑا
کہ جواب پھرتا ہوں اس طرح سے بیتاب بنا

جس انسان کو سگ دنیا نہ پایا　　　فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا

ساقی یہی ہے میکدۂ دہر میں مزہ   دن رات منہ سے مے کی گلابی لگی رہے

وہ نخل ہوں میں سوختۂ صرصر حرماں   جس میں نہ لگے پھول نہ کوئی ثمر آئے

توبہ تو کی ہے عشق سے پر اس کا کیا علاج
بے قصد دل کسی کو اگر چاہنے لگے!
دل کا مقابلہ صفِ مژگاں سے ہو تو یہ   اپنی شکست اوس کی ظفر چاہنے لگے

دیکھیں جو ایک جلوہ ترا شیخ و برہمن   یہ توڑ ڈالے سبحہ وہ زنّار پھینک دے

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں میں اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

پھر جمایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا

اور اسے لیگئے دل کو نکال کے ظالم چپکے — جو مانگا تو کہا آنکھیں نکال کر گیسا
یہ میری نعش پہ ہنگامہ کیوں ہے اے قاتل — اٹھا ہے قصہ یہ بعد انفصال کہ گیسا
ہزار دم ہیں اسے یاد تو نے دیکھا ذوق — گیا وہ غیر کے گھر مجکو ٹال کے گیسا

دل یہ کہتا ہے کہ تو ساتھ نہ پچل مجکو — ورنہ میں جا کے وہاں اور مچل جاؤنگا

جدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہو رقیب جدا — ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا
کیا حبیب کو مجھ سے جدا افلاک نے اگر — نہ کر سکا مرے دل سے غم حبیب جدا

دیکھتا اس مغرور کا گر جاہ و جلال — کبھی فرعون نہ دعوائے خدائی کرتا
نہیں گوش شنوا باغ جہاں میں غافل — ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا
آنکھیں کیئے جاتا ہے کدھر تو، کہ تجھے — ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر — جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا
بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا — لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

رہا ٹیڑھا ہمیشال نیش کژدم　　کبھی کج فہم کو سیدھا　پایا
احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے　　نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا　　کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
کہے کیا ہائے زخم دل ہمارا　　دہن پایا لب گویا نہ پایا
نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل　　ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا

ایک دن بھی ہمکو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امید وصل میں برسوں گوارا ہو گیا

لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھی مگر　　ایک تیرا نہ مجھے دردِ جدائی دیتا
میں وہ ہوں صید کو پھر دام میں پھنستا جا کر　　گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا
منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے　　گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

جھوٹ ہی جانو کلام اس رہزن ایمان کا　　پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا
کاش بے مقدور کو قدرت ہو مگر تھوڑی سی بھی
دیکھ پھر سامان اس فرعون بے سامان کا
دیکھنا اے ذوق ہوں گے آج پھر لاکھوں کے خون

آتا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت   پھر دیکھئے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا   وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا
خدا جانے ہے ذوق جھوٹا کہ   مگر وہ نہیں آشنائی کا جھوٹا

آنا خفا آنا، جانا تو رلا جانا   آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

یوں لائے واں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈھ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

ہے خوش نصیب عشق میں اے بوالہوس وہی   جسکو کہ غم پہ غم ہو الم پہ الم نصیب

معلوم تھا سر انجام محبت   لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نام محبت
ہتی تھی وفا نوحہ خواں نعش پہ میری   سونپا کسے تونے مجھے ناکام محبت

ریش سپید شیخ میں ہے ظلمت قریب   اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمان صبح

مسواک نے بڑھایا ہی زاہد کا اعتبار   ہے یہ بھی اسکی اک شجر گراں کی شاخ

ہو تجھ سے عیادت نہ جو بیمار کی اپنے ‏ لینے کو مرا اس کی اجل جائے تو اچھا
ہاں کچھ تو ہو حاصل ثمرِ نخلِ محبت ‏ یہ سینہ پھپھولوں سے جو پھل جائے تو اچھا
وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر ‏ اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا
ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام ‏ اور پھر کروں آج سے کل جائے تو اچھا
جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یوں ہی ٹل جائے تو اچھا
القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یہاں سے ‏ دل اس کا یہیں گرچہ بہل جائے تو اچھا

ذوقِ بیمار محبت ہے خدا خیر کرے ‏ کہ یہ آزار ہوا جس کو وہ جاں بر نہ ہوا

جلوہ اے قاتل اگر تیرا نہیں حیرت فزا ‏ دیدۂ بسمل نے کیا دیکھا کہ حیراں ہی رہا

وہ کون ہے جو مجھ پہ تأسف نہیں کرتا ‏ پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا
دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے ‏ دنیا کے زر و مال پہ میں تُف نہیں کرتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا ‏ پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
جینا نہیں بھلا نظر اپنا نہیں آتا ‏ گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

وہ مست ہوں کہ رکھتے قدحِ کش تمنّا   بنیادِ میکدہ مری خشتِ لحد سے ہیں
جانِ دادگانِ عشق سے پوچھو رہِ فنا   اس میں جنابِ خضر ابھی نابلد سے ہیں
وہ ایک دم کہ جس میں میسّر ہو وصلِ یار   بہتر سمجھتے ہم اسے عمرِ ابد سے ہیں
دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہرِ داغِ عشق   ہم کرتے ذوقِ عشق کا دعوٰی سند سے ہیں

مستی و نا آشنائی وحشت و بیگانگی   یا تری آنکھوں نے دیکھی یا ترے دیوانے نے

اس گلستانِ جہاں میں کیا گلِ عشرت نہیں   سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

وقتِ پیری شباب کی باتیں   ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
اس کے گھر لیچلا مجھے دیکھو   دلِ خانہ خراب کی باتیں
واعظا چھوڑ کر ذکرِ نعمتِ خلد   کر شراب و کباب کی باتیں
حرف آیا جو آبرو پہ مری   ہیں یہ چشمِ پُر آب کی باتیں
یاد ہیں مہ جبیں کہ بھول گئے   وہ شبِ ماہتاب کی باتیں
تجکو رسوا کریں گی خوب اے دل   تیری یہ اضطراب کی باتیں
جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقان   سن کے ناصح جناب کی باتیں
جامِ مے لب سے تو لگا دیتے   چھوڑ و شرم و حجاب کی باتیں

لے گیا دل کون میرا ذوقؔ کس کا نام لوں ٭ سامنے آجائے تو شاید بتا دوں دیکھ کر

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر ٭ پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

خضر باتیں ہیں کہ ہے چشمۂ حیواں جاں بخش ٭ ہے یہی خاصیت اسکے لب دشنام میں خاص
عشق کا جوش ہے جبتک کہ جوانی کے ہیں دن ٭ یہ مرض کرتا ہے شدت انہیں ایام میں خاص

پا کوبیوں کو مژدہ ہو زنداں کو ہو نوید ٭ پھر ہیں جنوں کی سلسلہ جنبانیوں میں ہم

بے یار روز عید شب غم سے کم نہیں ٭ جام شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں
دیتا ہے دوا چرخ کسے فرصت نشاط ٭ ہو جس کے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں
زیبا ہے رُخ پہ رہ گیا اشک لالہ گوں ٭ اپنی خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں
اس حوروش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا ٭ لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں
اے ذوقؔ کسکو چشم حقارت سے دیکھئے ٭ سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

خوبیاں یوں تو ہیں اس عالم تصویر میں سب ٭ اک مگر ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں
بات تو ہم نے بنا لی تھی وہاں خوب مگر ٭ تھی جو بگڑی ہی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

سرمہ کرے خاک خرابات کو صوفی — سوجھیں اسے پھر لوح و قلم اور زیادہ
کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے بڑے ہیں — اتنا ہی اسے چاہیں ہیں ہم اور زیادہ
بنا ہے مرا شوق جراحت کہ صد افسوس — اس تیغ دو دم میں نہیں دم اور زیادہ
کیوں میں نے کہا تجھ سا خدائی میں نہیں اور — مغرور ہوا اب وہ صنم اور زیادہ

اٹھاؤ عشق کے بیمار سے — کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے
یوں نگہ نکلے ہے چشم یار سے — مست جیسے خانہ خمار سے

کیا اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے — اسے تیر قضا اس کو پر تیر قضا سمجھے
ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے — اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت کو خدا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ پر اپنی ہم سمجھے تو کیا سمجھے — اے سنگدل آرام جان مبتلا سمجھے
یوں ہی نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق ایسی — کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

تنہائی میں دیتا ہوں دلاسے کیا کیا — دل بیتاب کو میں اور دل بیتاب مجھے

نہیں کبھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار — جانب در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے — تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

سنتے ہیں اوسکو چھیڑ چھیڑ کے ہم کس مزے سے عتاب کی باتیں
دیکھ اے دل نہ چھیڑ قصہ زلف کہ ہیں یہ پیچ وتاب کی باتیں

میں کاٹ دوں پہاڑ کو پتھر کو توڑ دوں پر غیر سے بت کافر کو توڑ دوں

گئے ہی جائیو اے دل شکایت تشنہ کامی کی رہی آب اسکی جبتک تیغ میں خنجر میں پیکاں میں

عنقا کی طرح خلق سے حرکت گزیں ہوں میں ہوں اس طرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں

منبروں سے کہو دیکھیں جبین ابرو یار کہ جوہر ایسے کہاں تیغ اصفہانی میں

موت ہی سے کچھ علاج درد سر ہو تو ہو غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو
ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل عشق عمارت گرا کر دنیا سے غارت ہو تو ہو
آج اک بگڑی ہوئی تھی میکدہ میں بن گئے ذوق تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منہ چڑاتے ہو وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

وہ کون سا غم ہے جسے پاتے نہیں دل میں   لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے

تم بھولکر بھی یاد نہیں کرتے، ہے غضب   ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا سکے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑی ہم آپ سے   دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے   نہیں یہ بھی معلوم ہے یا نہیں ہے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی   چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

کہاں ہم اور کہاں غم، غم سے ہم کو کچھ غرض مطلب ؟
مگر اے حضرت عشق آپ نے یہ مہربانی کی !

اے بس نہ آپ کو صوفی جتائیے   معلوم ہے حقیقت ہُو حق جناب کی
نکلے ہو میکدہ سے ابھی منہ چھپا کے تم   دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

نہ بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ   ہے برا وہ ہی کہ جو تجکو برا جانتا ہے

سرمایہ امید ہے کیا پاس ہمارے   اک آہ کبھی سینے میں سو نا امید اثر سے
اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا   بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

خوب رو کا شکایتوں سے مجھے   تو نے مارا عنایتوں سے مجھے!
کہتے کیا کیا ہیں دیکھ تو اغیار   یار تیری حمایتوں سے مجھے

آنکھ اس پُر جفا سے لڑتی ہے   جان کشتیٔ قضا سے لڑتی ہے

اے ذوق جانتا ہے وہ ہمدرد میرا درد   دل جس کا پارہ پارہ جگر پاش پاش ہے

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے   بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش   دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

اے شوخ تری چشم غضبناک کے ہوتے   ہم جا ہیں قضا سے اگر امداد غضب ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب   ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

"چمن بے نظیر"

اردو کی ایک بہت پرانی اور نایاب کتاب "چمن بے نظیر" عرصہ ہوا نظر سے گزر رہی تھی، کتاب کے مصنف کا نام "محمد ابراہیم بن شہاب الدین" ہے کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں فارسی کا منتخب کلام ہے، دوسرے حصہ میں اردو کا، جس میں میر، غالب، جرأت، سوز، مومن درد، انشا، سودا، مصحفی، ذوق، نظیر اکبرآبادی، صہبا، نسیم، اور بہادر شاہ ظفر جیسے یگانۂ روزگار استادوں کے کلام کا انتخاب درج ہے،

میں نے اس چمن بے نظیر سے، ایک ننھا سا گلزار الگ بنایا ہے جن کی رسائی، "چمن بے نظیر" تک نہیں ہو سکتی، وہ یقیناً اسے بھی بہت کچھ سمجھیں گے:۔

خواجہ میر درد

ل عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا — پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا
ت مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور — شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے   کیوں برا کہنے سے تو اس کے برا مانتا ہے

ہم اور غیر اگی دونوں بہم ہوں گے   ہم ہونگے وہ نہ ہونگے، وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے   یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا !   ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے   جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

تھا جبکہ جوان، تھا جوان بدمست   جب پیر ہوا پیرِ خرابات ہوا

نکل اس کی زلفوں کے کوچہ سے آ دل   تو پڑھتا قم اللیل الا قلیلا
کہستان میں مار دل گر آہ کا دم   فکانت جبالا کثیبا مہیلا
نظیر اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ   فقل حسبی اللہ نعم الوکیلا

درد

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا   خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
ف کہتے ہیں ہوا تاراج گلزار جہاں   آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
و گیا مہماں سرائے کثرت موہوم آہ   وہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
بول جا، خوش رہ عبث وہ سابقے مت یاد کر   درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

میر

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا   دم کے جانے کا نہایت غم رہا
جامۂ احرام زاہد پر نہ جا   تھا حرم میں لیک نامحرم رہا
دیکھ میرا رونا اس نے ہنس دیا   برق چمکی ابر باراں تھم رہا
صبح گذری شام ہونے آئی میر   تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

ایضاً

ٖرا ہیں سیل اشک مرا جا بجا پھرا   مجنوں بھی اس کی موج میں مدت بہا پھرا

محتسب آج ترے ہاتھوں سے میخانہ میں ۔۔۔ دل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چور نہ تھا
درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا ۔۔۔ اسکو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

مومن خاں

نہ جاؤنگا کبھو جنت کو میں نہ جاؤنگا ۔۔۔ اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کی وقت ۔۔۔ دعائے وصل نہ کی وقت تھا عصر کا سا
خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر ۔۔۔ نشانِ پا نظر آتا ہے خامہ بر کا سا
دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہے ۔۔۔ محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

میر

چمن میں گل نے جو کل دعوئی جمال کیا ۔۔۔ جمالِ یار نے منہ خوب اس کا لال کیا
رہی تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی ۔۔۔ سو اس کی تیغ نے جھگڑا ہی انفصال کیا
لگا نہ دل کو کہیں کیا نہیں سنا تونے ۔۔۔ جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

نظیر اکبر آبادی

ملا آج مجکو وہ چنچل چھبیلا ۔۔۔ ہوا رنگ سنکر رقیبوں کا نیلا
کیا جس نے مجھ سے عداوت کا پنجہ ۔۔۔ سنلقی علیہم عذاباً ثقیلا

یہ چنچلاہٹ، یہ جھنجلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سُدھ بُدھ
جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا نہ بند باندھا کبھو قبا کا

گلے لپٹنے میں یہ شتابی، کہ مثل بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا چمک کر، کہیں جو لپکا جو جا چھپا کا

نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا سنے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے تو غیر کیا پھر نا آشنا کا

نظیرؔ ہٹ جا، پرے سرک جا، بدل کے صورت چھپا لے منہ کو
جو دیکھ لیوے گا وہ ستمگر تو یار ہوگا ابھی جھگڑا کا۔

سوزؔ

محبت کو دام بلا جانتا تھا | پھنسا میں تو اے دل یہ کیا جانتا تھا
چلا مجھسے تو کبھی جتا کر کھلا دل | تجھے میں بڑا آشنا جانتا تھا
دغا کھائی آخر، دغا کھائی آخر | میں کیا جانتا تھا، میں کیا جانتا تھا

نظیرؔ

ہوئی صبح جب گھر سے وہ یار نکلا | کہا خلق نے رشک گلزار نکلا
عجب پھیر قسمت کا ہے میری یارو | جسے یار سمجھا وہ اغیار نکلا

ٹک بھی نہ مڑ کے میری طرف تو نے کی نگاہ — یک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا
زیر و حرم میں کیونکر قدم رکھ سکیگا میر — ادھر تو اس سے بت پھرے اودھر خدا پھرا

سیّد انشا

اس سے خلوت کی ٹھہر جاتی تو ہیں اللہ ہے — واسطے دو دن کے عرش کبریائی مانگتا

نظیر

نظر پڑا اک بت پری وش، نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کا، پہ قہر آفت غضب خدا کا
جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی جو باتیں سنیئے تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے جو نام لیجئے کبھی وفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت، کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسیکو ٹھوکر، کسیکو جھڑکی، کسیکو گالی نپٹ لڑاکا

یہ راہ چلنے میں اچپلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا کہاں کا نیچا، خیال کس کو قدم کی جا کا

لڑاوے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
نظر جو نیچی کرے تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں — کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا
نہ میری سنے وہ نہ میں ناصحوں کی — نہیں مانتا کوئی کہنا کسی کا
جو پھر جائے اس بیوفا سے تو جانوں — کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا
وہ کرتے ہیں بیباک عاشق کشی یوں — نہیں کوئی دنیا میں گویا کسی کا

ظفر

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا! — کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
مزہ رکھتا ہے زخم خنجرِ عشق! — کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر — وہاں تک مجکو پہونچایا تو ہوتا
کیا کس جرم پر تو نے مجھے قتل — ذرا تو دل میں شرمایا تو ہوتا
کیا جیسا مریضِ عشق مجھ کو — عیادت کو کبھی آیا تو ہوتا

درد

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنستے میں رو دیا ہو گا
اس نے قصداً بھی میری باتوں کو — نہ سنا ہوگا گر سنا ہو گا
دیکھئے غم سے اب کی جی میرا — نہ بچے گا، بچے گا کیا ہو گا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم — ک[illegible] ہوگا کہ رہ گیا ہو گا

صراحی سے ساقی نے مے جو پلائی　　نظیرؔ اس قدر ہو کے سرشار نکلا

نسیمؔ

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا　　اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا
ہمنے تو آپ اپنا گریباں کیا ہی چاک　　آپی سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا
اپنی تو زندگی میاں مثلِ حباب ہے　　گو خضر لاکھ برس جیا پھر کسی کو کیا
دنیا میں آ کے ہمنے بھلا یا بُرا نسیمؔ　　جو کچھ کیا سو ہم نے کیا پھر کسی کو کیا

سوزؔ

قضارا وہ قاتل اِدھر آن نکلا　　تو لینے کو اس کے مرا جان نکلا
کھڑا نعش پر ہو کے بولا کہ ہے ہے　　یہ کشتہ تو کچھ جان پہچان نکلا

سوداؔ

کہتا ہے نگہ سے یہ ترا گوشۂ ابرو　　دیکھے جو کوئی خون گرفتہ تو لگا لا
مانگا جو میں دل کو تو کہا بس یہی اک دل؟　　جتنے ہی تو چاہے مرے کوچے سے اٹھا لا

مومنؔ

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا　　نہ ہے تو کسی کا، نہ ہوگا کبھی کا

اتنا نہ بہکے پھریئے تشریف لائیے بھی حضرت سلامت، الشاہی آپکا یہ چیلا

سوز

یہ تیرا عشق کب کا آشنا تھا کہاں کا جان کو میری دہرا تھا
وہ ساعت کونسی تھی یا الٰہی کہ جس ساعت دوچار اس سے ہوا تھا
میں کاش اسوقت آنکھیں موند لیتا کہ میرا دیکھنا مجھ پر بلا تھا
میں اپنے ہاتھ اپنے دل کو کھویا خداوندا میں کیوں عاشق ہوا تھا
وہ مجکو ذبح کرتا تھا خوشی سے میں اس کی تیز دستی تک رہا تھا
نہ تھا اس وقت جز اللہ کوئی ولے یہ سوز پہلو میں کھڑا تھا

مومن

میں نے تمکو دل دیا تمنے مجھے رسوا کیا میں نے تم سے کیا کیا اور تمنے مجھ سو کیا کیا
روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہی مر گئے ابتو خوش ہو بیوفا تیرا ہی لے کہنا کیا
غرض ایماں کی ضد اس غارت دیں کو پڑی تجکو اے مومن خدا سمجھے یہ تونے کیا کیا

میر

دوست کوئی مجھہ سا رسوا نہ ہوا ہوگا دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا

حال مجھ غمزدہ کا جس جس نے   جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا!
قتل سے میرے وہ جو باز رہا   کسی بدخواہ نے کہا ہوگا!
دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا   آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

میرؔ

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا   چھوڑا وفا کو اس نے مروّت کو کیا ہوا
امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چکے   آتے ہی آتے میرؔ قیامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف   اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا

جرأتؔ

کسی نے جو پوچھا خفا کس سے ہو   اشارے سے مجھ کو بتانے لگا
دیا اس کے در پر جو جرأت نے جی   تو الحمد للہ ٹھکانے لگا

سوداؔ

دوستو سنتے ہو، سوداؔ کا خدا حافظ ہے   عشق کے ہاتھ سے رہتا ہے یہ رنجور سدا

سید انشاؔ

فرما دیں آپ جو کچھ، تھا وہی [illegible]   اے میرے پیر و مرشد ہاں بادشاہ دانا

گیا قتل اور جان بخشی بھی کی   حسن اس نے احسان دوبارا کیا

نظیرؔ

کس طرح بنے اپسے سے انصاف تو ہے شرط
یہ وضع مری دیکھو وہ دیکھو چلن اپنا

سوداؔ

تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا   لذت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا
سوداؔ سے یہ میں پوچھا دل میں بھی کچھ گذری   وہ کر کے بیاں اپنی روداد بہت رویا

دردؔ

اے دردؔ جس کی آنکھ کھلی اس جہاں میں   شبنم کی طرح جان کو اپنی وہ رو گیا

سوداؔ

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر   لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا
سوداؔ نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور   جلوہ ہر ایک ذرے میں ہے آفتاب کا

ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں　　ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہو گا

ظفر

دیکھ مجکو بتِ بے پیر نے منہ پھیر لیا　　آج مجھہ سے مری تقدیر نے منہ پھیر لیا
عقل نے ہوش نے تقدیر نے منہ پھیر لیا　　بس مری آہ سے تاثیر نے منہ پھیر لیا
میں تو تڑپا بھی دمِ قتل نہیں اے قاتل　　کیا سبب جو تری شمشیر نے منہ پھیر لیا

انشا

اچھا جو خفا ہمسے ہو تم اے صنم اچھا　　لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا
ہم معتکفِ خلوتِ بتخانہ ہیں اے شیخ　　جاتا ہو تو جا تو بھی طوافِ حرم اچھا
کہہ کر گئے آتا ہوں کوئی دم میں، میں تم پاس
پھر دے چلے کل کی سی طرح مجھہ کو دم اچھا
اس ہستیِ موہوم سے میں تنگ ہوں انشا
واللہ کہ اس سے بمراتب عدم اچھا

حسن

قمارِ محبت میں بازی سدا　　وہ جیتا گیا اور میں ہار گیا

ہندو ہیں بت پرست مسلمان خدا پرست — ہم پوجتے ہیں اسکو جو ہو آشنا پرست
سودا کے شخص کے تئیں آزردہ کیجئے — اے خود پرست حیف نہیں تو وفا پرست

میرؔ

کیا ازل میں ملا نہ لوگوں کو — تھی ہماری بھی میرؔ کیا قسمت

ایضاً

تو کن نیندوں پڑا سوتا تھا دروازے کو مونڈے شب
میں چوکھٹ پر تری کرتا رہا سر کو ٹیک کھٹ کھٹ

تری ہجراں کی بیماری میں میرؔ ناتواں کو شب
ہوا ہے خوب سونا آہ اِس کروٹ سے اُس کروٹ

ایضاً

سر بسر مت جہاں سے جا غافل — یاؤں تیرا جہاں پڑے ٹک سوچ
پھیل اتنا پڑا ہے یاں کیوں تو — یار اگلے گئے کہاں ٹک سوچ
ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن — یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ
گل ورنگ و بہار پردے ہیں — ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ
فائدہ سر جھکے سے پیری میں میرؔ!
پیری سے آگے اے جواں ٹک سوچ

آتش

ہر حال میں ہے اپنے مرا یار دلفریب　　گفتار دل فریب ہے رفتار دل فریب
مژگان چشم یار کی تعریف کیا کروں　　جانکاہ، جاں خراش، دل آزار، دلفریب

سودا

اسلام چھوڑ ہم نے کیا کفر اختیار　　تو بھی وہ بت نہ رام ہوا اے خدا عجب
کی سیر ملک کی سودا نے بھی ولے　　اے شیخ میکدہ کی ہے آب و ہوا عجب

ایضاً

دوست ہر چند ہمارا ہی مؤذن لیکن　　دشمن خواب ہے جوں مرغ سحر آخر شب
انتہا عیش جہاں کا جو تو دیکھا چاہی　　بزم مستاں پہ نظر غور سے کر آخر شب

میر

کیسی مسجد، کیسا میخانہ، کہاں کے شیخ و شاب　　ایک گردش میں تری چشم سیہ کی سب خراب
کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میر　　دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہی سراب

ظفر

دل سے ہر راہ اگر دل کو تو ہو جائیگی　　بے خبر تجکو محبت کی خبر آپ سے آپ

کیا کہوں دل کا کسی سے قصۂ آوارگی　　کوئی بھی بے ربط ہوتی ہے کہانی اتف
درد تو کرتا ہے معنی کے تئیں صورت پذیر　　دسترس رکھتے تھے کب بہزاد و مانی اسقد

میر

اپنے مزاج میں بھی ہے میر ضد نہایت　　پھر مر ہی کے اٹھیں گے بیٹھیں گے جو ہم اٹھ ک

سودا

پوجوں ہوں میں جس بت کو خدا کا ہی تراشا　　آذر نہیں لایا وہ مرے واسطے گھڑ کر

انشا

اے دل سمجھ کے اسکی نہ زلف دوتا کو چھیڑ　　کمبخت کیا کرے ہے کالی بلا کو چھیڑ
انشا جو ہونی ہوئے سو ہو دل کہے ہے یوں　　تا چند ضبط آج تو اس دلربا کو چھیڑ

سودا

تیری دوری سے عجب حال ہے اس سودا کا　　میں تو دیکھا نہیں ایسا کوئی بیمار ہنوز

غالب

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تاباںؔ

تاباںؔ بتا کہ یار کو کیونکر منائیے　　ابھی ہوا ہے مجھ سے وہ بیزار بے طرح

سوداؔ

نہ جائیو کبھی اے شیخ بزم رنداں میں　　کہ تو وقار طلب ان کی ہے زباں گستاخ

میرؔ

سب پریشاں دلی میں شب گذری　　بال اس کے بکھر گئے شاید
ہیں مکان و سرا و جا خالی　　یار سب کوچ کر گئے شاید
آنکھ آئینہ رو چھپاتے ہیں　　دل کو لیکر مکر گئے شاید
لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا　　زخم اب دل کے بھر گئے شاید
شور بازار سے نہیں اٹھتا　　رات کو میرؔ مر گئے شاید

دردؔ

اسقدر تھا یا کرم، یا ظلم رانی اسقدر　　مہربانی اسقدر نامہربانی اسقدر
جان کو آنے دے لب تک نزع میں کبتک ہو　　دشمنی مجھ سے نہ کر اے ناتوانی اسقدر

انشا

شفا اب اس نے تصدق سے اپنے دی مجکو ہزار شکر کہ سب دفع ہوگئے امراض
دگر نہ دیکھ کے انشا کی نبض ہوتا تھا غریق بحر تحیر مسیح سا بنا نیا ع

ایضاً

اے میر حاج چپ ہو خدا کا بھی نام لے مجھ سے ہو ترک صحبت پیر مغاں غل

سودا

فضلِ حق جسکی طرف ہو تو اسے بخشے ہے دور ساغر کی طرح گردش ایام نشا
دل جنہوں کا ہے اسیری کے مزے سے آگاہ ہے قفس بیچ انہیں عیش و نہ دام نشا

ایضاً

ڈروں ہوں نہ کریں نذر تیری داڑھی کا تبرکات میں داخل ہر ایک سو واعظ

انشا

بیٹھا ہے آج مجلس رندان میں شیخ یوں طوطی کے پاس جیسے کوئی ہم قفس ہو زاغ

سودا

رنگ سے چہرے کے رسوا ہو وہی بیمار عشق عشق کو یار و چھپا سکتا نہیں انکار عشق

تو روز آرائشِ خمِ کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی — ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد — ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے — ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

انشاؔ

صدقے اس ناز کے انشا سے یہ کہنا چل بے

چوٹ لگتی ہے، ہوا درد، مرے ہونٹ نہ چوس

سوداؔ

دیں شیخ و برہمن نے کیا یار فراموش — یہ سبحہ فراموش وہ زنار فراموش

ایضاً

کس کی صحبت میں تو ہوا اوباش — آفریں میرے سن چلے شاباش

میرؔ

اب کہاں وہ مودتِ قلبی — ہووے ظاہر میں یوں ہزار اخلاص

میرؔ

تظلم کے کھینچے الم پر الم ترحم کے مت کر ستم پر ستم
کئی بار آنا ادہر تکلف سے عطا پر عطا ہے کرم پر کرم
خطرناک تھی وادیِ عشق میرؔ گئے اوسیہ کبھی ہم قدم پر قدم

میرؔ

رات گزری ہے سب تڑپتے میرؔ آنکھ لگ جائے ٹک تو سو لو تم

دردؔ

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر اے دردؔ آ کے بیعت دست سبو کریں

سوداؔ

غرض کفر سے کچھہ نہ دیں سے ہی مطلب تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں !
نوشتے کو میرے مٹاتے ہیں رو رو ملائک جو لوح و قلم دیکھتے ہیں
خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے
کہ جو دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

مومن

ٹھانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسیکو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

میر

یہی جانا کہ کچھہ نہ جانا ہائے — سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

سودا

نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام — مدعا ہمکو تو ساقی سے ہے جام سے کام

نظیر

دور سے آئے تھے ساقی سنکے میخانے کو ہم — بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم
مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں — دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم
کسیدن نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بیخبر — کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم
باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

درؔد

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

سوؔدا

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں
دل لیکے بولتا ہے جواب تو یہ بولیاں
حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دی پھر کبھو
آنکھیں جس آدمی نے ترے منہ پہ کھولیاں
سوؔدا کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلفِ یار
شانے نے بیچ پڑ کے گرہ اس کی کھولیاں

نظیؔر

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی اے گلِ اندام کہیں
مے کہیں، شیشہ کہیں، ساقی کہیں جام کہیں
دل کی بے تابی نہیں ٹھہرنے دیتی ہے مجھے!

انشا

شیخی اتنی نہ کرائے شیخ کہ رندان جہاں   اونگلیوں پر تجھے چاہیں تو نچا سکتے ہیں
تو گروہِ فقرا کو نہ سمجھہ بے جبروت   ذات مولائی ہیں یہ لوگ سما سکتے ہیں

مومن

ہوگئی گھر میں خبر ہے منع وان جانا ہمیں   وہ بھی ہو رسوا خدا جسنے کیا رسوا ہمیں
دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں   کیا کہیں عاشق ہوے یا ہو گیا سودا ہمیں
یہ ستم صیاد کا کیا التفات آمیز تھا   بند کرنے کو قفس میں دام سے چھوڑا ہمیں

میر

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
صنم کی زلف میں کوچہ ہے سربستہ ہر اک مو پر
نہ دیکھی ہوں گی، تو نے خضر یہ ظلمات میں گلیاں
روانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہکر!
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

کون کہتا ہے بولو، مت بولو ہاتھ سے میر ایک جام تو لو
انہیں باتوں پہ لوٹتا ہوں میں گالی پھر دیجیے میرا نام تو لو
اک نگہ پر بکے ہے انشا آج مفت میں مول اک غلام تو لو

سوز

مری جان جاتی ہے یارو سنبھالو کلیجے میں کانٹا لگا ہے نکالو !
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو !
کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے اوسے جان کنی سے تو جا کر نکالو

انشا

تا درِ کوئے صنم یا تو مجھے پہنچا دو یا ابھی دل کو مرے پاس سے اسکو لا دو
رسم و آئین اسیری کی مجھے یاد نہیں نو گرفتار ہوں اے ہم نفسو سکھلا دو

میر

اب دھواں یوں جگر سے اٹھتا ہے جیسے پُر پیچ کوئی کاکل ہو ! !
نہ تو طالع نہ جذب پھر دل کو کس بھروسے پہ ٹک تامل ہو ! !

انشا

لڑنے کا تو مزا تب ہے کہو اور سنو بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

میرؔ

عام حکمِ شراب کرتا ہوں   محتسب کو کباب کرتا ہوں
ٹک تو رہ اے بنائے ہستی تو   تجھ کو کیا ہی خراب کرتا ہوں
جی میں پھرتا ہے میرؔ وہ میرے   جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

جرأت

ہم تو کہتے تھے نہ عاشق ہو اب اتنا تو بتاؤ
جا کے ہم روتے ہیں پہروں پسِ دیوار کہ تو؟

وحشتِ عشق بری ہوتی ہے دیکھا ناداں
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو؟

میرؔ

ضعف بہت ہے میرؔ تمہیں، کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو ٹک اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

انشا

مومن

ہ چلا جان چلی، دونوں یہاں کھسکے اوسکو تھاموں کہ اسے! پاؤں پڑوں کس کس کے

درد

ض وسما کہاں تری وسعت کو پاسکے میرا ہی دل ہے یہ کہ جہاں تو سما سکے
ں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے
صد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے اوس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

انشا

ہے اس پری کی سحر، چتون ایک آفت ہے
معاذ اللہ جو دیکھے اس طرف یہ کس کی طاقت ہے

مومن

اس بزم میں طوفان اٹھا کر اٹھے یاں تلک روئے کہ اوسکو بھی رلا کے اٹھے
ے گرمیٔ محبت کہ ترے سوختہ جاں جس جگہ بیٹھ گئے، آگ لگا کے اٹھے

تم کہوگے جسے کچھ کیوں نہ کہیگا تم کو   چھوڑ دیویگا بھلا، دیکھ تو لو اور سنو

مومنؔ

اولٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومنؔ چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

دردؔ

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہو تو آزردہ خاطر ہو تو رنجیدہ

ہم گلشن دوراں میں از خفتگی طالع
سرسبز تو ہوں لیکن جوں سبزہ خوابیدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ایدہر کو نگہ کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ

میرؔ

خوش ہیں دیوانگی میرؔ سے سب   کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

صبا

مرتے دم اے بے وفا دیکھا تجھے   اک نظر دیکھا تو کیا دیکھا تو تجھے

سودا

مجلس میں چھو کروں کی جو حجرے سے شیخ جی
آئے تو پھر خدا نے کہا مسخرے ہوئے

وہ شخص بارِ خاطر ہرگز نہ ہو کسی کا　　جس کا ندیم ہووے اسکی نظر کو پرکھے

جوہر نہ ہووے جس میں جوہر شناس کب ہے　　جو صاحبِ ہنر ہے وہ ہی ہنر کو پرکھے

میر

کشورِ عشق کو آباد نہ دیکھا ہم نے　　ہر گلی کوچے میں اوجڑے پڑے دیکھے گھر کتنے

جرأت

چونک پڑا سنتے ہی آوازِ یار　　میں بھی سمجھا کہ پکارا مجھے!

سودا

کیا ضد ہے خدا جانئے مجھ ساتھ وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مری ، ایک نظر بھی

نظیر

دارا نہ رہا جم ، نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سیکڑوں آئے چلے گئے!

آدم رہا ، نہ کوئی پیمبر نہیں رہا
وہ بھی اسی زمیں میں سمائے چلے گئے

شعر سودا حدیث قدسی ہے　　چاہیئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

میں کیا کہوں کہ کون ہو سودا بقول درد　　جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر　　اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

فارسی میں محاورہ ہے "دستے دریں کار دارا" یعنی وہ اس کام میں واقفیت اور مہارت رکھتا ہے سودا نے اس محاورے کو اردو میں یوں کھپایا ہے۔

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی میں
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

فارسی کا محاورہ ہے "او ذہن این کار ندارد" اور سودا کہتے ہیں

نہیں ہے بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے
سخن تو دیکھ ہے رنگین ترا چمن مجھ سے

فارسی کا محاورہ ہے "گوش کردن" یعنی سننا سودا کہتے ہیں۔

کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال
یہ سنگ ریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

انتخاب

مجکو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں　　میں جوں نسیم بادہ فروش چمن نہیں
کل جاکے ہمنے میرؔ کے در پر سنا جواب　　مدت ہوئی کہ یاں وہ غریب الوطن نہیں

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے　　دعوےٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سوؔدا کو سنا بولتے یارو　　اللہ رے اللہ رے کیا زور بیاں ہے

فارسی کا ایک شعر ہے

بہار بے سپر جام و یار می گزرد　　نسیم ہمچو خدنگ از کنار میگزرد

سوؔدا کہتے ہیں

بہار بے سپر و جام و یار گزری ہے　　نسیم تیر سی سینہ کے پار گزرے ہے

فارسی کا شعر ہے۔

آلودہ قطرات عرق دیدہ جبیں را　　اختر ز فلک مے نگرد روئے زمیں را

سوؔدا کہتے ہیں۔

آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو　　اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

خان آرزو سمجھ گئے کہ قدسی کا یہ شعر اڑایا ہے۔ فوراً کہا کہ :-

سودا

سودا جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لیگیا   جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لیئے

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں   یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

خدا کرے کہ مرا مجھ سی مہربان نہ پھرے   جہاں پھرے تو پھرے وہ جان جان نہ پھرے

(انشا)

جرأت

یہ وفا کی میں نے تسپر مجھے کہتے بیوفا ہو   مری بندگی سے صاحب ملا خطاب الٹا

فارسی کا محاورہ ہے "خاک برسر کردن" اور سودا کہتے ہیں۔

تو ہی کچھ اپنے سر پہ یاں خاک کر گئی　　شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی

یہ کہہ کر مر گئی بلبل قفس میں!　　نہ ہو بندہ کسی بندہ کے بس میں

اے کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار　　کہیو جو کبھی میر بلاکش ادھر آوے
مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو　　ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

مجھ چشم سے اب شک نہیں آئیگا ناصح　　آوے بھی غم دل سے تو لخت جگر آوے

میر

گلہ میں جس سے کروں تیری بیوفائی کا　　جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا

سودا

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفت دیں کو　　خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

میر

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے　　ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

تجھ کو پاس وضع ذرا نہ ہو　　ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا

مرگئے ہم تو مٹ گئے سب رنج　　یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے نہیں　　کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے

ہے ایک درِ پیرِ مغاں تک تو اے ساقی　　ہم بادہ پرستوں کا کہاں اور ٹھکانا

شوقِ مے دل میں لب پہ ہجوِ شراب　　ہم پہ روشن ہیں سب جناب کے رنگ

اندوں پھاڑ کر پلا دی　　واعظ کے نہ چل سکے بہانے

نا ہے انہیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب　　پر کہتے نہیں زلف بنانے میں لگی ہیں

یسے چھپاؤں سوزِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں؟
دل کی تپش کو کیا کروں، سوزِ جگر کو کیا کروں

کار اور ایک جرعۂ صہبا سے بھی انکار　　ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

حسرت کے چند نشتر

ہندوستان کے غزل گو شعرا میں، حسرت موہانی، غزل سرائی کے امام مانے جاتے ہیں، اگر حسرت نہ ہوتے، تو ملک میں غزل کی شاعری ختم ہو چکی ہوتی،

ذیل میں کلام حسرت کے چند نشتر درج کئے جاتے ہیں:۔

ہے ہجر بھی وصال زہے خوبی خیال　　بیٹھے ہیں انجمن میں تری انجمن سے دور

حضور مجھ پہ نہ ضایع کریں عطا اپنی　　کہ مستحق ہوں جفا ہائے التزامی کا

نگاہ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے
تغافل ہائے پیدا میں نوازش ہائے پنہاں میں

مایوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل　　پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

عاشقی میں ہے زیب فرق جنوں　　طرۂ افتخار بدنامی !

ہوتا ہے برا لذت آزار کا لپکا　　مرنا بھی کہیں مجھکو یہ دشوار نہ کر دے

دلِ آرزو شوق کا اظہار نہ کردے
ڈرتا ہے مگر یہ کہیں انکار نہ کردے

گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

بھلا دیتی ہیں سب رنج والم حیرانیاں میری
تری تمکین بیجد کی قسم ایسا کبھی ہوتا ہے

مایوس نہ یوں ہوتے تو دور اگر ہوتا
ہم کچھ نہ تجھے کہتے مجبور اگر ہوتا

مجھ کو اتنا ہی تم سے انس بڑھا
جس قدر تم کو اجتناب ہوا

دل نے چھوڑا ہے نہ چھوڑے ترے ملنے کا خیال
بارہا دیکھ لیا ہم نے ملامت کر کے

پھر بھی ہے تمکو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو　　مجھ کو دیکھو مرے مرنے کی تمنا دیکھو

مر مٹا آپ پہ کون آپنے یہ بھی نہ سنا　　آپ کی جان کے دور آپ سے شکوا ہی مجھے

پرسشِ حال پہ ہی خاطرِ جاناں مائل　　جرأتِ کوششِ اظہار کہاں سے لاؤں

حُسن بے پردا کو خود بین و خود آرا کردیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کردیا

قصۂ شوق کہوں درد کا افسانہ کہوں　　دل ہو قابو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی　　دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر　　ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

رنج راحت ہو سکونِ غمِ ہجراں کی قسم　　یادِ جاناں کی قسم جلوۂ جاناں کی قسم
شوق سے جو کٹے جائیں وہ اربابِ وفا　　خوش بہرحال ہیں عیشِ غمِ پنہاں کی قسم

مجبورِ وفا کرکے محرومِ وفا کرنا　　بھولیں گی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری

ہوئی، جس شخص کو بگاڑنے کے لئے مصاحبوں اور ندیموں کا جگھٹ ہو، خو
باشوں اور خوشامدیوں کا اجتماع ہو، بڑے سے بڑے نقادِ فن اور ماہرِ زبان
کی زبان بھی جس کے حضور میں گنگ ہو جاتی ہو، تعریف و توصیف مدح و
ستائش اور "عمرت دراز باد" کے نعرے جس کے کانوں میں ہر وقت گونجتے
ہوں، اگر اسے اپنے متعلق "غلط فہمی" نہ ہو تو کس کو ہو؟ وہ اپنے ہر عیب کو
ہنر نہ سمجھے تو کون سمجھے؟ اگر اس پر بھی کسی شخص کو عیب و ہنر میں تمیز باقی رہے
تو اس سے بڑھ کر عاقل و فرزانہ کون ہے؟

ناظم اگرچہ ایک فرمانروا تھے، اظہارِ خیال میں بے باک تھے، نہ ان
کی کوئی گرفت کر سکتا تھا، نہ صحیح مشورہ دے سکتا تھا، لیکن بااینہمہ انہوں
نے وہ حسنِ ذوق اور کمالِ فن پیدا کیا کہ ان کا کلام صاحبِ ذوقِ سلیم
کو وجد و کیف میں سرشار کر دیتا ہے۔

ان کا اشہبِ قلم اصنافِ شاعری کے ہر میدان پر یلغار کرتا ہے، لیکن
تغزل ان کا حصہ ہے، اس کی آپ جتنی تحلیل کر سکتے ہوں کر لیجئے، پھر ناظم
کو اس کسوٹی پر کسیئے، تو آپ اسے اپنے معیار سے زیادہ ہی پائیں گے،
بالخصوص محاکات اور حسنِ بیان میں تو اسے ید طولیٰ حاصل ہے، وہ
جو کچھ کہتا ہے، اس انداز سے کہتا ہے، کہ گویا سب کچھ ہمارے سامنے
ہو رہا ہے، وہ جب درد و الم کا اظہار کرتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے

رام پور کا ایک ملک الشعرا

ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی ہستی ایک ہی وقت میں صاحب افسر و دیہیم بھی ہو اور صاحب قرطاس و قلم بھی، انتظام مملکت اور کشور آرائی کے مراحل بھی در پیش ہوں اور افواج معانی کی سپہداری بھی ہو رہی ہو، دنیا کی دلفریبیاں "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت دے رہی ہوں اور فقر و قناعت کے بوریئے پر لطف درویشی بھی حاصل کیا جا رہا ہو، ایک طرف نگار ہائے شوخ و شنگ "دشمن ایمان و آگہی" اور "رہزن تمکین و ہوش" ہوں اور دوسری طرف چشم بینا "جامۂ ہستی کی آستینوں" کو نمایاں کر کے بساط عیش برہم کر دیتی ہو، کسی وقت مطرب و ساقی، نغمہ و مے، چنگ و رباب کیف سرور میں محو کر دیں، تو کبھی کبھی حقیقی جذبات کی تراوش وہ درد بھی پیدا کر دے کہ "نغمۂ شادی" "نوحۂ غم" میں بدل جائے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم فرماں روائے "دار السرور رام پور" انہی مستثنیات میں تھے۔ وہ صاحب تخت و اورنگ بھی تھے، اور ایک جادو نگار شاعر بھی، وہ مالک چتر شاہی بھی تھے اور اقلیم سخن کے تاجدار بھی، ان کے احوال پر نظر ڈالیئے تو اور حیرت ہوتی ہے کہ ان کے دل میں جذبات کا یہ ترفع، تخیل کی یہ قدرت، انداز بیان کی یہ پاکیزگی پیدا کیونکر

ہوں، لیکن جب رات کی تاریکی مسلط ہوتی ہو تو وہ اپنے دل میں ایک خلش محسوس کرتے ہوں، جب لوگ مصروف خواب ہوتے ہوں، وہ کروٹیں بدلتے ہوں، جب فانوس کی روشنی کاشانۂ سلطانی کو بقعۂ نور بنا دیتی ہو، تو پریم کی "اندھیری نگری" میں یاس و حسرت کے بادل چھا جاتے ہوں، جب شب ماہ کی کرنیں بام و در کو جگمگا دیتی ہوں تو ان کا دل ویران و سنسان رہتا ہو اور اس وقت ہجوم جذبات میں ان کے منہ سے نالۂ موزوں نکلنے لگتا ہو، جو ہر سننے والے کے لئے دعوت درد و اثر ہو، میرے اس خیال کی اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کا کلام دیکھئے تو جس جگہ وہ دل کی بیتی بیان کرتے ہیں، سماں بندھ جاتا ہے، سننے والا یا پڑھنے والا ایک عجب خلش محسوس کرنے لگتا ہے، ورنہ اگر خالی خولی الفاظ ہوتے جیسے

طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

تو آپ لاکھ بار سنتے اور کچھ اثر نہ ہوتا "استادانہ پختگی" "بلند پروازی" اور اسی قبیل کے دو چار الفاظ آپ کے منہ سے یہ سمجھ کر نکل جاتے کہ یہ ناسخ کا مطلع ہے، اس لئے ضرور لاجواب ہوگا، لیکن اگر کوئی ایسا شعر سنئے کہ سنئے اور سر دھنئے تو اسے آپ آورد کیسے کہہ سکتے ہیں؟

عام عاشقانہ مضامین

ناظم کا کلام بھی ان جذبات و خیالات سے معرّیٰ نہیں ہے۔ جو

کہ ہمارے دل کی ترجمانی ہو رہی ہے، وہ جب کسی کی بے اعتنائیوں اور تنک مزاجیوں کا تذکرہ کرتا ہے، تو اس حسرت و تاسف سے کہ اگر پتھر کا دل ہو تو وہ بھی موم ہو جائے، اور چونکہ وہ ایک باعظمت و جبروت شخصیت کا مالک ہے صاحب اقتدار و صاحب اختیار ہے، حرم سرا بھی رکھتا ہے، اور محلات بھی اس لئے کبھی کبھی شاہانہ تمکنت کا اظہار بھی زبان شعر سے ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، یہ خیال کیا جا سکتا ہے، کہ جب ناظم ایک عاشق ناکام نہیں تھے، فراق زدہ نہیں تھے، جور فلک کے شاکی نہیں تھے، "کسی" کے شکوہ سنج جور و ستم نہیں تھے، تو ان کے ہاں اس درد و اثر، سوز و گداز اور بے تابی و بے قراری کے کیا معنی! انہیں تو امراء القیس کی طرح "شب وصل" کا نقشہ کھینچنا چاہیئے تھا، اپنی لغزش رندانہ کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرنی چاہیئے تھیں، لیکن یہ عنصر تو کم ہے، ہے تو درد و غم کی داستاں، "بے قراری ہائے فرقت کا بیاں"

اسے اگر آورد نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے!

یہ خیال صحیح نہیں، یہ کیا ضرور ہے، کہ ناظم اگر رام پور کے فرمانروا تھے تو کشور دل بھی تسخیر کر چکے تھے، ہو سکتا ہے کہ دل پر ایسی چوٹ لگی ہو جس نے ان سے نشاط و مسرت کے جذبات چھین لئے ہوں، دربار میں، حرم سرا میں مصاحبوں کے مجمع میں، کاروبار سلطنت میں وہ اپنا درد نہاں بھول جاتے

آنے کو کہا ہے اس نے ناظم کچھ تم ہی کو اعتبار ہو گا!

سنا بھی تم نے تو کس سے سنا خدا کی پناہ کہا ہے غیر نے جو کچھ وہ میرا حال نہیں

اک جہاں تشنۂ انداز خود آرائی ہے آپ جو چاہیں کریں آپکی بن آئی ہے

آگے ہی کا سا طور رہے گیا ابکی بار بھی باندھا ہے تم نے عہد یہ ہی استوار بھی

ملے گی محشر میں داد ہم کو، بندھا ہے یہ اعتقاد ہم کو
ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کریں گے

جلد جم جاتا ہے ہر شخص کا نقشہ کیسا سادہ دل ہے وہ بت آئینہ سیما کیسا

مایوسی لیکن اس رنگ سے قطع نظر کرکے ان کے اصل کلام کا بنظر غائر مطالعہ کیجئے، تو ناظم کی خصوصیات خاصہ آپ کو رفتہ رفتہ متاثر کرتی جائیں گی، درد و اثر، سوز و گداز اور وفا و جفا کے افسانے آپ نے شعرا کی زبان سے اکثر سنے ہوں گے، لیکن ناظم کی آہ جگر گداز بزم انجمن

"قدر مشترک" کے طور پر تقریباً ہر شاعر کے ہاں باختلاف قوافی و ردیف ملے گا، اس ذیل میں ان کے جو اشعار آتے ہیں ان میں کوئی خاص بات اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ موزوں ہیں، ہر شاعر کے ہاں "مزخرفات" کا ایک جزو ضرور ہوتا ہے، فی البدیہہ کہنے سے، فرمائشی اشعار کہنے سے، خواہ مخواہ طبیعت پر زور ڈالکر کہنے سے دیوان تیار ہو رہا ہو اور کوئی ردیف اس وقت تک نہ کہی گئی ہو تو اس کی "خانہ پری" کرنے سے ایک مجموعہ تیار ہو جاتا ہے جسے حذف ہی کر دیا جائے تو اچھا ہے، لیکن اسے کیا کیجئے، ہمارے ہاں کا یہ دستور ہو گیا ہے، کہ موزوں صورت میں جو کچھ، جس موقع پر بھی زبان سے نکل جائے، اسے "زیب کلیات" ضرور بنایا جائے، غالب بیچارے نے شارع عام سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی تھی، کہ اپنے اشعار کا انتخاب شایع کرایا، باقی غیر ضروری اشعار حذف کر دیئے لیکن وہ حذف شدہ اشعار اتنے سخت جان نکلے کہ ہنگامۂ غدر میں بھی صحیح سلامت رہے، بالآخر نواب صاحب بھوپال کے کتب خانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم اس "مجموعۂ بے رنگ" کو بھی نکال ہی لائے اور ستم یہ کیا کہ شایع بھی کر دیا،

حاصل کلام یہ کہ ناظم کے ہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں، جو عام عاشقانہ شاعری کی ذیل میں آتے ہیں،

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے، رنجوری عشق کا کتنا باکمال مرقع پیش کیا ہے

قاصد شکستہ پا و کبوتر شکستہ بال   جانے کا خط کے واں کوئی عنوان ہی نہ

دل لاکھ لاکھ سمجھاتا ہے کہ محبوب کی سرد مہری وقتی ہے، اس کی کج ادا

التفات پنہاں کی غماز ہے لیکن

توقع اس سے کیونکر غم گساری کی پڑے ناظم

کبھی بھولے سے بھی جس نے نہ پوچھا ہو کہ "کیونکر ہو

یہ حیات مستعار تو کش مکش اضطراب و اضطرار میں گزر رہی، شاد کامی کا زمانہ ناکامی میں بسر ہوا، اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "وہ"

پوچھنے آئیں گے پر جبکہ مجھے   بات کرنے کی نہ طاقت ہوگی

"وعدۂ یار" شرمندۂ ایفا کب ہوا ہے، لیکن ناظم فریب میں آ گئے محبوب ستمگار نہ اب آتا ہے، نہ جب آتا ہے، آخر بے قرار ہو کے کہتے ہیں،

وہ اپنی ضد کے ہیں پورے نہ آئینگے ہرگز   بس ان کی راہ ہم اے غم گسار دیکھ چکے

ان کا حال زار دیکھ کر ہر شخص تسلی دیتا ہے، لیکن وہ بھی "اس کی" طینت سے واقف ہیں بالکل بجا طور سے جواب دیتے ہیں،

یہ تیری سخن سازیاں ہیں ندیم   کسی پر وہ کیوں رحم کھانے لگے

عرض حال ایک ناکام تمنا حصول مقصد کے لئے ہر امکانی کوشش صرف کر ڈالتا ہے، ناظم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، انہیں بھی

میں صاعقے کا حکم رکھتی ہے۔ اس کا دردِ دل جب بے نیازِ دعا و دوا ہو جاتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے:۔

عیسیٰ کا بھی علاج کئی بار ہو چکا　　اچھا غمِ فراق کا بیمار ہو چکا
اب کیوں کمی کرے تجھے کس کا لحاظ ہے　　رونے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا

یہاں غمِ فراق نے جان پر بنا دی ہے، "اس کی" کج ادائیوں اور سرد مہریوں نے مایوس کر رکھا ہے، لیکن دل ہے کہ محبوب کی طرف سے "صفائی" پیش کر رہا ہے، آخر خود اپنے تئیں مخاطب کر کے کہتے ہیں،

ناظم غلط ہے مہر و محبت سے چشم داشت　　واقف نہیں ہیں اس صنم حیلہ گر سے آپ

"اس نقش پا کے سجدہ" نے کیا کیا نہیں کرایا، آخر ناظم صاحب

شاعر بنے، ندیم بنے، قصہ خواں بنے　　پائی نہ ان کے دل میں مگر جا کسی طرح

یہاں پر تو جان پر بنی ہوئی ہے، مگر ناصح صاحب ہیں کہ "فلسفہ عشق" پر تقریر فرمائے جا رہے ہیں، ایسے وقت میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ

نصیحت کا نہیں اب وقت ناصح　　اٹھا ہاتھ ایسی باتوں سے دعا کر

اس "پاپ کی دنیا" میں ناظم کسی کو اپنا ہم زبان و ہم نشین نہیں پاتے اور پائیں کیونکر جب صورت مسئلہ یہ ہو،

خدا بے نیاز اور بت سنگدل　　کہو کس سے ہم راہ پیدا کریں

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے، پر انصاف کرو　　ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جب نہ ہو کوئی جفا کش تو جفا کا کیا لطف!

کیا کرو گر نہ کرو ترک جفا میرے بعد

خط مرا پڑھ کے تمہیں رحم تو آیا لیکن

یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

اس شعر میں گو توارد کی بو آتی ہے لیکن پھر بھی سن لیجئے،

کس نے اس حلقۂ کاکل میں پھنسایا دل کو

کون اس چشم کا بیمار ہوا میرے بعد.

یہ شعر طالب و مطلوب کی نفسیات کا صحیح مرقع ہے،

مل جاتے ہیں تو کہتے ہیں اچھی طرح تو ہو

گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں

دربار کی رسائی تک جب کوئی صورت نہیں نکلتی تو کہہ اٹھتے ہیں،

ان کی خلوت میں مجھے بار کہاں ہے ناظم　　قصہ خواں کاش سنا دے مرے افسانے کو

ناصح کے "طوفان تکلم" سے ہر شخص واقف ہے، ناظم کو جب سابقہ پڑا تو

یہ کہہ کے اپنا پیچھا چھڑاتے ہیں،

بکے جو اس طرح کون اس کو دانشمند جانیگا　　مجھے سودا سہی ناصح یہ کیا تجھ کو بھی سودا ہے

جفا اُدھر سے اگر بے شمار باقی ہے　　ادھر بھی دل پہ ابھی اختیار باقی ہے

ہوا و ہوس کے جتنے بندے تھے وہ تو جفائے یار سے آشفتہ خاطر ہو کر اٹھ گئے، لیکن ایک ناظم صاحب کا دم تھا، جو خلوص و وفا کا نام لئے بیٹھا تھا اطلاعاً "عرض" کرتے ہیں،

سب اٹھ گئے تری دلّے خبر لے ناظم کی　　ستم کشوں میں یہی دل فگار باقی ہے

درد و اثر درد و اثر، سوز و گداز، اور یاس و حرماں کے جذبات بھی کلام ناظم کا ایک مخصوص حصہ ہیں، جذبات جب حقیقی ہوں، درد دل جب سچا ہو منہ سے جو لفظ نکلتا ہے، اس میں درد و حسرت کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے، کیف و اثر کا ایک مے خانہ ہوتا ہے کہ اس شراب ناب کا ایک قطرہ بھی جس کے کام و دہن تک پہنچا وہ اپنے دل کی دنیا میں ایک انقلاب محسوس کرنے لگتا ہے،

غالبؔ کشور سخن کا فرمانروا تھا، جس زمین کو اس کی جولانی سخن نے پامال کر دیا، پھر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی قادر الکلام ہو اس کا استعمال کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، اور اس قسم کی جرأت اگر کسی سے ہو بھی تو اصل اور نقل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے لیکن ناظم اپنے استاد غالب کی ایک مشہور و معروف زمین پر قدم رکھتے ہیں، اور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں انھوں نے کوئی ٹھوکر نہیں کھائی، ملاحظہ ہو،

اور مرد میداں ہیں، سہل ممتنع کی تعریف یہ ہے کہ کلام روزمرہ سے اس قدر مرصع ہو کہ گمان یہ کیا جائے کہ اس سے بڑھ کر آسان اور سلیس کلام ہو ہی نہیں سکتا، پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ تو کیا ہے میں خود اس سے کہیں بہتر کہہ سکتا ہوں، لیکن دعویٰ ثابت کرنے کیلئے جب ہاتھ قلم دوات سے آشنا ہوں تو معلوم یہ ہو کہ خیال کر لینا جتنا آسان تھا عمل کر کے دکھانا اس سے کہیں مشکل ہے، دوسری سب سے اہم خصوصیت اس کلام کی یہ ہے کہ پانی کی طرح رواں ہو، تیر کی طرح بے پناہ ہو اور محبت کی طرح دل میں گھر کرتا ہو،

کلام ناظمؔ کا آپ مطالعہ کیجئے تو محسوس کریں گے کہ ناظمؔ اس میدان کا بھی مرد میدان ہے، گ وظ کی ردیف بہت سخت ہے، بالعموم ایسی زمینوں میں طبع آزمائی اس وقت کرتے ہیں، جب "خانہ پری" مقصود ہوتی ہے، لیکن ناظمؔ کے اشعار ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ الفاظ وضع اسی ردیف اور ناظمؔ کے لئے گئے تھے ملاحظہ ہو،

ہم سے چھٹتی ہے کہیں بادہ پرستی ناظمؔ　　منہ پہ واعظ کے کیا کرتے ہیں نا چار لحاظ

کیا غضب ڈھائے دیکھئے ناظمؔ　　ہے بہ اچشم خوں فشاں کا رنگ

یہ اشعار ملاحظہ ہوں،

ہجر و انتظار کی کتنی صحیح تصویر کشی کی ہے

وہ اپنے وعدے کے سچے ہیں آئیں گی لیکن مجال صبر کسے تاب انتظار کسے!

عاشق کے حال زار کا کس قدر دردناک نقشہ کھینچا ہے،

نہ دانش درست اور نہ بینش بجا دل و دیدہ دونوں ٹھکانے لگے

جفائے یار اور جور دلدار سہتے سہتے امید ہو چلی تھی کہ وہ بت خود راہ راست پر آئے گا، اور تلافی ستم کرے گا، عذر جفا کرے گا، پیمان وفا باندھے گا، محبت کے جام چلیں گے، الفت کے ساغر چھلکیں گے، لیکن نتیجہ نکلا تو یہ کہ؛

یاں آرزوئے عذر ستم اور واں ہنوز اپنے کئے پہ یار پشیماں ہی نہیں

ناظم کی وفا کیشیوں کا صلہ بارگاہ حسن سے ملا تو یہ کہ وہ اور زیادہ ہدف ستم بنائے گئے بعض لوگ ہیں کہ تسکین دے رہے ہیں کہ تمہارا خیال ہی غلط فہمی پر مبنی ہے، وہ صنم حیلہ گر اب آیا اور اب آیا، لیکن دل کی آواز کہہ رہی ہے،

مجھ سے بگڑے ہوئے مدت ہوئی ان کو ناظم

ہیچ والے ہیں ابھی بات بنائے جاتے

سہل ممتنع شعر و شاعری میں ایک اہم چیز سلاست و روانی یا بالفاظ اصطلاح سہل ممتنع ہے ناظم اس میدان کے بھی شہسوار، یکہ تاز

وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی — تم اچھے، ہم برے قدرت خدا کی

جنونِ عشق کے باوجود یہ "حکمت عملی" کتنی داد طلب ہے۔

پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو — حال اپنا سنا دیا میں نے!

بہ ذیل "خمریات" یہ شعر بھی خوب ہے،

ناظم ہمیں نظر نہیں آتا اگر نہ آج — اس کو بھی سوئے خانہ خمار کھینچئے

ملا ہے مے کدے کا در کھلا ہوا ناظم — پھر اور کہتے ہیں تائید کردگار کسے ہے

قطعۂ ذیل روانی، سلاست، ہجوم، جذبات اور وفور محبت کا کتنا کامیاب مرقع ہے!

کل کہا میں نے کہ اے نامہرباں — آدمی کو آدمی سے کام ہے
دیکھ تو کب سے یہ تیرا دردمند — عشق میں رسوائے خاص و عام ہے
جانتا ہے تو کبھی آیا یا نہیں — کوئی تیرا عاشق ناکام ہے؟
سن کے ساری داستاں بولے کہ "ہاں — آپ کا یوسف علی خاں نام ہے"

اشعار ذیل بھی اپنی سادگی اور کیف و اثر کی آپ ہی نظیر ہیں،

یوں تو چھیڑ ان کو ہر کسی سے ہے — پر عداوت فقط مجھی سے ہے
دوست بنکر ہمیں بناتے ہیں! — دعوئ دوستی ہنسی سے ہے

وصال دائمی کا ہے تصور! بہار بے خزاں ہے اور میں ہوں
مزا دیتا ہے تنہائی میں رونا! کہ اک دریا رواں ہے اور میں ہوں
تحمّل کی نہیں اب تاب نو نہار نبرد آسماں ہے اور میں ہوں

یہ سوء اتفاق ملاحظہ ہو،

خوش ہو رہے تھے ہم کہ بنایا ہے ہم نے یار
دیکھا تو ان کے در پہ وہ دربان ہی نہیں

یہ شعر بغیر کسی تشریح کے سنئے،

وہ سنکر درد دل کہتے ہیں پھر میں کیا کروں ناظمؔ
خلاصہ آپ کی تقریر کا یہ ہے کہ "مرتے ہیں"

روانی کے ساتھ جذبات کی لطافت ملاحظہ ہو،

ہم نہیں چاہتے کہ دولت ہو کون ممنون بخت و قسمت ہو

آستیں بھی نچوڑ ڈالیں گے اشک کے پوچھنے سے فرصت ہو

شاعرانہ مبالغے کے ساتھ جذبات کی یہ تصویر کشی کتنی خوب ہے،

شب غم کی درازی قصہ کوتاہ یوں سمجھ لیجئے
کہ یہ وہ شب ہے جس کے بعد صبح روز محشر ہے

باتوں باتوں میں کتنے تے کی بات کہہ رہے ہیں،

دار اور خطیبانہ لب و لہجے میں بھی کہہ سکتے ہیں، لبطور ثبوت ملاحظہ ہو،

نوبت ہے تیری گردش چشم سیاہ کی دنیا میں دور گنبد دوّار ہو چکا
ہے ناوک نگہ کے مقابل خدنگ آہ اب میرا وار روک ترا وار ہو چکا

چاہیئے تجھ سے رہیں بندہ و آزاد ملول چاہیئے تجھ سے کریں کافر و دیندار لحاظ
نہ تجھے حشر کا اے فتنۂ ایام خیال نہ تجھے خلق کا اے شوخ ستمگار لحاظ

کتنے پر شکوہ الفاظ ہیں، اپنے عشق کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں،

ابتداء عشق ہیں ہوں منتہی میرا آغاز اور کا انجام ہے

اور لوگ کم سے کم

سن تو لیتے ہیں نہ مانیں گرچہ بات کیوں نہیں سنتے ہو یہ کیا بات ہے

اپنے محبوب سے مطالبہ کرتے ہیں،

ستم کرد ہم پہ بے تحاشہ، لحاظ کس کا ہے خوف کیا ہے؟

اگر ہے گریہ تو بے اثر ہے، اگر ہے نالہ تو نارسا ہے

رند تشنہ کام ساقی جرعہ بخش سے مخاطب ہے،

ختم کبھی ہوتا تو تسلی مری ہوتی ساقی

بس یہی بادہ کہ کچھ شیشے میں ہے کچھ جام میں ہے

کیوں چھپاتا ہے حال رنجش غیر — ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے
میرا ان کا معاملہ ناظم — کچھ جدا جنگ و آشتی سے ہے

اپنے دل کی خود "مخبری" کرتے ہیں،

نہ بیاباں نہ خیاباں کوئی کوچہ ہوگا — جانتا ہوں دل صد پارہ جہاں ہوتا ہے

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے، ادائیگی مفہوم کے ساتھ بے تکلفی زبان کا اتنا نادر نمونہ شاید ہی کہیں مل سکے،

جب کہوں کیوں خفا ہو کیا باعث — کہتے ہیں "پوچھنے کا کیا باعث"

اس سلسلے میں یہ آخری شعر بھی سن لیجئے،

کہے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے — وہ کیا کہیں گے مگر یہ کہ "جا نہیں کرتے"

زور زبان و حسن بیان

ناظم جب روانی وسلاست کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ غالب کے شاگرد نہیں معلوم ہوتے بلکہ میر تقی میر یا میر درد کے حاشیہ نشیں، یا خواجہ اثر کے زلہ ربا معلوم ہیں، یا مومن کے رنگ سے ان کا رنگ مل جاتا ہے، لیکن جب وہ اپنی طاقت لسانی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، اپنی خطابت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں، اپنے جوش بیان اور زور بیان کا لوہا منوانا چاہتے ہیں، تو ذوق اور سودا کے ہم عصر معلوم ہونے لگتے ہیں، جن باتوں کا وہ صاف، سادہ اور دلنشیں الفاظ میں ادا کرتے ہیں، اسی مفہوم کو وہ پر جوش، زور

آج پھر ان سے میں احوالِ دلِ زار کہوں گا
کہتے ہوئے ڈرتا ہوں یہ ناچار کہوں گا
غصہ میں کہا ہو کے ہم اب کچھ نہ کہیں گے
گر آپ سنیں گے تو میں سو بار کہوں گا
پہلے کہے دیتا ہوں تم آزردہ نہ ہونا
دلچسپ لطیفے بھی میں دو چار کہوں گا

ایک بار ناصح اپنی رو میں ناظم کے سامنے اس غارت گر صبر و شکیب کا نام لے گئے، ناظم ابل پڑے،

روکو تو سہی اب مجھے، لو، حضرت ناصح
لینا ہی نہ تھا نام "کسی کا" مرے آگے

شعر ذیل دیکھیے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے:-

کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی   دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی

ناظم ایک بار حریم ناز میں باریاب ہوئے، وہاں جو کچھ پیش آیا ان کا موئے قلم اس کی نقاشی کرتا ہے،

گیا تھا کہ ان کی خوشامد کروں   وہ الٹا مجھی کو بنانے لگے
کبھی خیر مقدم، کبھی مرحبا   زباں پہ یہ الفاظ لانے لگے

افسانۂ غم ختم نہیں ہوتا تو کہتے ہیں،

حکایتِ غمِ ہجراں ابھی سنے جاؤ شکایتِ تعبِ انتظار باقی ہے

اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں،

عبث ہے اے دل فغان و زاری عبث ہے اے دیدہ اشکباری
عدو سے مانا کہ ہے لگاوٹ، مگر وہ کس سے وفا کریں گے!

بڑھا ہے درباں سے ربط باہم، یقیں ہے اب سب رفیق اپنے
گلی میں ان کی پھرا کریں گے، ہم ان کے در پہ رہا کریں گے

محاکات ماہرین سخن اور نقادان فن کے ایک گروہ کا خیال ہے، کہ شاعری محاکات کا دوسرا نام ہے، یا محاکات کو شاعری کہتے ہیں یعنی کسی واقعے کو بالخصوص کسی ایسے واقعے کو جو محبوب سے متعلق ہو، اس طرح بیان کرنا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جائے یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ اپنی تمام جزئیات و تفاصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں اور حظ حاصل کر رہے ہیں، ناظم محاکات کے بھی بادشاہ ہیں؛ وہ جذبات کے بھی بہترین مصور ہیں، وہ احساسات عشق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سماں پھر جاتا ہے مثلاً:-

ہوتے ہی درد دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے
یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا

زبان گنگ ہو جاتی ہے، اور بیان مدعا کی جرأت نہیں پڑتی، لیکن اس منظر کے اختتام کے بعد پھر یاد آتا ہے کہ ہم نے کہا کیا؟ حرف حسرت دید پوری کرتے رہے، زبان حرف شکایت سے آشنا نہ ہو پائی، یہ احساس حد درجہ ہوش ربا اور تکلیف دہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ "بعد از وقت" ہوتا ہے، اس لئے لاحاصل۔

یہ مواقع ناظم کو بھی پیش آئے اور اپنی حسرت کو انہوں نے بھی مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے، مثلاً

کل ہم ان سے مل کے کہہ آئے سب اپنا درد دل
پھر بھی ناظم شکوۂ بیداد درباں رہ گیا

رہ تو آیا اس سے لیکن ہم نشیں
دل میں کہتا ہوں کہ ناظم کیا کیا

وعدہ پر اس سے کیوں قسم مانگی
مفت بگڑی، بنی بنائی بات

بت سے ناخوش ہے تو کیوں اٹھ نہیں جاتا ناظم
دیر میں تذکرۂ کعبہ و زمزم کب تک

کبھی میرے قربان ہوتے رہے   کبھی مجھ کو پنکھا ہلانے لگے
وہ محفل میں آئیں تو ناظمؔ ضرور   مغنی یہ اشعار گانے لگے

یہ سوال و جواب ملاحظہ ہوں،

کہئے اگر کہ طرزِ ستم ناپسند ہے   کہتے ہیں واہ آپکی بھی کیا پسند ہے

ظلم وہ کچھ اور پھر یہ عذر بدتر از گناہ   کہتے ہیں مجبور ہوں ناظمؔ تری تقدیر ہے

عاشقانہ فروگزاشتیں

عشق و محبت کی دنیا ایک عالم ہے ماورائے عقل و ہوش، ایک عاشق ناکام جو ہجر و فرقت کے مصائب جھیلتا ہے، ہزیمت و پسپائی سے دوچار ہوتا ہے اور حسرت والم سے آشنا ہوتا ہے، وہ اپنے نفس و جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا عالم خیال میں اس کا صدر نشین بزم تخیل بصد ناز و ادا جلوہ فرما ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ آلام ہجر کی شکایت یوں کرنا چاہیئے، دردِ فرقت ایسے مؤثر انداز میں بیان کرنا چاہیئے کہ اس کا دل بھی موم ہو جائے، دل کی بپتی کچھ اس طرح پیش کرنی چاہیئے کہ "وہ" جفا کار بھی تڑپ اٹھے لیکن حسن اتفاق سے جب وہ موقع حاصل ہو جائے جب حسرت تکلم پوری ہو رہی ہو، جب آنکھیں لطف دید سے آشنا ہو رہی ہوں، اس وقت دماغ کے تیار کئے ہوئے سارے نقشے درہم برہم ہو جاتے ہیں

شان عاشقانہ ناظم کو اپنی عاشقانہ شان پر پندار ہے، فخر ہے اور بلا کسی تامل کے وہ صاف الفاظ میں ظاہر بھی کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ محبوب کو "غلط فہمی" نہ ہو اس لئے وعدہ خلافیوں اور اپنی انتظار آزمائیوں کو ظاہر کرتے ہیں،

وعدہ گر روز کئے جایئے گا   روز سمجھوں گا کہ آج آیئے گا

اپنے متعلق "صفائی" دیتے ہیں،

عبث ہے خوف شکایت بس آکے مل جاؤ
رہے ہیں یاد ستم ہائے بے شمار کسے

بزم حسن میں بلا اذن و اجازت باریاب ہونا چاہتے ہیں، اس لئے چاہتے ہیں کہ تقریب ملاقات کے لئے کچھ فکر کرلیں، اسی کشمکش میں یہ شعر ہوگیا،

گزرے گی شغل حیلہ تراشی میں شب مجھے
جانا ہے بزم یار میں کل بے طلب مجھے

کہتے ہیں،

تمہاری ہر بات دلنشیں ہے، کسی طرح کا گلہ نہیں ہے
جو داد دیجئے تو آفریں ہے، جو ظلم کیجے تو مرحبا ہے

اسے ہم بھی جھوٹا سمجھتے ہیں لیکن [illegible]

اس ستمگر کے ظلم سہہ کر   اور ظالم بنا دیا میں نے

وہ عذرہائے متوجہ سنئے کہ کیا کہئے   ہوئے ہم آن سے گلہ کرکے شرمسار بہت

محبوب سے اختلاف

اگرچہ جذبات محبت، والہانہ حد تک پہونچے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی اپنے محبوب سے اختلاف بھی کر جاتے ہیں، اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیے، ان میں حسن بیان، لطف زبان، بے ساختگی الفاظ اور واردات قلب کا جیتا مکمل نقشہ کھنچا ہے وہ تعریف و توصیف سے قطعاً بے نیاز ہے،

تم دیدۂ گریاں کو کہا کرتے ہو ناسور   میں ضد سے اسے ابر گہر بار کہوں گا
آوارۂ و سرگشتہ مجھے کہتے ہو اچھا   میں بھی تمہیں بے مہر و ستمگار کہونگا
گھر بیٹھے ہوئے تم جو مجھے کہتے ہو مجنوں   میں تم کو نہ لیلیٰ سر بازار کہوں گا
تم چاند سے مکھڑے پہ کیا کیجو نازش   میں کاکل مشکیں کو شب تار کہونگا

ایک بار بزم محبوب میں جو پہونچے تو باز پرس ہوئی اور حکم دیا گیا کہ تشریف لے جائیے، ناظم رخصت ہونے سے پیشتر بالفاظ ذیل "صدائے احتجاج" بلند کرتے ہیں،

مجلس کو توڑ دیجئے میں سب کے ساتھ ہوں
لیکن مجھے نہ بزم سے تنہا اٹھائیے!

اچھا ہوا کہ موسم گل میں ہوئے اسیر — چھوڑا ہے ہم نے باغ کو برگ نوا کے ساتھ
رد و قبول خلق سے ناظم غرض نہ رکھ — اچھا ہے گر معاملہ تیرا خدا کے ساتھ

لگاوٹ غیر سے اسکی جلا کر خاک کر دیتی — سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کسکا ہے

خوف اثر تو نالہ سے ہے گو اثر نہیں — سنتے ہیں ہم کہ ان کو ہمارا خیال ہے

شکوہ زبان کبھی کبھی حرف شکایت سے بھی آشنا ہو جاتی ہے، لیکن نہایت یکسانہ لب و لہجے میں،

میں تو اٹھنے ہی کو تھا بزم سے کیا ہو جاتا — جام مے غیر کو دیتے تم اگر میرے بعد

شکوہ لبطور طنز

میری وفا کی داد نہ جرم عدو سے بحث — کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

شبستاں میں رہو، باغوں میں کھیلو، مجھ سے کیوں پوچھو
کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں دن کیوں کر گزرتے ہیں

طنز بایں دعوائے الفت و محبت، محبوب پر کبھی کبھی "چوٹ" بھی کر جاتے ہیں۔

ان کو خیال تھا کہ سنیں گے خبر کچھ اور — اچھا ہوا مریض محبت، برا ہوا

پھر رہا ہے وہ آج کچھ خوش خوش　　تو نے ناظم سے کیا کہا ہوگا !

تسلّی

"اس" کی ستم رانیوں اور جفا کاریوں کا جواب خود دیتے ہیں جب ہم نشیں نہیں ملتا، ہمدرد و غم گسار نہیں ملتا، تو اپنے دلمیں خود توجیہیں اور تاویلیں کرتے ہیں، اور دل کو مطمئن کرتے ہیں، یہ توجیہہ و تاویل بھی اپنے اندر حسرت و الم کا نہایت ممتاز رنگ رکھتی ہے،

خوبیٔ قسمت سے خبر ملی کہ وہ کشور دل کا خسرو بصد شان کجکلاہی آ رہا ہے، دل بانسوں اچھلنے لگا، ہوش و حواس رخصت ہو گئے قوتِ فہم و فکر زائل ہو گئی، اور مبہوت سے ہو کر رہ گئے، تو اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں کہ اس قدر اضطراب کی کیا بات ہے،

ترے گھر وہ آئے ناظمؔ تو یہ اضطراب کیا ہے
کوئی بادشاہ آیا کوئی شہریار آیا

یہ مانا کہ نالہ نارسا ہے آہ بے اثر ہے لیکن
ناظمؔ تم ان سے روز کہے جاؤ حالِ دل
کب تک نہ دیں گے از رہِ شرم و حیا جواب

غلط سہی اثرِ آہ و نالہ پر ناظمؔ　　رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

ناظم وفائے وعدہ کی امید ہے کسے　　مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہوگیا

بھید کے معلوم کرنے کیلئے غمخوار ہیں　　عاشق زار اسکے ہیں کہنے کو بیمار ہیں
سادہ رویوں کو غلط کہتے ہو ناظم سادہ دل　　ان کو بھولا کون کہتا ہے بڑے ہشیار ہیں

ہے وہ تقریب فراق اور یہ تمہید وصال　　وصل سے لطف سوا نامہ و پیغام میں ہے

چھیڑ چھاڑ

ناظم ایک شوخ و شنگ طبیعت کے مالک ہیں، عشق و محبت میں یکسر بلکہ تمام تر سادگی و بنا لیٹ سے کام لینا پڑتا ہے خوش طبعی اور پر لطف سخن آرائیاں اور زیادہ باعث کلفت ہوتی ہیں لیکن وہ اس غم و الم کی فراوانی کے باوجود کبھی کبھی ہنس مکھ بھی نظر آتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ محبوب پر بھی کبھی کوئی فقرہ کس دیتے ہیں کبھی کسی اور انداز سے اسے چھیڑتے ہیں، غرض اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا کوئی نہ کوئی موقعہ نکال ہی لیتے ہیں، فرماتے ہیں،

دوست چپ بیٹھا ہی آخر شکوہ بیجا کریں
طرح میخانہ پڑی ہے در دلدار کے پاس

اپنے مقصد کیلئے تو بھی مگر لائے رجوع　　کاش مجذوب کہیں سب ترے دیوانے کو

خدا کا خوف ہو تو دل کی بیتابی پہ رحم آئے
وگرنہ رقص مرغ نیم بسمل بھی تماشا ہے

ہوتے ہی درد دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے یعنی یہ ایسے ہیں، کہ نہ ان سے سنا گیا
تم خوش ہوئے ہو بزم میں آنے سے غیر کے یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ناظم خفا گیا

آپ تو

آئے تھے پونچھنے مرے آنسو کدھر چلے گھبرا گئے تراوش خون جگر سے آپ؟

عذر ستم فریب، تمنائے صلح جھوٹ صحبت بگڑ گئی تو بناتے ہیں اب مجھے

پتے کی باتیں

ناظم چونکہ ایک تجربے کار عاشق ہیں، راہ محبت کے گرم وسرد سے واقف ہیں، اس لئے اس معاملے پر جو بات کہتے ہیں وہ اس شان سے کہ

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

مثلاً

ملتا ہے امتحان وفا میں سزا ہنوز ناظم اگرچہ تجربہ سو بار ہو چکا

ڈھونڈھ کے وہ فقرے کستے ہیں کہ شاید ناصح صاحب یا واعظ صاحب بھی ہنسے بغیر نہ رہتے ہوں، لیکن اس کا خیال ہے کہ ابتذال و سوقیت کی اپنے دامن کو ہوا کبھی نہیں لگنے دی حالانکہ اس میدان میں "بڑے بڑے شعرا سے "بڑی بڑی لغزشیں ہوچکی ہیں، درحقیقت یہ وادی ہے بھی بہت خاردار، ابتذال و شوخی میں بہت کم فرق ہے، یوں تو شوخی نہایت پسندیدہ چیز ہے لیکن ذرا ابتذال کا رنگ آیا، کہ شعر نظر سے گرا، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ شاعر نظر سے گرا،

لیکن ناظم نے سنجیدگی اور ظرافت کو ساتھ ساتھ نباہنے کی کوشش کی ہے، اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے، مثلاً

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا بتلاؤں
میں نے مے خانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

لی محتسب نے گھر کی تلاشی تو کیا ہوا — نکلا سبوئے کہنہ میں سرکہ بھرا ہوا
عزم حجاز حضرت ناظم سے تھا بعید — سنتا ہوں راہ میں سے پھر آئے بھلا ہوا

زاہد کو کیوں شراب کا یارب مزا پڑا — رسوائے شہر و کوچہ و بازار ہو گیا
مسکیں کا لین دین نہ تھا مے فروش سے — آخر گدائے خانۂ خمار ہو گیا

تکلف کیا ہے گر صورت میں ہر وقت سے نے بہتر ہو
طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھ کر ہو

رہا ناظمؔ کوئی دن اور زندہ   ترے ناوک نے ستا ہوں خطا کی

ناظمؔ کبھی نہ کوچے میں تیرے قدم رکھے   بیچارہ کیا کرے کہ یہی رہ گزار ہے

کیوں چھپاتا ہے حال رنجش غیر   ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے

دیکھو تو کہ وہ غصہ میں کیا کرتے ہیں ناظمؔ
کیوں ان سے کبھی شکوۂ بے جا نہیں کرتے

شوخی شعرا کا ایک اہم موضوع رندی و سرمستی، شوخی و بذلہ سنجی اور واعظ و ناصح کے ساتھ جنگ و جدل ہے۔ بلا استثنا ہر شاعر نے بقدر زور طبیعت واعظ و ناصح کی پگڑی اچھالی ہے، آوازے کسے ہیں اور ان بے چاروں کو ہر طرح آماجگاہ زور طبع بنایا ہے، ناظمؔ بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں، وہ بھی اپنی رندی و سرمستی کی حکایتیں مزے لے لیکر بیان کرتے ہیں، انہیں بھی جب واعظ یا ناصح سے پالا پڑتا ہے تو ڈھونڈ

عشق و محبت کی داستانوں، ہوا و ہوس کی حکایتوں اور رندی و سرمستی کے ولولوں سے لبریز ہو، بلکہ وہ صحیح معنوں میں ایک "شاعر" ہیں، ان کی نظر فطرت کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے، اور وہ وہ سب کچھ دیکھتے ہیں جو ایک مفکر دیکھ سکتا ہے، جب وہ حقائق و معارف، اسرار و نکات، اور حکمت و موعظت پر کچھ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، ایک نکتہ رس اور دقیقہ سنج فلسفی ہے جو رموز فطرت کی گرہ کشائی کر رہا ہے اس موضوع پر جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی حیثیت بالکل بدلجاتی ہے

مثلاً منصور و نعرۂ منصور پر تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے اور جس کی رسائی فکر جہاں تک ہوسکتی تھی، وہاں تک اس نے اپنے خیالات اپنے اسلوب میں ظاہر کئے ہیں، لیکن ناظم نے اس مسئلہ پر جو بات کہی ہے وہ نہ صرف اپنے انداز بیان، اور اسلوب ادا کے اعتبار سے بہت خوب ہے بلکہ نفس مسئلہ پر انہوں نے اپنی جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ان کی وقت نظر پر شاہد ہے، کہتے ہیں،

اے نواسنج انا الحق ترا دعوے سچ ہے
لیک دستور نہیں قطرہ کو دریا کہنا

اس موقع پر مجھے اکبر الہ آبادی کا بھی ایک شعر یاد آگیا، انہوں نے بھی بہت معقول بات کہی ہے، فرماتے ہیں،

معتقد ہوں کعبہ کا ناظم گرچہ ویراں جا کر مجھے. عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہو گیا

حرمت مے میں سنا کیجئے واعظ کا بیاں   بحث ناداں سے کیوں کیجئے دانا ہو کر

معقول سہی وجد کا حیلہ مگر اے شیخ   اچھا نہیں باایں ہمہ تمکین و حیا کا رقص

معرفت عالم و عابد کو کہاں ہے ناظم   بس یہ اتنے ہیں کہ اوراد و مسائل جانیں

اس بت کا کوچہ مسجد جامع نہیں ہے شیخ   . اٹھیئے اور اپنا یاں سے مصلا اٹھائیے

پڑھتا ہے شراب پی کے لاحول   ناظم رندوں میں پارسا ہے

محروم کیوں رہیں گے شراب طہور سے   آخر خدا کے بندے ہیں ہم بادہ خوار بھی

آج ساقی یار کے گھر دعوت اغیار ہے . کیا مزا ہو گر خم مے میں نمکداں چھوڑ دے

حقائق ناظم صرف ایک عاشق ناکام ہی نہیں ہیں کہ جن کا صحیفۂ زندگی

کون ہوگا کہ نہ ہو معتقد فصل بہار ۔ موسم اچھا ہے یہ کہئے کہ یہ موسم کبتک

جو خود برے ہیں کیوں مجھے اچھا کہیں گے وہ آئینہ کو فروغ نہیں زنگبار ہیں

تم اپنی چال سے بدنام ہوگئے ناظمؔ یہ اہل صومعہ چھپ چھپ کے کیا نہیں کرتے

ہم تو پروانے کے قائل ہیں کہ چپکا جل جائے

بلبل نغمہ سرا عاشق غوغائی ہے !

عیش و مستی

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ناظم کی زندگی کا ماحول عیش و عشرت تھا، چنگ و رباب تھا، ساغر و مینا تھا، لیکن اپنے اس ماحول سے بغاوت کر کے انہوں نے اپنی زندگی کیلئے ایک نئی "شاہراہ" نکالی تھی جو وادی نجد میں جا کر ختم ہو جاتی تھی، لیکن پھر بھی وہ زندگی جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی، کبھی کبھی ان کے سامنے "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت بھی دیدیتی ہے اور وہ بعض بعض مواقع پر ان جذبات عیش و مسرت کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے، نمونہ،

شراب شاہد و مطرب سے کام کیا ناظمؔ کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

حضرت منصور "انا" بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں جو اتنا ہوش ہے

اکبر صاحب کہتے ہیں کہ منصور "حق" کے ساتھ "انا" بھی کہہ رہے ہیں جب ان میں اتنا ہوش ہے کہ "انانیت" اب تک باقی ہے تو وہ مستحق دار ہیں، یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے، جس کے ہوش وحواس گم ہو چکے ہوں اور اتنا واصل بالحق ہو چکا ہو کہ وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ میں اس حقیقت سے مل گیا، لیکن جو شخص اس منزل پر پہونچ جائے گا وہ "من و تو" کے امتیاز سے بیگانہ ہو جائیگا، اور آپ جب ابھی اس منزل میں ہیں کہ آپ کو "انا" کا احساس ہے تو آپ دار تک تکلیف کیجئے،

ناظم کہتے ہیں "انا الحق کا دعویٰ صحیح ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ قطرہ کو دریا کہنا کب مناسب ہے تمہاری حیثیت تو ایک قطرے کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ دریا میں ہوں، معلوم ہوتا ہے تم اپنی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔

اکبر و ناظم کی فکر کا یہ لطیف فرق ارباب نظر کے لئے یقیناً باعث لطف ہوگا، دوسری حقیقت ملاحظہ ہو،

یوں تو ہو جاتا ہے ہر اک عیش وعشرت کا شریک
دوست کہتے ہیں اسے جو ہے مصیبت کا شریک

ناظم کا شعر ہے،

پڑھ کے خط نام غیر سے انکو حال اپنا سنا دیا میں نے!

اسی مفہوم کا ایک مشہور شعر یہ بھی ہے،

سناتے ہیں انہیں افسانۂ قیس بہانے ہیں یہ عرض مدعا کے

ناظم الفت بری بلا ہے کہ ناظم بایں تمیز کرنی پڑی رقیب کی بھی التجا مجھے

مومن ہااس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ناظم:۔ لگاوٹ غیر کی اس کی جلا کر خاک کر دیتی

سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے

غالب اشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ناظم:۔ کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی

غالب:۔ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے،

تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

ناظم:۔ یار محفل میں نہ ملتا تھا کسی دن اور اب

روز دو چار گھڑی رہتی ہے خلوت مجھ سے

میر کئی بار آنا ادھر لطف سے عطا یہ عطا ہے کرم پر کرم!

محلس اہل ورع نور کا دریا ہی سہی۔   دل لگی صحبت رنداں مے آشام میں ہے

تسبیح و ورد و دلق و مصلے نہیں پسند   چنگ و رباب و ساغر و مینا پسند ہے

ندرت تشبیہ تشبیہ و استعارے کو صحیح طور سے استعمال کرنا بھی ایک کمال ہے، بڑے بڑے شعرا نے اس میدان میں ٹھوکریں کھائی ہیں، مثلاً آپ نے یہ زبان زد خاص و عام مصرعہ ضرور سنا ہوگا،

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

لیکن اس کا پہلا مصرعہ سنئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تشبیہ و استعارے کو "استادوں" نے کس کس طرح استعمال کیا ہے،

پا بوش میں لگائی کرن آفتاب کی   جو بات کی ۔۔۔ الخ

لیکن ناظم پامال تشبیہ میں بھی ایک خاص بات پیدا کر دیتے ہیں،

اے وہ ایسا ہی سہی پر ہے تنزل در پیش

بد شگونی ہے جو تجھ کو مہ کامل سمجھیں

توارد ناظم کے کلام کا تمام و کمال مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جو غالب سے یا بعض اور شعراء کے اشعار سے ٹکراتے ہیں۔

چند کامیاب ہوئے وہ بھی صرف کسی حد تک، ورنہ ۹۵ فی صدی ان کے اشعار بھی

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

کے مصداق ہو کر رہ گئے ہیں،

لیکن ناظم اس معاملے میں فرد فرید ہیں، میں نے ان کے پورے کلام کا مطالعہ کیا ہے، اور اس موضوع پر ان کے جو اشعار میں نے جمع کئے ان میں عیب تلاش کئے، لیکن اس کا اعتراف ہے کہ کم از کم میری نظر میں کوئی شعر نہیں کھٹکا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ رعایت لفظی جیسی صنعت میں کسی شاعر نے سیکڑوں اشعار رکھے ہوں اور ایک بھی ایسا نہ ملے جو مہمل کہا جا سکے یا جس سے لطف زبان میں ذرا بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، نمونۃً چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمایئے وہ الفاظ خط کشیدہ ہیں، جن سے اس صنعت کو ظاہر کیا گیا ہے:۔

کیوں آئے ہو تربت پہ مری ساتھ عدو کے
میں مردہ ہوں مردہ کو جلانا نہیں اچھا

ناظم نہ رکھ اس آہوئے وحشی سے چشم لطف
جس میں نہیں ہے انس وہ انسان ہی نہیں

تھی نیند حق چشم وہ طالع کو مل گئی
ہے دخل کس کو بخشش پروردگار میں

ناظم :۔ ملے گی محشر میں مراد ہم کو بندھا ہے یہ اعتقاد ہم کو
ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کریں گے

غالب :۔ وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

ناظم :۔ عاشق ہوا اس آفت جاں پہ مراندیم
جب خوب میرا محرم اسرار ہو چکا!

غالب :۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ایہام گوئی

ایہام گوئی یا رعایت لفظی کا اگر موقع سے استعمال کیا جائے تو لطف کلام دوبالا ہو جاتا ہے۔ لیکن قدیم شعرا کے دواوین اٹھا کر دیکھیئے تو معلوم ہوگا، کہ تقریباً ہر شاعر نے اس "صنعت لطیف" سے اپنے کلام کو زینت دینا چاہی ہے، لیکن جب اس قسم کے اشعار کا استقصا کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ۹۵ فی صدی اشعار نہایت مہمل طور سے خراب ہو کے رہ گئے ہیں ایک زمانے میں تو شاعری، رعایت لفظی، ضلع جگت، اور پھکڑ بازی میں منحصر ہو کے رہ گئی تھی، لیکن اس دور نامسعود سے پیشتر اور بعد بھی جب شعرا نے اس پہ طبع آزمائی کی تو بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر بالکل ناکام رہے اور جو معدودے

بہت کہنے سے آجاتی ہے ضد انسان کو ناظم　　نہ کر تکرار ان سے گو مزا تکرار میں آئے

مردہ زندوں کو تری آن سے ہم دیکھتے ہیں　　زندہ مردوں کو تری تان سے ہم دیکھتے ہیں

خط مرا پڑھ کے تمہیں رحم تو آیا لیکن　　یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

متفرق اشعار

ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں، ان میں سے ہر شعر کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ضرور موجود ہے لیکن چونکہ منتخب اشعار کی تعداد کم ہے اس لئے کسی مخصوص عنوان کے ساتھ دو ایک شعر کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا،

تم کرو ترک جفا کیا امکاں　　ہم کریں ترک وفا کیا باعث

کیا اس نے قتل اور میں نے معاف　　عبث اہل شہر اس کا چرچا کریں

خدا کو دینی ہے جان ہمدم، نہیں ہے مرنے کا مجھ کو کچھ غم
یہی ہے رونا کہ میں نہ ہونگا تو پھر وہ کس پہ جفا کریں گے

ڈرتے ہیں محتسب سے بھلا آئے تو سہی　　اچھی کہی کہ ساغر و مینا اٹھائیے

تم بھی بن جاؤ گے لیلیٰ کی نظیر   نہ کہو قیس کا ہمسر مجھ کو

رخصت عرض حال کیا مانگوں!   کہہ نہ بیٹھیں کہیں کہ "رخصت ہو"

بیوفائی کا داغ کیسا ہے   ہم نے مانا کہ ماہ طلعت ہو

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو   منہ سے نکلی اگر شکایت ہو

وہ اُٹھے محفل سے ناظم مجھ کو آتا دیکھ کر   اور میں سمجھا کہ اٹھتے ہیں مری تعظیم کو

تکلف کیا ہے گر صورت میں مہر و مہ سے بہتر ہو
طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھکر ہو

پھوٹی دیکھی جو صراحی مے کی   میں نے جانا مری قسمت ہو گی

اس کو یوں خاک پہ اے محتسب شرع نہ پھینک
حرمت بادہ بہت مشرب اسلام میں ہے

مگر غلط" سے شروع ہے، اور وہ غزل جس کا آغاز" وہ حسن نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے" سے ہوتا ہے طوالت کے خیال سے قصداً نظرانداز کردیں اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں بہت مشہور ہیں۔ یہاں یہ ضرورت نہیں تھی کہ ان کا مشہور کلام پیش کیا جائے، اس صحبت کا مقصد تو صرف غیر معروف اشعار کی رونمائی تھی اور بس،

ختم کلام کلام ناظم پر غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کی گئی تھی، اور کلام ناظم کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ آپ کے سامنے پیش ہے،

ناظم کے کلام اور غالب کے دیوان کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے، کہ ناظم نے اگرچہ غالب سے استفادہ کیا لیکن ان کا رنگ طبیعت، رنگ شاعری اور طرز اسلوب غالب سے بالکل جدا ہے اور یہ فرق صرف زبان و بیان ہی میں نمایاں نہیں ہے بلکہ فکر و خیال میں بھی ہے، دونوں کا رنگ ایک مستقل چیز ہے،

غالب ایک فلسفی ہے ایک خوددار عاشق ہے، ایک گدائے متکبر ہے، فارسی ترکیبیں، اغلاق و پیچیدگی کے ساتھ اس کے کلام کا اہم جزو ہیں، اس کی رسائی فکر وہاں تک ہے، جہاں تک ہرکہ ومہ پہنچ نہیں سکتا،

کرتے ہیں عبث غرور کیا آپ؟ ہیں کوئی جناب کبریا آپ؟

کل جو کچھ دل کی بے قراری کا تذکرہ ان سے ایک بار ہوا
ہنس کے کہنے لگے کہ کیوں صاحب دل کہاں تھا کہ بیقرار ہوا
اس میں وہ کیا کرشمہ ہے ناظم جس سے پھر تو امیدوار ہوا

وعدے نے ترے زیست کی توقیر بڑھائی
مرتے ہیں پہ مرنے کی تمنا نہیں کرتے

شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلم پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

شعر اسے کہتے ہیں کیا کہنا ہی ناظم واہ وا
اس غزل کو سن کے میں قائل تمہارا ہو گیا

خضر ہے وادیٔ محبت کا کیوں نہ ناظم کے ہم قدم چومیں

چند اور اشعار ناظم کی وہ مشہور نظم جو "میں نے کہا کہ دعوئ الفت

مٹیا برج

اودھ کے شاہ ذی جاہ، واجد علی شاہ کو انگریزوں نے، اپنے "مقتضائے طبیعت" سے مجبور ہو کر جب تخت و تاج سے محروم کیا، تو انہیں لکھنؤ سے کلکتہ میں لاکر "پابند" کر دیا گیا، لیکن،

صدر ہر جا کہ نشیند صدر است!

واجد علی شاہ جہاں رہے، واجد علی شاہ بنکر رہے، کلکتہ میں بھی انہوں نے ایک چھوٹا سا لکھنؤ بسا لیا تھا، اور اسی کا نام "مٹیا برج" رکھا تھا،

ایک مرتبہ، میرا کلکتہ جانا ہوا، تو تڑپتے ہوئے دل، اور، روتی ہوئی آنکھوں سے مٹیا برج کی بھی زیارت کی، یہاں ان کے مختصر مگر تاریخی امام باڑہ کو دیکھنے کا بھی موقعہ ملا، امام باڑہ واجد علی شاہی طرز تعمیر کا ایک دلکش نمونہ ہے، صدر دروازہ پر اشعار ذیل کندہ ہیں۔

کی عزا خانے کی جب شاہ اودھ نے بنیاد — مرتبہ ارض مقدس کا ہوا عرش نہاد
بعد تعمیر سجا ایسا کہ جنت کو ہی رشک — فیض ایسا ہے کہ برآتی ہی مانگو جو مراد
نور شمسین سپیدی سے خجل ہوتا ہے — رنگ گلکاری سے شرمندہ ہی روح بہزاد
بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہست — ملک و حور کا ہر ایک سے ہی یہ ارشاد

برعکس اس کے ناظم ایک شاعر ہے، ایک سپر انگندہ عاشق ہے، ایک دل زدہ مظلوم ہے، ایک پیکر ترحم، ایک مجسمۂ حسرت ہے اس کے ہاں نیائش وفتادگی ہے، جاں نثاری وجاں سپاری ہے، اور کبھی کبھی نغمۂ شادی ہے جو دیکھتے دیکھتے نوحۂ غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

۶۷۲

اسلام - سر پی سی رائے کی نظر میں

۲ر جون ۱۹۲۹ء کو کلکتہ میں یوم النبیؐ کی تقریب میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا، جلسہ کی صدارت سر پی سی رائے، ہندوستان کے مشہور اور مایہ ناز سائنس داں نے کی،

خطبۂ صدارت کے آخری الفاظ یہ تھے:-

"اسلام دنیا کے تمام مذاہب میں سب سے زیادہ جمہوری مذہب ہے، وہ عالمگیر برادری، عالمگیر امن و رواداری اور خدمت بنی نوع انسان کی تعلیم دیتا ہے اس نازک دور میں جبکہ فرقہ وارانہ افتراق نے اور سیاسی اختلافات نے ہمیں توڑ کر الگ الگ کر دیا ہے۔ ہندوستان کو اس روادارانہ اسپرٹ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، دنیا میں آج ایسا کوئی مذہب نہیں جو اس ایک ہی امتیاز کا دعویٰ کر سکے، عیسائیت کبھی نہیں کر سکتی، عیسائیت میں بھی ایک قسم کی ذاتیں ہیں محض وہی لوگ جو دولت مند ہیں پرتکلف ہیں، امراء ہیں سینٹ پال کے کلیسا میں جا سکتے ہیں دوسرے لوگ اور خصوصًا وہ جو نئے عیسائی ہیں، وہاں نہیں جا سکتے ان کے لئے علیحدہ عبادت گاہ بنی ہے، اب ذرا پلٹ کر دور مغلیہ کو دیکھو، شہنشاہ کے برابر قلی، سائیس، اور فقیر کھڑے ہیں، اور دونوں جہاں کے خدا کی سب

فکر تاریخ نھتی اے شاد کہ آئی یہ ندا

لکھ حق شبر و شبیر سے سبطین آباد

امام باڑہ کے ایک بغلی کمرہ میں واجد علی شاہ کی، اور دوسرے میں اُن کے صاحبزادہ کی قبر ہے، جس کمرہ میں ان کی قبر ہے اس کے دروازہ پر قطعۂ تاریخ کندہ ہے، اسی پتھر پر ایک جھاڑ لٹکا ہوا تھا، جس سے اشعار اچھی طرح پڑھے نہیں گئے، جو اشعار پڑھے گئے یہ ہیں،

دفن گشتہ بعزا خانۂ سبطین رسول سرزدہ شور قیامت ز فغان و آہ ہے

باادب فاتحہ برخوان بیا اے زائر اندریں خاک نہاں ہست شہ دیجاہ ہے

عرض ہنود بمصراع دو تاریخ بہار

در خلد است در روضۂ شاہنشاہے

۱۳۰۵ھ ۱۸۸۷ء

المذنب العاصی لطف علی درحالت پریشانی و بے مشقی تحریر نمود

۱۳۰۷ھ

مسلم یونیورسٹی اور اسلام

نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال، اپنے پہلو میں درد ملی اور احساس اسلامی سے تڑپتا ہوا دل رکھتی تھیں، وہ آخر عمر تک مسلم یونیورسٹی کی چانسلر رہیں،

سنہ ۱۹۲۶ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں، شرکت کے لئے وہ علی گڑھ آئیں، نصر اللہ ہوسٹل کی تقریب افتتاح کے موقع پر انہوں نے ایک پراثر تقریر کی، تقریر ان الفاظ پر ختم ہوئی:۔

"ہماری قوم نے انتہائی جد وجہد کے بعد یہ یونیورسٹی قائم کی ہے، اور اس کو "مسلم یونیورسٹی" کے نام سے موسوم کیا ہے تو قدرتی طور پر ہم اس دار العلوم کو "مسلم" کی نسبت سے جو برکت حاصل ہونا چاہیئے ہم اس کے آرزومند ہوتے ہیں،

. . . . . . پس اس نسبت سے ہم اس کے طلبا کو ارکان اسلام کا پابند اور اسلام کی ترقی میں سرگرم دیکھنا چاہتے ہیں، بلاشبہ یہ ایک رنج دہ بات ہوگی، کہ اس دار العلوم اسلامی کے مسلمان دنیوی کاروبار میں اس قدر منہمک ہو جائیں، کہ نہ تو ان کو اپنے ہادئ برحق کی پیروی

ایک ساتھ عبادت کر رہے ہیں، آؤ اب ذرا ہندؤں کو بھی دیکھ لیں، ذات پات کی
قیود کے مطابق مقدس مندر میں بس برہمن ہی جا سکتا ہے جو لوگ اس سے
دوسرے درجہ پر ہیں وہ بس مندر کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر دیوتا کے
درشن کر سکتے ہیں، میں ہندو ہوں لیکن اگر ہندو مذہب یہی ہے تو خدا مجھے
اس سے بچائے، بنگال کی آبادی میں کثرت سے مسلمان ہیں، یہ کس طرح
ہوا، اور یہ کیوں ہے؟ کیا جبراً مسلمان کئے گئے؟ انہیں اس بات کا دعوےٰ
ہے کہ ان کے اجداد ہندو تھے، پھر یہ مسلمان کیونکر ہو گئے؟ اعلیٰ ذات کے
ہندؤں کے مظالم سے انہوں نے انسانیت نواز اسلام کی گود میں امن
پایا، یہ وجہ ہے کہ بنگال میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اس وقت ہندوستان
فرقہ وارانہ اور برادرانہ جنگ کی وجہ سے افتراق اور پھوٹ میں مبتلا
ہے یہی وہ خاص وقت ہے کہ اسلام کی روح پھیلا دی جائے۔

اور نہ ارکانِ اسلام کی پابندی کا خیال رہے"

۶۷۲